دروس القرآن

۵

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ

نام کتاب .... دروس القرآن جلد پنجم

تالیف: .... مولانا محمد الیاس گھمن

تاریخ اشاعت .... مارچ 2020ء

باراشاعت .... اوّل

تعداد اشاعت 1100

ناشر .... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاہور روڈ سرگودھا

0321-6353540

0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

سورۃ المجادلۃ ------------------------------- 61

سورۃ المدثر ------------------------- 260

سورۃ القیامۃ ---------------------------- 271

سورۃ الدھر ---------------------------- 283

سورۃ عَبَسَ ---------- 314

سورۃ التکویر ---------- 329

سورۃ الغاشیہ ---------- 378

سورۃ الفجر ---------- 386

سورۃ البلد ------------------------- 398

سورۃ الشمس ------------------------- 406

سورۃ الحدید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱﴾

پانچ مسبحات:

سورت حدید، سورت حشر، سورت صف، سورت جمعہ اور سورت تغابن یہ پانچ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے۔ ان پانچ سورتوں کو مُسَبِّحات کہتے ہیں۔ پہلی تین سورتیں حدید، حشر اور صف یہ لفظ "سَبَّحَ" سے شروع ہوتی ہیں اور سورت جمعہ اور تغابن یہ لفظ "یُسَبِّحُ" سے شروع ہوتی ہیں۔

تسبیح حالاً اور تسبیح قالاً:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱﴾

اللہ ہی کے لیے تسبیح بیان کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں۔

تسبیح دو قسم کی ہے؛ ایک ہوتی ہے تسبیح حالاً اور ایک ہوتی ہے تسبیح قالاً۔ حالاً کا معنی ہے کہ ایسی تسبیح جو دوسرے کو سنائی نہ دے اور قالاً کا معنی ہوتا ہے کہ ایسی تسبیح جو دوسرے کو محسوس ہو۔ سورج صبح سے لے کر شام تک چلتا ہے، روزانہ ایک وقتِ مقررہ پر نکلتا ہے اور ایک مقررہ وقت پر ڈوبتا ہے، ترتیب سے دائیں بائیں نہیں ہوتا،

سورج اللہ کے حکم کی پابندی کرتا ہے، یہی اس کی تسبیح ہے۔

جس طرح ہم کہتے ہیں کہ شکر کی دو قسمیں ہیں: ایک ہوتا ہے شکرِ صوری اور ایک ہوتا ہے شکرِ حقیقی۔ شکرِ صوری یہ ہے کہ شکر کی صورت ہو۔ مثلاً یا اللہ! تیرا بڑا شکر ہے، یا اللہ! تیرا بڑا کرم ہے، یا اللہ! تیرا بڑا احسان ہے... اور شکرِ حقیقی کہ آدمی زبان سے تو کچھ نہیں کہہ رہا لیکن جو اللہ کا حکم ہو اس پر پابندی سے عمل کرتا ہے اور مان لیتا ہے۔ شکرِ حقیقی یہ شکرِ صوری سے بھی زیادہ افضل ہوتا ہے لیکن صوری اور حقیقی ہونے دونوں چاہییں۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳﴾

اللہ اول حقیقی ہے اور آخر حقیقی ہے۔ اول حقیقی کا معنی کہ جس کی کوئی ابتدا نہیں اور آخر حقیقی کا معنی کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے۔

وساوس کے بچنے کا وظیفہ:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو وساوس کی تکلیف ہو، وساوس کا مریض ہو تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرے اللہ اس سے وساوس کو ختم فرما دیتے ہیں۔

فنائے امکانی اور فنائے عملی:

اللہ تعالیٰ اول بھی ہے اور آخر بھی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ باقی جتنی چیزیں ہیں وہ فنا ہوں گی لیکن اللہ کی ذات کبھی فنا نہیں ہو گی۔

اس پر ایک اشکال ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ کہ ہر چیز فنا ہو گی لیکن اللہ رب العزت نے جنت کو پیدا فرمایا ہے اور یہ فنا نہیں ہو گی، جہنم کو

پیدا فرمایا ہے یہ بھی فنا نہیں ہو گی... تو پھر یہ بات کیسے ٹھیک ہو گی کہ اللہ رب العزت کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہو گی؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے فنا کا وقوع اور ایک ہے فنا کا امکان۔ فنا کا وقوع تو سب پر نہیں ہو گا، اللہ نے جنت کو پیدا فرما دیا ہے اب جنت فنا نہیں ہو گی، جہنم کو پیدا فرما دیا ہے اب جہنم فنا نہیں ہو گی لیکن فنا کا امکان ان پر بھی ہے یعنی جنت اپنی ذات کے لحاظ سے باقی رہنے والی نہیں ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے تو فانی ہے لیکن اللہ نے اس کو بقا عطا فرما دی ہے اور اللہ کی ذات وہ ہے جس پر فنا کا وقوع بھی نہیں اور فنا کا امکان بھی نہیں۔

معیتِ باری تعالیٰ:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴﴾

اللہ پاک تمہارے ساتھ ہیں تم جہاں کہیں بھی ہو اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔

میں ایسی آیات بار بار ذکر کرتا ہوں تاکہ آپ اس عقیدے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایک اللہ کی معیتِ ذاتیہ ہے اور ایک اللہ کی معیتِ وصفیہ ہے۔ جمہور اسی بات پر ہیں کہ اللہ کی معیت؛ معیتِ ذاتیہ ہے اور ہمارے بہت سارے صوفیا اس بات پر ہیں کہ اللہ کی معیت؛ معیتِ صفاتیہ ہے۔ مجھے خود اس پر ہمیشہ خلجان رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کو معیتِ ذاتیہ ماننے میں کوئی اشکال نہیں ہے تو پھر معیتِ ذاتیہ کی نفی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا میں نے ایک جواب پڑھا اور وہ جواب وہ تھا جو میں خود دیتا ہوں، جب حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا جواب پڑھا تو شرح صدر ہوتا ہے کہ یہ ہمارا ذاتی جواب بھی ہے اور اکابر کا بھی ہے۔ وہ جواب یہ ہے

کہ جب جمہور معیتِ ذاتیہ کی نفی کرتے ہیں تو وہاں اصل نفی تجسیم کی ہے، چونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہر جگہ پر ہے تو عوام کا ذہن یہ بنتا ہے کہ شاید اللہ کا جسم ہر جگہ پر ہے، اللہ تعالیٰ چونکہ جسم سے پاک ہیں تو تجسیم کی نفی کے لیے معیتِ ذاتیہ کی نفی ہوتی ہے اور اگر تجسیم کا شبہ نہ ہو تو پھر معیتِ ذاتیہ پر کوئی اشکال اور کوئی کلام نہیں ہے۔

میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا- آپ کو یاد ہو گا- کہ بہت سارے معاملات میں میری اپنی تعبیرات ہوتی ہیں، مجھے ایک بات پر شرح صدر ہوتا ہے تو وہ میں اپنی رائے کے طور پر پیش کرتا ہوں اور الجھن یہ رہتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ رائے راجح نہ ہو لیکن جب اس پر اکابر کی رائے ملتی ہے تو پھر آدمی کا دل بہت خوش ہوتا ہے کہ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے۔

ایمان لانے کا فطری جذبہ ہر ایک میں موجود ہے:

﴿وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾

کیا بات ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے حالانکہ اللہ کے رسول تمہیں بلاتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور اس سے پہلے تم اللہ سے وعدہ بھی کر چکے ہو۔ عالمِ ارواح میں جب اللہ رب العزت نے فرمایا تھا کہ "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا تھا "بَلٰى" کیوں نہیں؟! آپ ہمارے رب ہیں۔ تو تم عالم ارواح میں وعدہ کر چکے ہو تو اب ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ایک بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں! کیونکہ عالمِ ارواح میں روح نے "بَلٰى" کہا تھا اس لیے آج دنیا میں فطری اور طبعی طور پر انسان میں اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا جذبہ موجود ہے، بس ماحول اس کو دبا دیتا ہے، جس طرح آگ کی چھوٹی سی

چنگاری راکھ میں موجود ہوتی ہے اور اوپر جو راکھ پڑی ہے وہ آگ کی چنگاری کو بھڑکنے نہیں دیتی، جب آپ راکھ ہٹائیں گے تو اندر سے وہ چنگاری بھڑک جائے گی۔ بالکل اسی طرح انسان کے دل میں ایمان لانے کا جذبہ موجود ہوتا ہے لیکن وہاں کا جو ماحول ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتا۔ آپ جب کسی کافر کو دلائل سے بات سمجھائیں گے اور دلائل سے ماحول کا اثر چھٹے گا تو اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا جذبہ بیدار ہو جائے گا۔ جیسے حدیث پاک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُودٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ[1].

ہر بندہ طبعاً فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین کبھی اس کو یہودی بنادیتے ہیں اور کبھی اس کو عیسائی بنادیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ نے انسان کی فطرت میں نیکی کا جذبہ بھی رکھا ہے۔

اللہ گیارہ قسمیں کھا کر فرمارہے ہیں ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا ﴿۸﴾﴾ (سورۃ الشمس) کہ اللہ نے ہر انسان کی طبیعت میں گناہ کا ذوق بھی رکھا ہے اور گناہ سے بچنے کی طاقت بھی رکھی ہے۔

بعض لوگ خالصتاً بے حیائی کے ماحول میں ہوں گے اور کسی بھی وقت مسجد کی طرف آئیں اور تھوڑی سی بات سنیں تو زندگی ایسے بدل جاتی ہے کہ بندے کو بظاہر یقین نہیں آتا کہ کبھی اس کی زندگی بھی بدلے گی؟ اور بعض لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوتے ہیں لیکن آپ تھوڑی سی دین کی بات شروع کر دیں تو تڑپنا شروع ہو جاتے ہیں پھر جب باہر جاتے ہیں تو دوبارہ گناہ شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں نیکیوں کے ماحول میں ہوتے ہیں، پھر اندر سے توبہ کی طبیعت بھی بن جاتی ہے لیکن باہر نکل کر پھر گناہ ہو

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج6 ص203 رقم الحدیث 12498

جاتا ہے۔ یہ جو برا ماحول ہے یہ انسان کو بہت زیادہ تباہ کر دیتا ہے۔

کفار کو "اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ" کہنے کا مطلب:

﴿وَ مَا لَکُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ۚ وَ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ وَ قَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾

سوال اس پہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کو یہ فرما رہے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، پھر کہا کہ اس سے پہلے عالم ارواح میں تم عہد بھی کر چکے ہو ایمان لانے کا، آگے فرمایا: ﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾ کہ اگر تم مؤمن ہو! سوال یہ ہے کہ وہ تو مؤمن نہیں تھے؛ وہ تو کافر تھے تبھی تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ تو کافروں کو ﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾ میں نفسِ فعل مراد نہیں ہے بلکہ دعویٰ فعل مراد ہے یعنی اگر تم ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر پیغمبر کی بات کیوں نہیں مانتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر خود بھی کہتے تھے کہ ہم مومن ہیں، کہتے تھے: ﴿مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی﴾[2] کہ ہم جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے، ہم اللہ کو مانتے ہیں، باقی یہ اللہ کے محبوب بندوں کی تصویریں ہیں، یہ ہمیں اللہ کے اور قریب کر لیتے ہیں۔

وہ دعویٰ ایمان کا رکھتے تھے تو اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اپنے دعویٰ ایمان میں

2۔ الزمر 3:39

سچے ہو کہ اللہ کو مانتے ہو تو اللہ کے رسول کو کیوں نہیں مانتے؟ صرف اللہ کو ماننے کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ اللہ کی ساری باتوں کو ماننے کا نام ایمان ہے۔ تو جب اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں تو اللہ کی بات مان کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مان لو! پھر کیوں نہیں مانتے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب:

﴿وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ﴾

تم اللہ کے راستہ میں مال خرچ کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ زمین وآسمان کا وارث تو اللہ ہے۔

یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مال جو تمہیں دیا ہے وہ اللہ کا ہے، آپ کو تھوڑے وقت کے لیے دیا ہے اور اللہ کا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرنا اس سے انسان کو رکنا نہیں چاہیے بلکہ بڑھ کر خرچ کرنا چاہیے۔

"میراث" کا معنی ہوتا ہے کہ ایک مالک کے فوت ہونے کے بعد دوسرے انسان کو مال مل جائے، یہ میراث ہے اور وراثت میں مِلک اختیاری نہیں ہوتی بلکہ مِلک جبری ہوتی ہے یعنی بیٹا باپ کے مرنے کے بعد باپ کے مال کا مالک نہ بھی بننا چاہے تو وہ پھر بھی بنے گا، اس میں اس کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ جبری چیز ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہاں پر یہ سمجھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے مالک ہیں، کیا مطلب کہ حقیقتاً مال ہے ہی اللہ کا، تم چاہو تب بھی اللہ کا ہے اور نہ چاہو تب بھی اللہ کا ہے، وقتی طور پر تمہیں دیا ہے، تم جب جاؤ گے تو مال اپنے حقیقی مالک کے پاس خود بخود چلا جائے گا، یہ تھوڑی دیر کے لیے دیا ہے، اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

اولین ساتھ دینے والے افضل ہوتے ہیں:

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۠﴾

خرچ کرنے والے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے لیکن یہ بات فرمائی کہ فتح مکہ سے پہلے جنہوں نے خرچ کیا اور جہاد کیا وہ افضل ہیں ان سے جنہوں نے فتحِ مکہ کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔ پہلے والے افضل ہیں۔ افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کوئی تحریک لے کر اٹھے اور پتا نہ ہو کہ تحریک چلے گی یا نہیں چلے گی؟ مشکلات ہوں تو اس وقت جو ساتھ دینے والے ہوں وہ افضل ہوتے ہیں۔ تو فتح مکہ سے پہلے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل رہے تھے تو اس وقت لوگوں کو شک تھا کہ پتا نہیں آگے ان کا کیا ہو گا اور اکثر کفار کو یقین تھا کہ معاذ اللہ یہ کچھ دنوں بعد ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت جو لوگ جان کی پرواہ کیے بغیر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے ہیں وہ ان سے افضل ہیں جو اس وقت آئے جب اطمینان ہو گیا تھا کہ اب اسلام غالب ہے، اب اس کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ حکمت ہے پہلے لوگوں کے زیادہ اجر کی۔

ایک اشکال کا جواب (حضرت سعد بن معاذ اور قبر کی تنگی)

﴿وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ﴾

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے۔ یہاں ایک سوال اور اس کا جواب سمجھیں:

سوال یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم

جنتی ہیں، کسی صحابی کو عذاب نہیں ہو گا لیکن بہت ساری روایات سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ کو قبر کا عذاب ہوا ہے۔ مثلاً حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جب قبر میں دفن کیا گیا تو قبر نے ان کو دبوچا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر وہاں ٹھہرے، ان کے لیے دعا کی۔ تو عذاب تو ہوا ہے۔

اس کے کئی ایک جوابات ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لیں:

[۱]: ایک جواب تو اس کا یہ ہے کہ یہ جو وعدہ ہے کہ صحابی کو عذاب نہیں ہو گا، اس سے مراد قبر کا عذاب نہیں ہے بلکہ مراد جہنم کا عذاب ہے۔ حدیث میں جو ہے:

لَا تَمَسُّ النَّارُ مُسْلِمًا رَآنِيْ أَوْ رَأٰى مَنْ رَآنِيْ.[3]

اس مسلمان کو آگ نہیں چھو سکتی جس نے مجھے دیکھا یا اس مسلمان کو دیکھا جس نے مجھے دیکھا!

تو اس کا تعلق قبر کے ساتھ نہیں ہے، اس کا تعلق جہنم کے ساتھ ہے اور کسی صحابی کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے کہ حشر کے بعد کوئی صحابی تھوڑی دیر کے لیے بھی جہنم میں جائے... قبر کے واقعات تو ملیں گے لیکن جہنم کا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

[۲]: اور دوسرا اس کا جواب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ قبر کی حیثیت کیا ہے؟ قبر دنیا کی زندگی کا تتمہ ہے اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ ہے۔ قبر؛ دنیا کی انتہا ہے اور آخرت کی ابتدا ہے۔ جس طرح معروف شاعر علامہ محمد اقبال کا شعر ہے:

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

3۔ سنن الترمذی، رقم:3858

ایک جہاں ختم ہو رہاہے اور دوسرا جہان شروع ہو رہاہے۔ تو قبر ایک حیثیت سے دنیاہے اور ایک حیثیت سے آخرت ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ دار العمل نہیں ہے تو اس حساب سے آخرت شروع ہو گئی ہے اور یہ دیکھیں کہ جزاو سزا مکمل نہیں ہے تو پھر آخرت بھی نہیں ہے کیونکہ جزاءوسزاء آخرت میں مکمل ہو گی۔ یہاں جزاءوسزا مکمل نہیں ہے کیونکہ نہ تفصیلی سوال ہے، نہ تفصیلی جواب ہے لیکن چونکہ دار العمل بھی نہیں ہے اس لیے اس کو دنیا بھی نہیں کہہ سکتے۔ تو یہاں پر دنیا ختم ہو رہی ہے اور آخرت شروع ہو رہی ہے اور دنیا میں آدمی نیک سے نیک بھی ہو تو اس کو کچھ تکلیف کا آجانا یہ نیکی کے خلاف نہیں ہوتا۔ تو یہ چونکہ من کل وجوہ آخرت نہیں ہے اس لیے کسی صحابی کو اس میں تکلیف کا آجانا یہ صحابی کو عذاب نہ ہونے کے مخالف نہیں ہے۔

عام طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ دم کر دیں تاکہ میں ٹھیک ہو جاؤں اور دم کرنے والا خود بیمار ہو جائے تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے حالانکہ تعجب نہیں ہونا چاہیے، دنیا تو دار الابتلاء ہے۔ تو جس طرح دنیا میں کسی نیک آدمی پر تکلیف کا آجانا اس کے تقویٰ کے خلاف نہیں ہوتا اسی طرح قبر چونکہ من کل الوجوہ آخرت نہیں ہے تو اس میں بھی کسی صحابی پر تکلیف کا آجانا اس کے عذاب نہ ہونے کے خلاف نہیں ہے۔

یہ دونوں جواب ذہن نشین فرمالیں۔ یہ جو پہلا جواب میں نے دیاہے یہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں دیاہے اور جو دوسرا جواب ہے یہ میں نے کہیں نہیں پڑھا، اگر غلطی ہو تو میری طرف سے اور اگر ٹھیک ہو تو پھر اللہ کی طرف سے... بعض حضرات نے اور جوابات بھی دیے ہیں لیکن بہترین یہی دو جواب ہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیے ہیں۔

خلاصہ ان کا یہ نکلتاہے کہ یا تو عذاب سے مراد ہے جہنم کا عذاب کہ جہنم میں نہیں جائیں گے... یا جواب یہ ہے کہ قبر من کل الوجوہ آخرت نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کا

تتمہ ہے اور آخرت کا مقدمہ ہے، تو جس طرح دنیا میں کسی مسلمان متقی پر تکلیف کا آ جانا یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے اسی طرح قبر میں کسی صحابی پر تکلیف کا آ جانا ان کے عذاب کے نہ ہونے کے منافی نہیں ہے۔ جہنم کا عذاب ان پر ہر گز نہیں ہو گا۔

خلفائے راشدین چار ہیں:

﴿وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾

یہاں پر ایک بات اور بھی سمجھ لیں! جب ہم کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین چار ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ خلفائے راشدین چار نہیں بلکہ سات ہیں۔ وہ ان چار کے بعد حضرت امیر معاویہ، حضرت حسن اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو بھی خلفائے راشدین میں شامل کرتے ہیں۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھے ماہ تک خلیفہ رہے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ مکہ مکرمہ پر خلیفہ رہے ہیں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تو کئی سالوں پر محیط ہے۔ تو ان کا خلیفہ ہونا حقائق سے ثابت ہے جس کا رد نہیں ہو سکتا اور یہ تینوں راشدین بھی ہیں کیونکہ قرآن کریم نے تمام صحابہ کو فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ تو یہ تینوں خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، اس لیے خلفائے راشدین چار نہیں بلکہ سات ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ "خلفائے راشدین" یہ شرعی اصطلاح ہے۔ خلفائے راشدین سے مراد کیا ہے؟ تو قرآن کریم میں ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ﴾[4]

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے تو اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ اللہ انہیں زمین میں خلافت گا جس طرح پہلے لوگوں کو دی تھی اور اپنے پسندیدہ دین کو ضرور اقتدار بخشے گا۔

اس آیتِ استخلاف میں جن حضرات سے خلافت کا وعدہ ہے وہ چار ہیں، سات نہیں۔ تو خلفائے راشدین سے مراد ہے "خلافتِ راشدہ موعودہ فی القرآن" اس سے مطلق خلافت راشدہ مراد نہیں اور وہ چار خلفاء ہی ہیں، سات نہیں ہیں۔ باقی ان تین صحابہ کی خلافت ہے اور خلافت عادلہ ہے۔ خلافت راشدہ سے مراد وہ خلفاء ہیں جن کے ساتھ خلافت کا قرآن میں وعدہ ہے اور وہ چار ہیں سات نہیں۔ اس کے دلائل آیتِ استخلاف کی تشریح میں اپنے مقام پر ہیں۔

عشرہ مبشرہ ایک اصطلاح ہے:

یہ آیت ﴿کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی﴾ میں بطور جواب کے پیش کرنے لگا ہوں کہ ہم کہتے ہیں عشرہ مبشرہ فی الجنۃ کہ جن صحابہ کو جنت کی بشارت دی ہے وہ دس ہیں؛ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت زبیر، حضرت ابوعبیدہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت طلحہ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین۔ یہ دس صحابہ کرام ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ رب العزت تو فرمارہے ہیں: ﴿کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی﴾ کہ جنت کا سب کے ساتھ

4۔ النور 55:24

وعدہ ہے اور تم کہتے ہو کہ جنت کی بشارت ان دس کو ملی ہے، لہٰذا ان میں سے صرف دس کو عشرہ مبشرہ بالجنۃ کہنا یہ اس آیت کے خلاف ہے، سب صحابہ کو جنت کی بشارت ہے، لہٰذا عشرہ مبشرہ بالجنۃ نہ کہا کرو! یہ سوال بالکل اسی طرح ہے جس طرح وہ کہتے ہیں کہ ساتوں خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، اس لیے خلفائے راشدین سات بنتے ہیں چار نہیں، اس لیے صرف چار کو خلیفہ راشد نہ کہا کرو بلکہ سات کو کہا کرو!

اس کا جواب یہ ہے کہ عشرہ مبشرہ بالجنۃ ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایسے صحابہ کرام ہیں جن کو ایک مجلس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ وہ دس ہیں، وہ سارے نہیں ہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ باقی کو بشارت نہیں ملی بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ صحابہ جن کا نام لے کر ایک مجلس میں جنت کی بشارت دی ہے وہ دس ہیں، اب یہ ﴿كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ کے خلاف نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح خلفائے راشدین سے مراد وہ صحابہ ہیں جن کی خلافت کا وعدہ آیتِ استخلاف وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ میں ہے اور وہ چار ہی ہیں۔ لہٰذا ان چار کا خلیفہ راشد ہونا باقی کے "هُمُ الرّٰشِدُوْنَ" ہونے کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی؟

یہ باتیں میں اس لیے آپ کو بار بار سمجھاتا ہوں اور سبق میں عرض کرتا رہتا ہوں تاکہ آپ پر بات کھلے۔ جب انسان پر اپنا موقف کھل جاتا ہے تو پھر اس حقیقی مسلک کے خلاف آنے والے دلائل سے بندہ متاثر نہیں ہوتا۔

مؤمنین کے نور سے کیا مراد ہے؟

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

اس دن جب آپ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب ہو گا۔ ان سے یہ کہا جائے گا کہ آج کے دن تمہارے لیے خوشخبری ہے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ تم ہمیشہ ان میں رہو گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

اس نور سے مراد وہ نور ہے جو قیامت کے دن مؤمن کو ملے گا جب وہ پل صراط کی طرف جائیں گے، نور ان کے سامنے بھی ہو گا اور دائیں جانب بھی ہو گا۔ بعض روایات میں بائیں جانب کے نور کا بھی ذکر ہے، اس لیے یہاں دائیں جانب کا ذکر ہونا یہ بائیں جانب کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ عدمِ ذکر عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہوتا کہ اگر یہاں بائیں جانب کا ذکر نہیں کیا تو بائیں جانب ہو گا ہی نہیں! ایسی بات نہیں۔ یہاں اعزاز بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اصحاب الیمین ہیں، ان کے سامنے بھی نور ہو گا اور ان کے دائیں جانب بھی نور ہو گا۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ہر بندے کا نور اس کے اعمال کے مطابق ہو گا۔ مختلف روایتیں ہیں در منثور میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر مظہری میں بھی ان کو جمع کیا ہے۔ مختلف روایات ہیں مثلاً وضو کریں گے تو اس کا بھی نور ہو گا، صدقہ کریں گے تو اس کا بھی نور ہو گا، تکبیرِ اولیٰ سے نماز پڑھیں گے تو اس کا بھی نور ہو گا اور سورۃ الکہف کا نور تو اتنا لکھا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورت کہف پڑھتا ہے تو اس کے قدم سے لے کر آسمان تک نور ہو گا۔

منافقین کی اس نور سے محرومی:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا

نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿١٣﴾

روایات میں ہے کہ مؤمن کو بھی نور ملے گا اور منافق کو بھی ملے گا۔ مؤمن اور منافق دونوں پل صراط کی طرف آئیں گے تو وہاں منافقین کا نور ختم ہو جائے گا۔ اس وقت یہ لوگ پریشان ہوں گے اور مؤمنین کو پکار کر کہیں گے: ﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ کہ ہمیں دیکھو! ہمیں بھی تھوڑا سا نور دے دو، تو ان سے کہا جائے گا ﴿ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ کہ پیچھے مڑ جاؤ اور نور تلاش کرو! جب وہ پیچھے دیکھیں گے کہ شاید پیچھے سے نور ہمیں ملے گا تو مسلمانوں اور منافقین کے درمیان دیوار آ جائے گی۔ اب یہ آگے دیکھیں گے تو کچھ بھی نہیں ہو گا اور دیوار ایسی ہو گی کہ اس میں کی جانب جو مؤمنین کی طرف ہو گی وہاں رحمت ہو گی اور باہر کی جانب جو منافقین کی طرف ہو گی وہاں عذاب ہو گا۔ اب یہ الجھن میں پڑ جائیں گے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟!

مؤمنین اور منافقین کا مکالمہ:

﴿يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿١٤﴾﴾

وہ منافق لوگ ان مؤمنین سے کہیں گے: کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ مسلمان کہیں گے کیوں نہیں! تم ہمارے ساتھ تھے لیکن تم نے خود کو گمراہی میں ڈال دیا تھا اور تم منتظر تھے کہ کب اسلام ختم ہو گا، کب ان مسلمانوں پر کافر غالب آئیں گے؟! اور تم دین کے بارے میں شک میں پڑے رہتے تھے اور تمہاری تمناؤں

اور امیدوں نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا کہ مسلمان آج مرے تو کل مرے... تم اسی فکر میں پڑے رہتے تھے یہاں تک کہ موت آگئی۔ شیطان نے تمہیں دھوکہ دے کر خدا سے کتنا دور کر رکھا تھا۔

﴿فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۵﴾

آج نہ تو تم سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ عام کافروں سے۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور تم وہیں رہو گے اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

ایمان والوں کا تذکرہ:

اب اللہ ایمان والوں سے فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۱۶﴾

کیا ایمان والوں پر ابھی ایسا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور دین حق کی وجہ سے نرم پڑ جائیں اور یہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں کتاب دی گئی اور پھر ان پر ایک لمبا زمانہ گزر گیا اور ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے لوگ ان میں نافرمان بھی ہیں۔

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۷﴾

آدمی گناہ کرے تو دل مر جاتا ہے، توبہ کرے تو دل زندہ ہو جاتا ہے جیسے مردہ زمین کو اللہ زندہ کر دیتے ہیں۔ مردہ زمین اور بنجر زمین کے لیے پانی آباد ہونے کا

سبب بنتا ہے، اسی طرح اللہ کے ذکر سے مردہ قلوب زندہ ہوتے ہیں۔

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾﴾

جو مرد اور عورتیں صدقہ کرتے ہیں اور اللہ کو اچھا قرض دیتے ہیں تو اللہ ان کے صدقات کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور ان کے لیے بہترین اجر ہے۔

آج وقت ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا اس لیے خلوص سے اللہ کی راہ میں دیں۔

سارے صحابہ؛ صدیق بھی ہیں شہید بھی ہیں:

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١٩﴾﴾

جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہ اپنے رب کے ہاں صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ہیں۔ ان کے لیے اجر ہو گا اور ان کو نور ملے گا۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ان کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

یہاں اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن سارے کے سارے صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ہیں حالانکہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ سارے مؤمن شہید نہیں ہوتے، کچھ شہید ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتے۔

قرآن کریم کی آیت بھی ہے:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ﴾[5]

کہ سب شہید بھی نہیں اور سب صدیق بھی نہیں جبکہ سورۃ حدید سے معلوم ہوتا ہے کہ سب صدیق بھی ہیں اور سب شہید بھی ہیں۔

[۱]: اس کا ایک جواب سمجھیں اور یہ بات بعض حضرات نے فرمائی ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے کہ صحابہ جتنے بھی تھے وہ سارے صدیق بھی تھے اور سارے شہید بھی تھے۔ خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے فرمایا: تم سب کے سب صدیق اور شہید ہو اور دلیل کے طور پر یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ کہ صحابہ سارے صدیق بھی ہیں اور سارے شہید بھی ہیں۔

اگر مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوں تو پھر شہید کا مطلب صرف وہ شخص نہیں جو اللہ کے راستے میں کٹ جائے بلکہ شہید وہ بھی ہے کہ جو اللہ کے راستے میں قتل ہونے کے لیے خود کو پیش کر دے۔ اگر بظاہر اس کو شہادت نہ بھی ملے تب بھی وہ شہید کے مقام پر پہنچتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ.[6]

کہ جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت مانگے تو اللہ اسے شہداء کی منازل عطا فرما دیتے ہیں اگرچہ وہ بستر پر ہی جان دے دے۔

یعنی جو خود کو پیش کر دے اور وہ شہید نہ بھی ہو تب بھی اس کو شہید ہی شمار

5۔ النساء 69:4

6۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج9 ص170 رقم الحدیث 19026

کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر وقت خود کو پیش کیا تھا اس لیے وہ اگر میدان جہاد میں شہید نہ بھی ہوں تب بھی شہید ہیں۔

تو یہ بات سمجھ آگئی کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے کہ وہ صدیق بھی سارے تھے اور شہید بھی سارے تھے۔

[۲]: اور اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں ہے جو کامل ایمان والے ہیں۔ کامل ایمان والے صدیق تو ہوتے ہی ہیں، باقی ایسا نہیں ہو سکتا کہ قتل ہونے کا موقع ہو اور کامل ایمان والا خود کو پیچھے کرے، کامل ایمان والا تبھی ہو گا جب شریعت پر پورا عمل کرنے والا ہو۔ تو اس سے ایمان کامل والے لوگ مراد ہیں۔ اس لیے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

ایک معروف اشکال کا جواب:

یہاں ایک معروف سوال اور اس کا جواب سمجھیں۔ سوال یہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے کہ دو شخص اکٹھے مسلمان ہوئے، ان میں سے ایک شہید ہو گیا اور دوسرا ایک سال تک زندہ رہا۔ جو ایک سال زندہ رہا وہ بھی فوت ہو گیا۔ ایک صحابی کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ بعد میں فوت ہونے والا جنت میں پہلے گیا۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ جب صبح ہوئی تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ بات عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَلَيْسَ قَدْ صَامَ رَمَضَانَ بَعْدَهُ وَصَلّٰى بَعْدَهُ سِتَّةَ أَلْفِ رَكْعَةٍ. [7]

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے ایک سال روزے رکھے ہیں اور نمازیں پڑھی ہیں۔

7۔ شرح مشکل الآثار: ج6 ص76 رقم الحدیث 2307

اب اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شہادت سے بندہ جلدی جنت میں نہیں جاتا بلکہ باقی اعمال سے بندہ جلدی جنت میں جاتا ہے۔ بعض لوگ ایسی آیات اور احادیث کو جہاد کے خلاف پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہتر ہے کہ جہاد نہ کریں اور نماز روزے میں لگے رہیں، اس سے آدمی جنت میں جلدی جاتا ہے۔

اس کا جواب سمجھ لیں کہ شہادت کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہوتی ہے شہادتِ حقیقیہ اور ایک ہوتی ہے شہادتِ صوریہ۔ شہادتِ حقیقیہ یہ ہے کہ آدمی کٹے، قتل ہو اور شہید ہو جائے اور شہادت صوریہ یہ ہے کہ خود کو قتل کے لیے پیش کرے اور اس کے لیے لڑتا بھی رہے، میدانوں میں جاتا بھی رہے اور پھر بھی اتفاقاً ایسا ہو کہ قتل نہ ہو بلکہ طبعی موت مر جائے تو یہ بھی شہید ہے۔ اس کی دلیل حدیث مبارک ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَأَلَ اللهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ۔[8]

کہ جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت مانگے اور مانگنے کا معنی میں نے عرض کر دیا کہ یہ خود کو قتال کے لیے پیش بھی کرے اور اس کے لیے لڑتا بھی رہے، تو اللہ اسے شہداء کی منازل عطا فرما دیتے ہیں اگرچہ وہ بستر پر ہی جان دے دے۔

اب یہ جو دو صحابی تھے، ایک کو شہادت صوریہ ملی اور ایک کو شہادت صوریہ تو نہیں ملی لیکن شہادت حقیقی دونوں کو ملی ہے، ﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ صحابہ سارے کے سارے شہید ہیں، کیوں کہ صحابہ کرام میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جب میدانِ جنگ ہو اور شہادت کی طرف نہ بڑھے، ہاں کبھی

8۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج9 ص170 رقم الحدیث 19026

عذر کی وجہ سے ایسا ہو بھی گیا تو توبہ کی اور معافی مانگ لی، وہاں تو ہر بندہ قتل ہونے کے لیے جاتا تھا لیکن کسی کو شہادت مل گئی اور کسی کو نہیں ملی۔ جن کو نہیں ملا ان کے اختیار میں نہیں ہے، انہوں نے تو خود کو پیش کر دیا تھا۔ تو چونکہ حقیقتاً دونوں شہید تھے۔ اس لیے جب دونوں شہید ہوں اور ایک شہید کے اعمال نامہ میں اعمال زیادہ ہوں اور ایک شہید کے نامہ اعمال میں نیک اعمال کم ہوں تو جنت میں پہلے وہ جائے جس کے پاس شہادت بھی ہے اور شہادت کے ساتھ ساتھ نامہ اعمال میں اعمال بھی زیادہ ہیں تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

اصل میں ہمیں جو اشکال ہوا ہے -اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائیں- اس وجہ سے ہوا ہے کہ ہم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو ایسے دیکھا کہ جیسے ہم خود ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص لڑنے کے لیے جاتا ہے اور کوئی نہیں جاتا تو ہم نے سمجھا کہ شاید وہ بھی ایسے تھے کہ کچھ جاتے تھے اور کچھ نہیں جاتے تھے۔ صحابہ ایسے نہیں تھے، وہ سارے لڑنے کے لیے جاتے تھے، ہر بندہ قتل ہونے کے لیے جاتا تھا اور بعض شہید ہو جاتے اور بعض نہ ہوتے۔ ہمیں اپنی زندگی دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اپنی طرح نظر آئی، اس لیے ہمیں اشکال پیدا ہوا۔

اکابر کے علوم سے توافق:

یہ جو میں نے حدیث پاک کا جواب دیا ہے کہ شہادت صوریہ اور شہادت حقیقیہ... مجھے ایک الجھن تھی کہ یہ جو میں جواب دیتا ہوں کیا یہ جواب کسی بزرگ نے بھی دیا ہے کہ نہیں؟ رات مجھے تفسیر معارف القرآن میں یہ لفظ مل گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ یہ جو میں کہتا ہوں کہ شہادتِ صوریہ اور شہادتِ حقیقیہ اور یہ کہ صحابہ سب کے سب شہادتِ حقیقیہ پر فائز تھے... یہ اکابر کے کلام میں بھی ہے۔ اب اشکال کا جواب صرف ہمارا نہ رہا بلکہ اکابر کے ساتھ مل گیا ورنہ یہ جواب تو میں بارہ سال پہلے سے

دے رہا تھا لیکن اس کی باضابطہ کہیں نقل نہیں مل رہی تھی اس لیے اس پر یہ الجھن تھی۔

دنیا کی زندگی کے پانچ مراحل:

﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطَامًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانٌ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۲۰﴾﴾

دنیا میں پانچ مراحل بیان فرمائے ہیں: لہو، لعب، زینت، تفاخر اور تکاثر۔

[1]: آدمی ایسا کھیل کھیلے جیسے چھ، سات ماہ کے چھوٹے بچے لیٹ کر اپنے کھیل میں مگن ہوتے ہیں، ان کھیلوں کا کوئی معمولی سا بھی فائدہ نہیں ہوتا، اسے ”لہو“ کہتے ہیں۔

[2]: اور ایک وہ کھیل ہوتا ہے کہ نفع ذہن میں نہیں ہوتا لیکن نفع ہوتا ضرور ہے جیسے چھ سات سال کے بچے دوڑ رہے ہوتے ہیں، بھاگ رہے ہوتے ہیں، وہ اس کا نفع سمجھتے نہیں ہیں لیکن نفع بہرحال ہوتا ہے، جسم کو فائدہ ہوتا ہے، ایکسرسائز ہو رہی ہوتی ہے۔ اسے ”لَعِب“ کہتے ہیں۔

[3]: جو فطری خوبصورتی ہوتی ہے بندہ اس سے بڑھ کر زیب وآرائش اختیار کرے تو اسے زینت کہتے ہیں۔

[4]: اور آپس میں فخر کرنا کہ میری طاقت... میری دولت... میری جوانی... میری فلاں چیز... اسے تفاخر کہتے ہیں۔

[5]: پھر مال اور اولاد کے اضافے کی فکر میں لگے رہنا، اسے تکاثر کہتے ہیں۔

دنیا بس یہ چند چیزیں ہیں کہ پہلے لہو ہوتی ہے، پھر لعب ہوتا ہے، اس کے بعد زینت ہوتی ہے، پھر تفاخر ہے اور پھر تکاثر ہے۔ ہر اگلی حالت پر پہنچنے کے بعد پچھلی حالت بندے کو عبث اور فضول نظر آرہی ہوتی ہے۔ جب بچہ چھ ماہ یا سال کا ہوتا ہے تو وہ کھیل میں مگن ہوتا ہے، اس کی ساری زندگی وہی ہوتی ہے، آپ اس سے کھلونا لے لیں تو وہ چیختا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میرا سب کچھ یہی ہے لیکن جب یہ چھ سال کا ہوتا ہے اور اس کو وہی کھلونا دو تو وہ لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ فضول چیز ہے۔ اب اس کے اور کھلونے ہوتے ہیں، اگر وہ کھلونا اس سے واپس لیں مثلاً چھوٹی سی کار ہے، چھوٹا سا سکوٹر ہے، چھوٹی سی سائیکل ہے تو اس پر وہ مرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے پوری کائنات یہی ہے، اور جب یہی بچہ دس بارہ سال کا ہو جائے تو اس کو ان کھلونوں پر تعجب ہوتا ہے، اس کو دیں تو لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اب اس کو اپنی طاقت پر ناز ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں! بارہ سال سے لے کر اٹھارہ سال کا زمانہ اس میں لڑکے بھی لڑکیوں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں، بناؤ سنگھار، زیب و زینت... پتا نہیں کیا کچھ ہوتا ہے اور پھر جب تھوڑی سی عمر بڑی ہو جائے تو پھر بڑی عمر لڑکوں کو کپڑوں کے ٹیپ ٹاپ کا نہیں ہوتا، بس اپنی طاقت کے گھمنڈ میں سب کچھ بھول جاتے ہیں اور جب بڑھاپا ہوتا ہے پھر یہ بھی عجیب لگتا ہے، اب فکر ہوتی ہے کہ اب ان چیزوں پر پیسا لگانا چھوڑ دو، اب پیسہ بچاؤ! اور جوانی میں بچانے کے بجائے لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔

ہر اگلی حالت میں پہنچنے پر پچھلی حالت فضول لگتی ہے، اور جب موت آ جائے گی تو پھر پانچوں کی پانچوں حالتیں فضول لگیں گی، پھر ایک ہی چیز نظر آئے گی کہ نیک اعمال کیا تھے؟ نیک اعمال کیا تھے؟ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ دنیا تو ایسی ہے کہ:

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ

يَكُوْنُ حُطَامًا﴾

جیسے کھیتیاں اگتی ہیں تو کسان کو بہت اچھی لگتی ہیں اور پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں، پھر وہ زرد ہو جاتی ہیں، پھر چورا چورا ہو جاتی ہیں۔ یہی حال انسان کی زندگی کا ہے، پہلے لہو... پھر لعب... پھر زینت... پھر تفاخر... پھر تکاثر اور پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ صرف نیک اعمال باقی رہ جاتے ہیں۔

مغفرت کی طرف دوڑو!

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾﴾

اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اللہ کی جنت کی طرف دوڑو جس کا کم از کم عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کم از کم اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔ یہ چوڑائی بتائی جا رہی ہے، لمبائی نہیں بتائی۔ یہ جنت ایمان والوں کے لیے تیار ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔

مصیبت کی دو قسمیں:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ۚ﴾

یہاں دو قسم کی مصیبتیں بیان فرمائی ہیں؛ ایک جو انسان کی ذات کو پیش آتی ہے اور دوسری جو انسان کی ذات کو نہیں ہوتی، وہ خارجی دنیا میں نظر آتی ہے۔ مثلاً انسان کو بخار ہو گیا تو یہ اس کی ذاتی مصیبت ہے، بارش ہو گئی اور باہر کیچڑ ہو گیا، باغات

ختم ہوگئے، یہ بھی مصیبت ہے لیکن یہ خارجی مصیبت ہے۔

فرمایا: دونوں قسم کی مصیبتیں آتی ہیں اور آنے سے پہلے اللہ نے لکھ دی تھیں، یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔

﴿لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ﴿۲۳﴾﴾

یہ اس لیے تھا تاکہ اگر کوئی چیز تمہیں نہیں ملی تو تمہیں رنج نہ ہو اور اگر اللہ کوئی چیز دے دیتے ہیں تو تم اس پر اکڑو بھی نہیں۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت اکڑنے والے کو اور شیخی کرنے والے کو نہیں پسند فرماتے۔

مختال اور فخور میں فرق:

مختال اور فخور میں فرق ہوتا ہے۔ انسان کے جو داخلی فضائل ہیں اگر ان پر انسان عُجب میں مبتلا ہوتا ہے تو مختال ہے اور اگر خارجی چیزیں دیکھ کر انسان کبر میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ فخور ہے۔ ذاتی چیزیں مثلاً میرا جسم بہت اچھا ہے، میری صحت بہت اچھی ہے، میں بولتا بہت اچھا ہوں، میرا دماغ بہت اچھا ہے، میرا حافظہ بڑا اچھا ہے، اس سے بندہ عجب کا شکار ہوتا ہے تو اسے کہتے ہیں مختال... اور خارجی چیزیں مثلاً میرے پاس گاڑی بہت بڑی ہے، ساتھی بڑے اچھے ہیں، پیسہ بہت ہے تو اس کی وجہ سے جو کِبر پیدا ہوتا ہے اس کو فخور کہتے ہیں۔ اگر انسان کے داخلی فضائل سے عُجب آئے تو ایسے شخص کو مختال کہتے ہیں اور خارجی وسائل کی وجہ سے جو کِبر پیدا ہوا اسے فخور کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نہ مختال کو پسند کرتے ہیں نہ فخور کو پسند فرماتے ہیں، اور لفظ کیسے فرماتے ہیں "لَا يُحِبُّ" کہ محبت نہیں کرتے۔ اس کا معنی کہ انسان کو اللہ کی محبت ہر وقت سامنے رکھنی چاہیے۔

بخل کی مذمت:

﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾﴾

اللہ نے مختال اور فخور کی عادات کو بیان فرمایا کہ مختال اور فخور وہ لوگ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی دعوت دیتے ہیں۔ جو شخص اللہ سے منہ موڑے گا تو اللہ بے نیاز اور لائق تعریف ذات ہے۔

لوہا اتارنے کا مطلب:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾﴾

ہم نے رسولوں کو معجزات دے کر بھیجا، ہم نے ان کے ساتھ کتب بھی نازل فرمائی ہیں اور ترازو بھی نازل کیا تاکہ لوگ عدل و انصاف سے کام لیں اور ہم نے بطورِ خاص لوہا بھی نازل کیا جس میں جنگی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے دیگر منافع بھی ہیں۔ اللہ نے یہ چیزیں اس لیے نازل کی ہیں تاکہ اللہ دیکھیں کہ کون شخص اس کے دین کی مدد کرتا ہے، اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قوی اور غالب ہے۔

یہاں "البینات" سے مراد ہیں معجزات، "الکتاب" سے مراد ہیں کتابیں اور "المیزان" سے مراد وہ خاص احکام ہیں جو عدل سے متعلقہ ہیں۔ ان کو بطور خاص ذکر فرمایا تاکہ حقوق العباد کی بہت زیادہ رعایت ہو۔

فرمایا کہ لوہے کو نازل کیا ہے جس میں جنگی قوت اور منافع ہیں۔ کتابوں کو تو نازل کیا ہے یہ بات تو سمجھ آتی ہے لیکن لوہے کو نازل تو نہیں کیا بلکہ لوہے کو تو پیدا فرمایا

ہے تو پھر ﴿وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ﴾ کیوں فرمایا؟

بعض حضرات اس کا ایک جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ عرب کے محاروات میں استعمال ہوتا ہے کہ ایک چیز اتاری جاتی ہے، دوسری اتاری نہیں جاتی لیکن لفظ دونوں کے لیے ایک طرح بولا جاتا ہے۔ جیسے ہم اپنے مہمان سے کہتے ہیں کہ کھانا وغیرہ کھا لیں! اب "کھانا" تو اس نے کھانا ہے اور "وغیرہ" میں چائے ہے لیکن دونوں کے لیے لفظ استعمال کیا ہے "کھانا"۔ اسی طرح ﴿وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ﴾ فرمایا کہ لوہا ہم نے اتارا ہے۔ تو جو لفظ کتابوں کے اتارنے کے لیے فرمایا وہی لفظ لوہے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عرب ایسے محاورات استعمال کرتے ہیں۔

اور دوسرا اس کا جواب یہ ہے کہ "اَنۡزَلۡنَا" کا لفظ صرف لوہے کے لیے ہی نہیں فرمایا بلکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے چوپائیوں کے لیے بھی یہی لفظ ارشاد فرمایا ہے ﴿وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ﴾[9] اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی بھی چیزیں ہیں پیدائش سے پہلے اللہ نے لوح محفوظ میں لکھا ہے کہ فلاں چیز پیدا کرنی ہے اور لوح محفوظ اوپر ہے، اب "اَنۡزَلۡنَا" ہم نے اس کو نازل کیا کا معنی یہ ہو گا کہ ہم نے اس کو پیدا کرنے کا حکم نازل کیا۔ تو چونکہ ان کے بارے میں جو حکم تھا وہ پہلے سے لوح محفوظ میں تھا، حکم اوپر سے نیچے آتا ہے اس لیے لفظ "اَنۡزَلۡنَا" استعمال فرمایا ہے۔

اور ایک جواب مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ نے دیا، میں اس مجلس میں موجود تھا اور میں نے اپنے کانوں سے یہ جواب خود سنا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "اَنۡزَلۡنَا" کا ذکر یہ بات سمجھانے کے لیے کیا کہ جس طرح تم کتابوں کو مُنَزَّل من اللہ

9۔ الزمر 6:39

سمجھتے ہو لوہے کو بھی اہمیت ایسے دو! یہ اسلوب اس لیے بتایا ہے ورنہ کہنا چاہیے تھا "اَنْشَاْنَا الْحَدِیْدَ مِنَ الْاَرْضِ" کہ ہم نے کتابیں آسمان سے نازل کی ہیں اور لوہا زمین سے پیدا کیا ہے لیکن "اَنْزَلْنَا" کا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ لوہے کو اہمیت ایسے دو دین کی اشاعت اور دین کے نفاذ میں جس طرح آسمانی کتابوں کو اہمیت دیتے ہو!

پھر لوہے کی بنیادی طور پر دو اہمیتیں بیان فرمائی ہیں؛

[۱]: فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ... ایک جنگی استعمال

[۲]: وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ... اور دوسرا عام استعمال کی چیزیں جیسے گارڈر، مائک، گھڑیاں اور دیگر سامان ہے۔

ان میں پہلا اصل مقصد ہے "فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ"، مؤمن کی شان یہ ہے کہ لوہے کو استعمال کرے دین کی تنفیذ کے لیے، دین کی طاقت کے لیے، بس اس سے دین بہت مضبوط ہوتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام کو "آدم ثانی" بھی کہتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "قدوۃ الانبیاء" اور "قدوۃ الانسان" کہتے ہیں جو بعد والوں سب کے مقتدیٰ ہیں۔

فرمایا: ہم نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کو بھیجا – علیہما السلام – اور ان دونوں کی اولاد میں ہم نے نبوت کا سلسلہ جاری کیا اور کتاب بھی دی، پھر ان میں سے بعض لوگ ہدایت یافتہ ہو گئے اور اکثر لوگ فاسق نکلے۔ اس کے بعد اور نبی بھیجے۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بھیجا اور انہیں انجیل دی۔

رہبانیت کی ابتدا:

﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کے متبعین نے آہستہ آہستہ شریعت کو چھوڑنا شروع کیا اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے طاقت سے نافرمانوں کو روکنا چاہا لیکن طاقت ان کے مقابلے میں کم تھی، یہ بیچارے قتل ہو گئے اور بعض ایسے تھے جن کے پاس طاقت نہیں تھی تو انہوں نے زبان سے سمجھا کر روکنا چاہا تو یہ بھی آخر کار ان کے حملوں کی زد میں آ کر شہید ہو گئے۔ ایک تیسرا طبقہ تھا کہ جنہوں نے روکنا چاہا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ نہیں روک سکتے تو انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ہم اس معاشرے سے الگ تھلگ ہو جائیں تاکہ گناہوں میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا حکم اس شریعت میں نہیں تھا بلکہ انہوں نے خود اس کا اہتمام کیا تھا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں نے رہبانیت کو از خود اختیار کیا تھا، ہم نے ان پر رہبانیت کو فرض قرار نہیں دیا تھا اور ان کی منشا یہ تھی کہ ہم گناہوں سے بچ جائیں اور اللہ ہم سے راضی ہو جائیں، بعد میں وہ اس پر قائم نہیں رہ سکے۔ البتہ ان میں سے جو ایمان لائے تھے تو ہم نے ان کو اجر دیا۔ البتہ ان میں بھی اکثر ایسے تھے جو نافرمان نکلے۔

رہبانیت کا حکم:

”رہبانیت“ کا اصل معنی ڈرنا ہے، راہب کہتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے کو

یعنی اللہ سے ڈر کر حلال چیزوں کو چھوڑ کے الگ تھلگ ہو کر رہنا۔ ہمارے ہاں رہبانیت کا حکم کیا ہے؟ اس کے لیے سمجھیں کہ رہبانیت یعنی حلال چیزوں کو چھوڑ دینے کے تین درجے ہیں:

(1): اعتقاداً حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر دیں، یہ جائز نہیں ہے۔

(2): اعتقاداً تو حلال سمجھیں لیکن عملاً ایسے ہوں جیسے اس کو حرام سمجھیں یعنی اس شدت کے ساتھ چھوڑیں جیسے حرام کو چھوڑا جاتا ہے، جیسے کوئی انسان بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور ایک حلال چیز کھانے سے بیماری بڑھ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے دس سال ہو گئے کہ میں نے فلاں چیز کو نہیں کھایا اور نہ ہی کھاؤں گا۔ اب یہ عملاً ایسا ہے جیسے حرام سمجھا ہو لیکن یہ جائز ہے کیوں کہ اس کا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ یہ چیز حرام ہے بلکہ اعتقاد یہ ہے کہ اس چیز کے کھانے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے لہذا میں نہیں کھاؤں گا۔ اسی طرح ایک آدمی بعض جائز چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے کہ اس سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مثلاً بازار میں جانا جائز تو ہے لیکن میں نہیں جاؤں گا کیوں کہ اگر جاؤں گا تو بد نظری ہوتی ہے۔ تو یہاں حلال چھوڑنے کا منشا حرام سے بچنا ہے، اس لیے یہ بھی جائز ہے۔

(3): آدمی بعض حلال چیزوں کو چھوڑے اور یہ سمجھے کہ اس کے چھوڑنے پر مجھے ثواب ملتا ہے تو اس اعتقاد کے ساتھ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ نرم آرام دہ کپڑا پہننا جائز ہے لیکن میں نہیں پہنتا کیوں کہ اس کے نہ پہننے پر مجھے ثواب ملے گا... یہ غلط بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

1: حلال کو چھوڑنا اعتقاداً حرام سمجھتے ہوئے، یہ جائز نہیں ہے۔

2: حلال چیز کو چھوڑنا علاجاً یہ جائز ہے۔

3: حلال چیز کو چھوڑنا کہ اس کے چھوڑنے پر ثواب ملے گا یہ بھی جائز نہیں۔

اہلِ کتاب کے ایمان لانے پر دو اجر کی وجہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾﴾

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تا کہ اللہ تمہیں دہرا اجر دے اور تمہیں نور عطا کرے جس کے ذریعے تم چلو اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

پہلے ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لائے تھے اور اب ایمان حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر لاؤ تو تمہیں دو اجر مل جائیں گے۔ قیامت کے دن اللہ تعالی تمہیں نور عطا فرمائیں گے جس پر تم چلو گے اور جو پہلے تم گناہ کر چکے ہو اللہ تعالی ان کو معاف فرمادیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اسلام قبول نہیں کر رہا اور نیک اعمال کرتا ہے تو اس کے نیک اعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن جب یہ بندہ ایمان قبول کرلے گا تو جو حالت کفر میں نیک اعمال کیے تھے اللہ ان نیک اعمال کا بھی اجر عطا فرما دیتے ہیں اور حالت کفر میں جو گناہ کیے تھے اللہ اپنے کرم سے ان گناہوں کو گناہ نہیں لکھیں گے۔

اہل کتاب کو ”يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا“ سے خطاب کی وجہ:

یہاں صرف ایک اشکال رہ جاتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں انہیں اہل کتاب کہتے ہیں اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں تو پھر انہیں اہل کتاب نہیں کہتے بلکہ اہل ایمان کہتے ہیں لیکن یہاں پر نصاریٰ کو خطاب فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ حالانکہ کہنا چاہیے تھا

''یٰاَهۡلَ الۡكِتٰبِ''

اصل میں ان کو یہ بات سمجھانا مقصود ہے کہ دیکھو! اگر اس بات پر غور کرو تو کہ تمہارے ہاں انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننا چاہیے۔ صرف تم نے اس لکھے ہوئے پر عمل ہی کرنا ہے۔ اس حساب سے تو تم تو مؤمنین کی طرح ہو۔ تمہارے پاس بھی لکھی ہوئی کتاب موجود ہے اور مؤمنین کے پاس بھی کتاب قرآن موجود ہے، لکھے ہوئے قرآن پر یہ بھی عمل کرتے ہیں اور لکھی کتاب پر تم بھی عمل کرلو تو تم ایمان والوں کی طرح ہو۔ اس لیے یہاں پر ''یٰاَهۡلَ الۡكِتٰبِ'' کے بجائے ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' فرمایا۔

بعض کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے بالآخر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونا تھا اس لیے لفظ ایمان استعمال فرمایا مآل کے اعتبار سے۔

﴿لِّئَلَّا یَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَلَّا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۹﴾﴾

یہاں پر ''لا'' زائدہ ہے مطلب یہ ہے کہ وہ اہل کتاب جو ایمان لے آئے ان کو دگنا اجر ملے گا اور جو ایمان نہیں لائے ان کو قیامت کے دن اس بات کا پتا چلے گا کہ اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ سارا فضل اللہ نے اپنے اختیار میں رکھا ہے۔ اللہ جس کو چاہتے ہیں اسے عطا فرمادیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں اس کو نہیں عطا فرماتے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ المجادلۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُکَ فِیۡ زَوۡجِہَا وَ تَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ٭ۖ وَ اللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۱﴾﴾

ابتدائی آیات کا شانِ نزول:

حضرت اوس بنت صامت رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''اَنۡتِ عَلَیَّ کَظَھۡرِ اُمِّیۡ ''کہ تم مجھ پر ایسے ہو جیسے میری ماں کی پشت ہے۔ عربوں میں جب کوئی ظہار کر لیتا تو اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جاتی اور یہ طلاق سے بھی سخت حرام ہوتی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ حضرت خولہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرے شوہر نے یہ بات کہہ دی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے علم میں تمہارے بارے میں کوئی وحی نہیں ہے۔ حضرت خولہ رو پڑیں۔ پھر اللہ سے فریاد کی ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَشۡکُوۡ اِلَیۡکَ ''کہ اللہ میں تیرے دربار میں فریاد لے کر آئی ہوں، میرے بچے ہیں، میں بوڑھی ہوں، اب میں کہاں جاؤں گی؟ اللہ! میری مدد فرما۔ اس وقت اس سورت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور ظہار کا حکم آ گیا۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں وہاں قریب تھی، پوری گفتگو میں بھی نہیں سن سکی لیکن اللہ نے پوری گفتگو سن لی۔

ظہار کی تعریف اور حکم:

''ظہار'' کہتے ہیں کہ شوہر اپنی بیوی کو محرماتِ ابدیہ کے ایسے حصے کے ساتھ تشبیہ دے کہ جس کو دیکھنا اس کے لیے جائز نہ ہو۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کرو۔ اگر غلام آزاد کرنے کی طاقت نہیں ہے تو دو ماہ مسلسل روزے رکھو۔ دو ماہ مسلسل روزے نہیں رکھ سکتے بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی عذر کی وجہ سے تو پھر ساٹھ مساکین کو کھانا کھلاؤ یا ساٹھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار غلہ یا اس کی قیمت دے دو۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے شوہر غریب تھے تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میرے پاس تو کوئی غلام نہیں ہے۔ فرمایا: روزے رکھو! کہا کہ جی میں تو آنکھوں کا مریض ہوں، میں تو دن میں تین بار کھانا نہ کھاؤں تو میری بینائی ختم ہونے کا خطرہ ہے۔ فرمایا کہ پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ کہا کہ میری تو اس کی بھی استطاعت نہیں ہے، ہاں اگر آپ مدد کر دیں تو کچھ کر سکوں گا۔ تو پھر کچھ غلہ اللہ کے نبی نے دیا، کچھ باقی صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیا۔ یوں جمع کر کے ساٹھ مساکین کا فدیہ ان کو دیا جو انہوں نے مساکین میں تقسیم کیا اور یوں مسئلہ حل ہو گیا۔

اگر کوئی شخص ظہار کر لے اور بیوی سے رجوع کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ شرط ہے کہ کفارہ ضرور دے اور یہ قرآن کریم میں بالکل صاف طور پر اللہ نے فرما دیا ہے ﴿ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ کہ یہ اس شخص کے لیے ہے جس نے یہ گفتگو کی ہے اور اب اس کا تدارک کرنا چاہتا ہے اور اگر طلاق دے کر فارغ کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ یعنی ظہار ہو گیا ہو تو بیوی اس سے جدا نہیں ہو گی، بیوی اس کے نکاح میں

رہے گی لیکن اس کے ساتھ صحبت اور صحبت کے جو اسباب ہیں وہ اختیار نہ کرے۔ہاں اگر وہ اس کے ساتھ ملنا اور تعلقات رکھنا چاہتا ہے تو پھر یہ کفارہ ہے اور اگر طلاق دینا چاہتا ہے تو پھر اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

ایمان والوں کو ایمان کا حکم؟

﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾

یہ جو حکم دیا گیا ہے کفارے کا یہ اس لیے ہے تاکہ تم اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان تو پہلے سے تھا، تو یہ دوبارہ ایمان لانے کا حکم کن کو ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکم تو ایمان والوں کو ہی ہے لیکن یہاں ایمان لانے سے مراد اعتقاد نہیں ہے، یہاں ایمان سے مراد عمل ہے یعنی اپنا عمل ایسے کرو کہ تمہارا عمل بتائے کہ تم مؤمن ہو۔ تو مراد اس سے عمل ہے، اعتقاد نہیں۔

عذاب مہین کا معنی:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾

جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس طرح ذلیل ہوں گے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے تھے۔

﴿وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝۵﴾

اور کفار کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہو گا۔

یہ پہلے میں بات سمجھا چکا ہوں کہ کافر کو جو عذاب ہوتا ہے وہ اسے رسوا کرنے کے لیے ہوتا ہے اور مؤمن کو جو عذاب ہوتا ہے وہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے، ہاں صورت اس کی عذاب کی ہوتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات اس پر

عذاب کا اطلاق ہو جاتا ہے کیونکہ صورت خزی اور رسوائی کی ہوتی ہے۔

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝٦﴾

اللہ قیامت کے دن سب کو اٹھائیں گے اور انہیں ان کے اعمال کی خبر دیں گے، اللہ نے توسب کچھ محفوظ کیا ہوا ہے اور یہ لوگ بھول گئے ہیں۔

"یہ لوگ بھول گئے ہیں"...یا تو سچ مچ بھول گئے ہیں یا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے بندہ جاننے کے باوجود بھول رہا ہوتا ہے۔

معیتِ ذاتیہ:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝٧﴾

یہودیوں کی عادت تھی کہ جب مسلمانوں کو آتا دیکھتے تو آپس میں سرگوشی کرتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ مسلمان پریشان ہوں کہ شاید ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں منافقین بھی ایسا کرتے تھے۔

تو فرمایا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین ہے اللہ اس کو جانتے ہیں۔ اگر تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو تو ان کے ساتھ چوتھا اللہ ہوتا ہے، پانچ آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو تو ان کے ساتھ چھٹا اللہ ہوتا ہے۔ اور یہ سرگوشی کرنے والے کم یا زیادہ ہوں، وہ جہاں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ ان کو ان کے اعمال کے بارے میں بتائے گا کیونکہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں میں پھر عرض کرتا ہوں اور میں بار بار یہ بات لاتا ہوں کہ دیکھو یہاں ہے ﴿هُوَ مَعَهُمْ﴾، اب اگر تاویل نہ کرو تو معیت ذاتیہ ہوتی ہے اور تاویل کرو تو معیت وصفیہ ہوتی ہے۔ تو جو لوگ تاویل نہیں کرتے ان کو معیت ذاتیہ کا قائل ہونا چاہیے، اور اگلی بات میں پھر یہاں کہتا ہوں تاکہ آپ کے ذہن میں بات پختہ ہو جائے۔ ہمارے حضرات اکابر میں سے اگر کوئی معیتِ ذاتیہ کی نفی کرتے ہیں تو مقصود تجسیم کی نفی ہے، اگر تجسیم ذہن میں نہ ہو تو معیتِ ذاتیہ پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

یہود احکام کے مکلف نہیں تو انہیں حکم کیوں؟

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کو سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا وہ پھر بھی وہی کام کرتے ہیں اور سرگوشی بھی کیسی کرتے ہیں؛ گناہ کی اور ظلم وزیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کرنے کی۔

ایک تو مسلمان کو تکلیف دینا ایک مستقل ظلم ہے اور اگر واقعتاً اس کے خلاف کوئی پلان ہے تو اس کے تو ظلم ہونے پر تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے۔

یہاں پر ایک سوال اور جواب ذہن میں رکھیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ احکام کا مکلف مسلمان ہے اور سرگوشیاں کرتے تھے یہودی، یہودی تو احکام کے مکلف ہی نہیں تھے تو ان کو منع کرنے کا فائدہ کیا ہو گا؟ ان کو منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہود بھی افعال کے مکلف ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہود من حیث الکافر تو احکامِ شریعتِ محمدیہ کے مکلف نہیں ہیں لیکن من حیث المعاہد یہ بھی مکلف ہیں کیوں کہ یہودیوں کا مسلمانوں کے

ساتھ معاہدہ تھا۔ تو جب کوئی بندہ معاہدہ کرتا ہے تو پھر معاہدے میں دونوں فریقوں کو بات ماننا پڑتی ہے۔ معاہدہ تھا کہ ایک دوسرے کو تکلیف نہیں دیں گے اور ان کی سرگوشی سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی تھی، تو فرمایا کہ تم ایسا کام کیوں کرتے ہو کہ جس سے تکلیف ہوتی ہے؟ تو وہ من حیث الکافر تو مکلف نہیں ہیں لیکن من حیث المعاہد پھر بندہ مکلف ہو جاتا ہے۔

یہود کی گستاخی (اَلسَّامُ عَلَیۡکُمۡ کہنا)

﴿وَ اِذَا جَآءُوۡكَ حَيَّوۡكَ بِمَا لَمۡ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ يَقُوۡلُوۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ لَوۡ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوۡلُ ؕ حَسۡبُهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ يَصۡلَوۡنَهَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ﴿۸﴾﴾

یہودی بسا اوقات آتے اور کہتے "اَلسَّامُ عَلَیۡکُمۡ" سام کا معنی موت ہے۔

ایک مرتبہ یہودی آیا اور اس نے کہا "اَلسَّامُ عَلَیۡکُمۡ" ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بہت غصہ آیا تو آپ نے کہا: "اَلسَّامُ عَلَیۡکُمۡ لَعَنَکُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیۡکُمۡ" کہ موت تم پر ہو، لعنت ہو اور خدا کا غضب تم پر نازل ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تھی ناں اور ایمان کا تقاضا بھی ہے کہ بندہ ایسے موقع پر خاموش نہ رہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ! ایسی بات کیوں کہتی ہو؟ کہا: حضور! اس نے ایسی بات کہی جو ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تو جواب ان کو دے دیا تھا۔ انہوں نے کہا "اَلسَّامُ عَلَیۡکُمۡ" تو میں نے کہا "عَلَیۡکُمۡ" ان کی دعا قبول نہیں ہو گی لیکن میری دعا قبول ہو گی تو میں نے جواب دے دیا۔

فرمایا: اے پیغمبر! جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو سلام کرتے ہیں اور ایسا سلام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کو کبھی نہیں کیا، اور یہودی یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم

غلط کہتے ہیں تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب کیوں نہیں آتا؟ اللہ فرماتے ہیں: ﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ﴾ کہ دنیا میں عذاب نہ آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عذاب نہیں ہو گا، عذاب ہو گا اور عذاب بھی جہنم کا ہو گا، تم اس میں داخل ہو گے اور وہ بہت گندا ٹھکانا ہے۔

مجلس میں کشادگی کرنے کا حکم:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱﴾

اے ایمان والو! جب کہا جائے کہ مجلس میں کشادگی پیدا کرو تو تم کشادگی پیدا کر لیا کرو! اللہ تمہیں وسعت عطا فرمائیں گے اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ! تو تم اٹھ جاؤ۔ اللہ ایمان والوں کو بلندیاں عطا فرمائیں گے اور ایمان والوں میں بطورِ خاص اہلِ علم کو اللہ مزید درجات عطا فرمائیں گے۔ اللہ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہیں۔

بعض لوگوں کو مجلس سے اٹھانے کی وجہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے تھے۔ اسی دوران کچھ بزرگ صحابہ بھی آ گئے جو بدری تھے، ان کو مجلس میں بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملی تو وہ کھڑے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمٹ سمٹ کر بیٹھو تاکہ آنے والوں کو جگہ ملے، مجلس کے شرکاء سمٹ کر بھی بیٹھے لیکن اس کے باوجود ان آنے والے صحابہ کرام کے لیے بیٹھنے کی جگہ نہ بن سکی۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حضرات سے فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ اور ان کو جگہ دے دو!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بعض حضرات کو اٹھایا تو اس کی وجہ کیا تھی؟

بعض کہتے ہیں کہ وہ پہلے سے بیٹھے تھے تو جگہ تنگ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ تو یہ ایسے تھا جیسے شاگرد کو استاد کہتا ہے کہ بھائی! تم اٹھ جاؤ، مہمان ہیں ان کو جگہ دو! ایک تو یہ وجہ تھی۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تادیباً اٹھایا کہ دیکھو! وہ آئے ہیں تو تمہیں چاہیے تھا کہ جگہ کشادہ کرتے یا سمٹ کر ان کو بٹھاتے، اس لیے تم خود اٹھ جاؤ! یا تادیباً نہیں اٹھایا بلکہ بس ویسے اٹھا دیا کہ اب تم اٹھ جاؤ، ان کو بھی بات سن لینے دو۔

مجلس کے آداب:

☼ اور جب یہ کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کشادہ کرو تو کشادگی پیدا کیا کرو، اللہ تعالیٰ وسعت عطا فرمائے گا ﴿يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کیا مطلب کہ دنیا میں رزق میں وسعت عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی وسیع جنت عطا فرمائے گا۔

☼ اور جب دو بندے بیٹھے ہوں اور سرگوشی کر رہے ہوں تو تیسرے آدمی کو آ کر نہیں بیٹھنا چاہیے جب تک کہ اجازت نہ ہو۔ یہ ادب کا تقاضا ہے۔ خواہ مخواہ نہ بیٹھیں، اجازت لیں کہ میں آ جاؤں یا بیٹھ سکتا ہوں؟ اگر کہیں کہ نہیں! تو چلے جائیں۔

☼ اور جب کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ کسی کو اٹھاؤ اور خود بیٹھ جاؤ!

☼ اور جب کچھ لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی اور بندہ آ جائے تو کوشش کرو کہ سمٹ کر بیٹھ جاؤ اور جگہ بناؤ تا کہ آنے والا بھی بیٹھ سکے۔

☼ اور جب کوئی بڑا کہہ دے کہ اٹھ جاؤ! تو فوراً اٹھ جایا کرو، جب کہے کہ جگہ وسیع کر دو! پھر فوراً وسیع کرو۔ پھر آدمی کو اس میں بالکل تردد کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

حضور علیہ السلام سے ملاقات سے پہلے صدقہ کا حکم:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ

صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

جو یہودی تھے وہ بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں بات کرتے اور وقت ضائع کرتے اور بعض مالدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑی دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے۔ اس کا ایک اثر تو یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ بلا وجہ لمبی لمبی بات خلوت میں کریں، ایک ایک کو وقت دیں تو وقت بہت زیادہ چاہیے اور دوسرا یہ اثر ہوتا کہ جو غریب صحابہ تھے ان کو اس کی وجہ سے تکلیف ہوتی تھی کہ ہم غریب ہیں، ہم پیچھے رہتے ہیں، ان مالداروں کو قرب ملا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لمبی لمبی بات کرتے ہیں۔ تو ان غریب صحابہ کی بھی دل جوئی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے اللہ پاک نے حکم دیا کہ تم ایسا کام نہ کرو! اگر کبھی بات کرنی ہی ہے تو نیکی کی بات کرو اور کبھی خلوت میں سرگوشی کرنے کا تو تصور ہی نہ کرو! اور پیغمبر سے بات کرنی ہو تو پہلے صدقہ دو اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو! یہ حکم دیا گیا۔ اب جو منافق تھے ان کے لیے تو صدقہ دینا مشکل تھا، انہوں نے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ تو حکم شرعی کا یہ فائدہ ہوا۔ تو فرمایا: اے ایمان والو! اگر کبھی تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوت میں بات کرنی پڑے تو اس تنہائی کی بات سے پہلے صدقہ کر لیا کرو! یہ تمہارے لیے بہتر ہے -کیونکہ تمہیں اس کا اجر ملے گا- اور پاکیزہ بھی ہے -اس لیے کہ جب اصلاح ہو گی تو فضول باتیں نہیں کرو گے۔ اگر تمہارے پاس صدقہ کے لیے مال نہ ہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ دینا واجب تھا لیکن اگر نہ ہو تو اللہ تمہیں معاف فرما دے گا۔

اس حکم کی منسوخی:

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ

تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

تنہائی میں بات کرنے کی وجہ سے جو صدقہ دینا ضروری تھا کیا تم اس سے ڈر گئے ؟! اب جب تم صدقہ نہیں دے سکتے تو اللہ نے کرم یہ کیا کہ تمہیں معاف کر دیا! بس اب نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو! اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے باخبر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد تنہا میں وہ شخص ہوں جس نے اس پر عمل کیا ہے، نہ مجھ سے پہلے کسی نے کیا اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا۔

ملاقات کے لیے نظم بنایا جا سکتا ہے:

مجھے ایک بات پہ اشکال رہتا تھا لیکن اس آیت کو سمجھنے کے بعد میرا اشکال ختم ہو گیا۔ اشکال یہ رہتا تھا کہ آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہاں ماہانہ خانقاہی مجلس میں لوگ آتے ہیں تو میں سب سے کہتا ہوں کہ آپ نے بات بھی سن لی ہے، بیعت بھی کر لی ہے، مصافحہ بھی کر لیا ہے، اب بلا وجہ کمرے میں نہ آیا کریں، ہاں اگر کوئی ضروری کام ہو تو آ جائیں، میں اس سے آپ کو منع نہیں کرتا! کیونکہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ فارغ ہونے کے بعد آتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ پوچھتا ہوں کہ کوئی کام ہے؟ نہیں جی بس ویسے سلام کرنا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ سلام تو ہم نے باہر کر لیا تھا... لیکن پھر بھی مجھے ایک جھجک اور خوف سا رہتا تھا کہ یار ان کی دل شکنی نہ ہو کہ ہمیں بٹھاتا کیوں نہیں ہے؟ اس آیت کو پڑھنے کے بعد بالکل شرح صدر ہو گیا ہے کہ یہ پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ دیکھیں! نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے صاحبِ حیثیت لوگ بات کرتے تو اس سے دوسروں کا دل دکھتا اور جب بہت زیادہ دیر تک بات کرتے تو اللہ

کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ ایک ایک کو میں اتنا اتنا وقت کیسے دوں گا؟ تو اللہ پاک نے مستقل حکم شرعی نازل فرما دیا کہ اگر یہ کرنا ہے تو پھر کچھ صدقہ دے کے آیا کرو پھر بات کیا کرو! اس کا معنی ہے کہ کچھ پابندی لگی۔ اب جو صدقہ نہیں دے سکتے تھے تو ان کو معافی دے دی لیکن اس سے شریعت کا مزاج تو سمجھ میں آ گیا کہ بلاوجہ یوں نہیں کرنا چاہیے۔

منافقین کی کذب بیانی:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لَا مِنْهُمْ ۙ وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

کچھ منافق تھے جو قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم تم میں سے ہیں، ہم مسلمان ہیں، اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں ان کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فرمایا: کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جنہوں نے ایسے لوگوں سے دوستی کی ہوئی ہے جن پر اللہ کا غضب ہے۔ یہ لوگ نہ تم میں سے ہیں نہ ان میں سے ہیں۔ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور ان کو پتا بھی ہے کہ ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہوا ہے۔

﴿مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لَا مِنْهُمْ﴾... مطلب کہ ظاہراً تمہارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ نہیں ہیں اور باطناً ان کے ساتھ ہیں تمہارے ساتھ نہیں ہیں، تو نہ پورے ان کے ساتھ ہیں اور نہ پورے تمہارے ساتھ ہیں۔

﴿اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾﴾

یہ لوگ اپنی قسموں کو ڈھال بناتے ہیں تم سے بچنے کے لیے کہ خدا کی قسم ہم

تو مسلمان ہیں، ہم تو مؤمن ہیں... یہ صرف تم سے بچنے کے لیے کرتے ہیں، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝۱۸﴾

جب قیامت کا دن ہو گا تو یہ لوگ اللہ سے اس دن بھی یہی باتیں کریں گے جس طرح تمہارے سامنے کرتے ہیں، کہیں گے کہ اللہ! ہم قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد یہ نہیں تھا، اللہ کی قسم! ہمارا ارادہ یہ نہیں تھا۔ اللہ فرمائیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو، میں تمہارے ارادے کو جانتا ہوں۔

حزب الشیطان کی محرومی:

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ۝۲۰﴾

شیطان نے ان پر غلبہ حاصل کیا ہے اور اللہ کی یاد کو ان سے بھلا دیا ہے، یہ شیطان کا گروہ ہے اور شیطان کا گروہ نقصان اٹھائے گا۔ جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل ترین ہوں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۱﴾

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ میں اور میرے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ بے شک اللہ طاقتور اور غالب ہے۔

اس پر ایک سوال ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ میرے رسول غالب رہیں گے لیکن دیکھا جائے تو کتنے انبیاء اور رسول ایسے ہیں جو شہید ہو گئے! اس کا جواب میں

نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ غلبے کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہے غلبہ برہانی اور ایک ہے غلبہ عملی۔

[1]: یہاں غلبہ عملی نہیں بلکہ غلبہ برہانی مراد ہے۔ ظاہراً غلبہ اگر کفر کو مل بھی جائے تو بھی دلیل سے ہمیشہ رسول ہی غالب رہتا ہے۔

[2]: یا غلبہ سے مراد یہ ہے کہ میں تمہارا بدلہ لوں گا۔ اگر کوئی بندہ کسی نبی کو تکلیف دے تو اللہ اس کا بدلہ خود لیتے ہیں، اگر کوئی شخص رسول کو شہید کرے تو انتقام اللہ خود لیتے ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ غالب ہم ہیں اور ہمارے رسول ہیں۔ اللہ تو ہے ہی غالب اور رسول کے غالب ہونے کا معنی کہ اگر کوئی رسول کو قتل کر بھی دے تو اس کا بدلہ اللہ خود لیتے ہیں اور بالآخر پیغمبر ہی غالب آتا ہے اور کفر مغلوب ہو کر دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔

حزب اللہ کی کامیابی:

﴿لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَھُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَھُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَھُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَھُمۡ ؕ﴾

جو لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ان لوگوں سے پیار کریں جو اللہ اور اللہ کے رسول کے مخالف ہیں خواہ وہ ان کے والد ہوں، بیٹے ہوں، بھائی ہوں یا خاندان کے لوگ ہوں۔

﴿اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الۡاِیۡمَانَ وَ اَیَّدَھُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ﴾

ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو لکھ دیا ہے اور اللہ اپنی روح سے ان کی مدد فرماتے ہیں۔ ”روح“ سے مراد نورِ ایمان ہے کہ اللہ ایمان میں ایسا نور عطا فرما دیتے ہیں کہ جس سے بندے کی مدد ہوتی ہے، اس نور کی وجہ سے بندہ کفر کو بھی پہچانتا ہے،

سازشوں سے بھی بچ جاتا ہے۔ تو روح سے مراد یہاں نورِ ایمان ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾

اللہ ان کو ایسے باغات میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہی اللہ کا گروہ ہے اور اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔

اللہ ہمیں حزب اللہ میں شامل فرمائیں اور حزب الشیطان سے ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ اللہ منافقت کی زندگی اور منافقت کی موت سے بچائیں۔ اللہ خالص ایمان عطا فرمائیں۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الحشر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ①﴾

ابتدائی آیات کا شانِ نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ میں وہ اسباب جن سے دین مضبوط ہوتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے اختیار فرمائے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ مدینہ منورہ میں یہود بستے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدے کیے۔ ان معاہدات میں ایک بنیادی شق یہ تھی کہ اگر یہود پر کسی نے حملہ کیا تو ہم تعاون کریں گے اور ہم پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا تو یہود ساتھ دیں گے۔ اگر یہود کے بندے سے قتل ہو گیا تو دیت میں ہم ساتھ شریک ہوں گے اور اگر ہمارے بندے سے قتل ہو گیا تو دیت میں یہود شریک ہوں گے۔ یہ معاہدہ تھا۔

بیر معونہ کا واقعہ:

اس معاہدے کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تھے تو بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا کہ ایک قبیلہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ کچھ معلمین بھیجیں جو ہمارے قبائل کو دین سکھائیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر صحابہ کو بھیجا۔ راستے میں انہوں نے عہد شکنی کی اور ان صحابہ کو شہید کر دیا۔ ان ستر

میں سے صرف ایک عمرو بن امیہ ضمری بچ گئے اور بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ واپس آرہے تھے تو راستے میں ان کا دو کافروں سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کافر ہیں، مخالف ہیں، ان پر حملہ کر کے دونوں کو قتل کر دیا۔ جب یہ دونوں کو قتل کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو پتا چلا کہ وہ دونوں قبیلہ بنی عامر کے افراد تھے اور بنی عامر وہ قبیلہ تھا کہ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ تھا۔ اب معاہدے کے رو سے ان کو مارنا جائز نہیں تھا لیکن ان کو پتا نہیں تھا کہ یہ بنو عامر قبیلہ کے ہیں، انہوں نے غلطی سے مار دیا۔ تو جب غلطی سے مارا تو اب قصاص تو تھا نہیں۔ البتہ دیت آتی تھی۔

بنو نضیر کی عہد شکنی اور جلاوطنی:

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو نضیر کے پاس گئے جو یہودی تھے کہ چونکہ دیت ہے اور ہم سب نے مل کر ادا کرنی ہے، اس لیے کچھ رقم ہم جمع کریں اور کچھ تم جمع کرو۔ بنو نضیر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ یہاں تشریف رکھیں، ہم مال جمع کرتے ہیں، اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جس مقام کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں اوپر سے بڑا پتھر گراؤ تا کہ آپ یہیں قتل ہو جائیں اور معاملہ ختم ہو جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آگئی، اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تو آپ وہاں سے اٹھ کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا اور بنو نضیر کو پیغام بھجوا دیا کہ تم نے وعدہ خلافی کر کے معاہدہ کو توڑ دیا ہے، اب ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہو گیا، لہذا اب تمہیں دس دنوں کی مہلت دی جاتی ہے کہ تم اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ، ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے۔ لیکن بنو نضیر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ جب تیار نہیں ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر گئے اور باقاعدہ جہاد کا اعلان کیا کہ ان کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ سارے لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ اب ان کے جو درخت تھے صحابہ کرام نے

جلانے شروع کر دیے تا کہ ان کو تکلیف ہو، بعض صحابہ کرام نے نہیں جلائے کہ بنو نضیر جب چلیں جائیں گے تو یہ درخت ہمارے کام آئیں گے۔ جب انہوں نے سمجھا کہ اب ہماری جان بخشی کی کوئی صورت ممکن نہیں، شاید ہم ختم ہو جائیں تو پھر ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم مدینہ چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ تو اکثر ان میں سے شام کے علاقے میں چلے گئے اور کچھ ان میں سے خیبر میں چلے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جتنا سامان ایک بندہ ایک اونٹ پر لاد سکتا ہے لے جائے، ان لوگوں نے گھروں کے دروازے، چارپائیاں اور جو کچھ اٹھا سکتے تھے اٹھا کر وہاں سے چلے گئے۔

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی وسعتِ ظرفی تھی کہ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنا چاہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ مدینہ چھوڑ کے جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس حکمت عملی میں حکمتیں بہت زیادہ تھیں لیکن آپ نے وسعت ظرفی کا مظاہرہ فرمایا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

یہود کی دو مرتبہ جلاوطنی:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١
هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾

جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافر لوگوں کو ان کے گھروں سے پہلی مرتبہ نکالا تھا۔

"لِاَوَّلِ الْحَشْرِ" یعنی پہلی مرتبہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے

قبل یہود کے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ ان کو اپنے گھروں سے جلاوطن کیا گیا ہو۔ یہ پہلی بار ہوا تھا۔ یہاں "پہلی بار" کہنے میں ایک لطیف اشارہ یہ ہے کہ اب بھی نکالا ہے اور ایک وقت بعد میں بھی آئے گا کہ ان کو دوسری مرتبہ بھی ان کے گھروں سے نکالا جائے گا۔ تو مدینہ سے نکل کر ان میں سے جو لوگ شام چلے گئے تھے وہ تو چلے گئے، بعض لوگ خیبر میں رک گئے تھے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ان کو خیبر سے بھی نکالا۔ تو یہ سارے کے سارے پھر شام میں چلے گئے تھے۔

یہود کا گمانِ باطل:

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۖ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہاں ان کے قلعے اتنے زیادہ مضبوط تھے کہ تمہارا بھی خیال نہیں تھا کہ وہ باہر نکلیں گے اور خود ان کا بھی خیال یہی تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچالیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے پکڑا کہ ان کو جہاں سے گمان بھی نہیں تھا! اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

﴿يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۖ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲﴾

وہ لوگ اپنے مکانات کو اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے توڑ رہے تھے۔ اے آنکھوں والو! اس واقعے سے عبرت حاصل کرو!

مطلب کہ مؤمن بھی ان کے مکانات کو توڑ رہے تھے اور یہود خود بھی توڑ رہے تھے۔ "وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ" کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے توڑ رہے تھے... یہ ایسے تھا جیسے کوئی رضامند ہوتا ہے حالانکہ اس میں بنو نضیر کی رضامندی نہیں تھی لیکن

چونکہ انہوں نے جانا تھا تو مسلمان بھی ان کے کواڑ توڑ توڑ کر ان کے حوالے کرتے رہے کہ یہ لو اپنا سامان اور نکل جاؤ یہاں سے! اس سے ایک تو ان کا غیظ و غضب بڑھتا اور دوسرا اس سے مسلمانوں کی طاقت کا اظہار ہوتا۔ اس وجہ سے وہ مسلمان بھی ان کے مکانات توڑتے رہے۔

دنیا میں جلاوطنی اور آخرت میں عذاب کی وجہ:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳﴾

اگر اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں یہ جلاوطنی کا فیصلہ نہ فرماتے تو ان پر دنیا میں عذاب آجاتا اور یہ ختم ہو جاتے۔ تو قتل کا عذاب نہیں آیا بلکہ ان کو جلاوطن کر کے روانہ کر دیا گیا اور آخرت میں ان کے لیے پھر ایک عذاب ہو گا جہنم کا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴﴾

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو وہ سمجھ لے کہ اللہ سخت پکڑ فرماتے ہیں۔

تو دنیا میں جلاوطنی کا عذاب تھا نقضِ عہد کی وجہ سے اور آخرت میں ان کو عذاب ہو گا دنیا میں عدمِ ایمان کی وجہ سے کہ ان میں ایمان نہیں تھا۔ ایمان نہ ہونے کی اصل سزا آخرت میں ہوتی ہے اور نقضِ عہد کی سزا دنیا میں ہوتی ہے۔ تو جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور عہد توڑا تو اس کی سزا دنیا میں مل گئی اور پیغمبر کی مخالفت کی اور ایمان نہیں لائے تو اس کی سزا ان کو پھر آخرت میں دی جائے گی۔

صحابہ کرام کا اجتہادی اختلاف:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾

تم نے جو درخت کاٹے یا جنہیں نہ کاٹا تو یہ اللہ کے حکم سے ہی تھا اور یہ اس لیے ہوا تاکہ اللہ فاسق اور گناہگاروں کو رسوا کرے۔

بعض مسلمانوں نے درخت کاٹ دیے اور بعضوں نے نہیں کاٹے۔ جنہوں نے کاٹے ان کا مقصد یہ تھا کہ جب ہم ان کے درخت کاٹیں گے تو یہودیوں کی تکلیف بڑھے گی اور ہماری طاقت کا اظہار ہو گا اور جنہوں نے نہیں کاٹے ان کی منشا یہ تھی کہ یہود چلے جائیں گے تو یہ درخت ہمارے کام آجائیں گے۔ تو رائے دونوں کی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ ان میں کسی کی رائے تو غلط نہیں تھی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ جنہوں نے درخت کاٹے اور جنہوں نے چھوڑ دیے یہ سب اللہ کے حکم سے تھا۔

اجتہادی اختلاف میں مددِ خدا شاملِ حال ہوتی ہے:

اب دیکھو! یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد تھا درختوں کو کاٹنا اور نہ کاٹنا اور ان کے اجتہاد کو اللہ نے "فَبِاِذْنِ اللّٰهِ" فرمایا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اجتہاد ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے، بندے کی ذات اس میں شامل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اگر اجتہاد درست ہو جائے تو دو اجر ملتے ہیں اور اگر اجتہاد میں خطا ہو جائے تو ایک اجر پھر بھی ملتا ہے، اس لیے "فَبِاِذْنِ اللّٰهِ" فرمایا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کا ایسا کرنا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے ساتھ تھا کہ تم چاہو تو درخت چھوڑ دو اور چاہو تو درخت کاٹ دو! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا اور پھر اللہ تعالیٰ کا اس کو "فَبِاِذْنِ اللّٰهِ" سے تعبیر

کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی احادیث پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جس طرح قرآن کریم پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اکابرین کے اختلاف کی توجیہہ:

یہاں سے ایک بات جو سمجھ آتی ہے -میں نے کہیں پڑھی نہیں ہے لیکن سمجھ آتی ہے- کہ جس وقت انگریز برصغیر میں آیا اور ان کو نکالنے کی تحریک چلی تو اس وقت ہمارے اکابرین میں سے حضرت مدنی اور حضرت تھانوی رحمہا اللہ کی رائے میں اختلاف تھا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کی رائے یہ تھی کہ انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے، کیوں کہ اگر ان کی فوج میں مسلمان شامل ہوں گے تو مسلمان؛ مسلمانوں کو قتل کریں گے تو بہت بڑا گناہ ہو گا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ تھی کہ نہیں، انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا جائز ہے، کیوں کہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ انگریز نے چلا جانا ہے تو اگر مسلمان فوج میں ہوں گے تو آئندہ فوج مسلمانوں کی ہو گی، اگر مسلمان شامل نہیں ہوں گے تو آئندہ فوج کافروں کی ہو گی، تو پہلے بھی کافر ہیں اور ان کے جانے کے بعد پھر کافر ہوں گے، ہم ایک کافر کو نکالیں گے تو دوسرا سوار ہو گا، اس لیے فوج میں اپنے افراد ہونے چاہییں۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے بھی نفع دیکھا اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی نفع دیکھا، دونوں کا کا اجتہاد الگ تھا۔

اب یہاں بھی دیکھو! بعض نے کہا کہ ان کے درخت کاٹ دو، کاٹیں گے تو ان کو تکلیف ہو گی، ان کی شان و شوکت ٹوٹے گی، اسلام کا غلبہ نظر آئے گا اور بعضوں نے کہا کہ ان درختوں کو چھوڑ دو، کیوں کہ جب انہوں نے چلے جانا ہے تو ان کے درختوں سے فائدہ ہمیں ہی ہونا ہے۔

اختلاف محفوظ میں ہو تو دلیل معصوم، عام مجتہدین میں ہو تو دلیل محفوظ:

جس طرح ہمارے اکابر میں اختلاف تھا ایسے ہی حضرات صحابہ کرام رضی

اللہ عنہم میں بھی اختلاف تھا اور یہ بات یاد رکھو کہ جب اختلاف دو ماجور میں ہو تو پھر دلیل میں محفوظ کو پیش کیا جاتا ہے اور جب اختلاف دو محفوظ میں ہو تو پھر دلیل میں معصوم کو پیش کیا جاتا ہے۔ عام مجتہدین میں اختلاف ہو تو ان کا اختلاف کیسا تھا اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف تھا تو اس اختلاف کو سمجھانے کے لیے پھر دو نبیوں کو پیش کرتے ہیں جیسے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کے درمیان اختلاف تھا، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے درمیان اختلاف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے ان بنی اسرائیل کو قتل نہیں کیا جو شرک کرتے تھے، اور قتل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر میں ان کو قتل کرتا تو آپ کہتے کہ میرے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا! اور مجھے آپ فرما کر گئے تھے کہ ان کو اکٹھا کر کے رکھنا، تو میں نے ان کو اکٹھا رکھا! تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں، میری رائے یہ ہے کہ جو شرک کریں ان کو مارو۔ حضرت ابو بکر صدیق میں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف ہو رہا ہے کہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرو اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ نہیں، ان کو قتل نہ کرو، شاید اگلی نسل مسلمان ہو جائے۔

تو اس لیے جب دو ماجور مجتہدین میں اختلاف ہو تو پھر دلیل میں ہم محفوظ صحابہ کو پیش کرتے ہیں اور جب محفوظ صحابہ میں اختلاف ہو جائے تو ان کے اختلاف کو سمجھانے کے لیے انبیاء معصوم کو پیش کیا جائے گا۔

یہ کلیہ یاد رکھو تو بہت ساری مثالوں کو اکٹھا کر سکتے ہو، ان کو بیان کرنے میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔

مالِ غنیمت اور مالِ فیئ کا حکم:

﴿وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ لَا

رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶﴾

اور اللہ نے جو مال اپنے نبی کو فئی کے طور پر عطا فرماتا ہے تو یہ ایسا مال ہے جس کے لیے تم نے نہ اپنے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ دوڑائے، لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ عطا فرما دیتا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

کافر سے حاصل ہونے والا مال دو قسم کا ہوتا ہے:

ایک مال وہ ہوتا ہے کہ جنگ و جدل اور قتل و قتال کے بعد حاصل ہو اور ایک مال وہ ہے کہ جو بغیر لڑائی کے حاصل ہو۔ تو جو مال لڑائی کے بعد حاصل ہوتا ہے اس کو مالِ غنیمت کہتے ہیں اور جو مال لڑائی کے بغیر حاصل ہو جائے اس کو مالِ فئی کہتے ہیں۔ مالِ غنیمت میں پانچواں حصہ بیت المال کا ہوتا ہے اور چار حصے جنگ لڑنے والے مجاہدین میں تقسیم ہوں گے۔ آدمی پیدل ہو تو اس کو ایک حصہ ملتا ہے اور اگر سواری ہو تو اس کو دوگنا حصہ ملتا ہے، ایک اپنا اور ایک سواری کا، اور اگر مالِ فئی ہو تو اس میں غانمین کو کوئی حصہ نہیں ملتا، وہ سارے کا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کا ہوتا ہے۔

مالِ غنیمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ﴾[10]

کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

اگر آپ شمار کریں تو خُمس کے ان حصہ داروں کی تعداد چھ بنتی ہے اور مال فئی میں سارے کا سارا مال اللہ اور اللہ کے رسول کا ہوتا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ

10۔ الانفال 8:41

وسلم کی مرضی ہے کہ جس کو چاہیں عطا کر دیں۔

مالِ فیٔ اور مالِ غنیمت میں اللہ کا حصہ ذکر کرنے کی حکمت:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ﴾

اللہ اپنے رسول کو بستیوں کا جو مال فیٔ کے طور پر عطا کرتا ہے تو یہ اللہ، رسول، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

یہاں جب مالِ فیٔ کے حصہ داروں کو بیان فرمایا تو تعداد چھے ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالِ فیٔ کو اپنی ذات، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کریں گے اس لیے ان کا ذکر یہاں ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس حصہ داروں کے بیان میں "فَلِلّٰهِ" کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ مالِ فیٔ اللہ کے لیے بھی ہے۔ اسی طرح جب مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کا ذکر فرمایا تو اس میں بھی ﴿فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ﴾ فرمایا کہ پانچویں حصے میں بھی اللہ کا حصہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں "فَلِلّٰهِ" اور سورۃ الانفال میں ﴿فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ﴾ کہہ کر یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہ مال کافروں کا ہے اور ناپاک ہے، اور ناپاک مال سے بچنا چاہیے۔ تو اس شبہ کو دور کرنے کے لیے اللہ کا نام شروع میں لیا، اس میں اشارہ ہے کہ دنیا کے سارے مال کے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہیں اور عارضی ملکیت اللہ بندوں کو دے دیتے ہیں لیکن جب بندہ کفر کر کے اللہ سے بغاوت کرتا ہے تو پھر مال بندے کی عارضی ملکیت سے نکل کر حقیقی مالک اللہ کی ملکیت میں واپس آجاتا ہے۔ اب یہ مال خالص اللہ کی ملکیت ہے، بندوں کا اس میں کوئی دخل

نہیں ہے۔ جن مستحقین کو اب یہ مال دیا جائے گا تو وہ خالص اللہ کی ملکیت سے دیا جائے گا اس لیے ان کے لیے حلال اور پاک ہو گا، اس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو گا کہ یہ کافروں کی ملکیت تھا۔ بھائی جب یہ اللہ کی مِلک سے مل رہا ہے تو پاکیزہ ہی ہو گا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾[11]

کہ یہ مال حلال بھی ہے اور پاک بھی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے زمین سے اللہ پانی کا چشمہ نکالیں اور بندہ اس سے پانی پی لے تو یہ پانی پاکیزہ بھی ہے اور حلال بھی ہے۔ تو یہ جو کفار کا مال ہے یہ کفار کی مِلک سے نکل گیا ہے بغاوت کرنے کی وجہ سے، اس لیے یہ مال اب خالص اللہ تعالیٰ کا ہے۔ خیر یہ بات سمجھانے کے لیے شروع میں اللہ کا نام لیا ہے۔

یہ جو "وَلِذِی الْقُرْبٰی" ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ان کو جو مال دیا جاتا ہے مالِ غنیمت کے پانچویں حصے میں سے یا مال فیٔ میں سے تو اس کی دو وجہیں تھی؛ ایک وجہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی معاملات میں مدد کی ہے اس لیے ان کا حق بنتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مستحق ہیں، لہذا ان کو بھی دینا چاہیے جس طرح کہ یتیم مستحق ہے، مسکین مستحق ہے، مسافر مستحق ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار بھی مستحق ہیں، تو ان کو بھی دینا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب یہ تو شق ختم ہو گئی کہ انہوں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی ہے، اللہ کے نبی تو دنیا میں نہیں ہیں اس لیے اب دوسری

11۔ الانفال 69:8

شق رہ گئی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار ہو اور مستحق ہو تو اس کو بھی مالِ غنیمت اور مالِ فئی میں سے دیا جا سکتا ہے، پیغمبر کے دور میں اختیار نبی کا تھا اور اس کے بعد دور خلفاء کا ہے اور آج کے دور میں جو امیر ہو گا اس کا اختیار ہو گا، وہ جس کو جتنا چاہے دے دے، یہ اس کی صوابدید پر ہے۔

مالِ فئی کے مصارف بیان کرنے کی حکمت:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾

مالِ فئی کے یہ مصارف کیوں بتائے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے رواج یہ تھا کہ جو کمانڈر ہوتا یا حاکم ہوتا غنیمت یا فئی کا مال سارا اسی کا سمجھا جاتا تھا۔ تو فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ مال صرف اغنیاء اور بڑوں کے درمیان رہے بلکہ اس میں غرباء اور یتیموں کا حصہ بھی رکھا ہے کہ ان کے پاس بھی مال جائے۔

دین کا خلاصہ؛ اوامر اور نواہی:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

اصل تو یہ ہے کہ مالِ غنیمت میں سے جو خمس ہے اس میں سے اور مالِ فئی میں سے جتنا اللہ کے نبی دیں وہ تم لے لو اور جو نہ دیں تو اس کی وجہ سے تمہارے دلوں میں کدورت نہیں آنی چاہیے، چونکہ پیغمبر کا صوابدیدی اختیار ہے لیکن یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق صرف مالِ فئی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تمام احکامِ شریعت کے ساتھ ہے۔ یہاں "اٰتٰی" بمعنی اَمَرَ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آگے آ رہا ہے "نَهٰىكُمْ"... نہی کے مقابلے میں امر آتا ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ جس بات کا پیغمبر حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس کام سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔ تو نہی یہ امر

کے مقابلے میں آتی ہے۔

میں آپ سے بارہا کہتا ہوں کہ جب غیر مقلد آپ سے کہتے ہیں کہ تم ایک حدیث پیش کرو کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین سے منع کیا ہو... تو ہم کہتے ہیں کہ تم ان غیر مقلدین سے کہو کہ تم ایک حدیث پیش کرو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین کا حکم دیا ہو! کیوں کہ منع کے مقابلے میں حکم آتا ہے اور جب وہ کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین کیا ہے... تو ہم پیش کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا ہے! فعل کے مقابلے میں ترک آتا ہے اور حکم کے مقابلے میں منع آتا ہے۔ تو جب تم روایت حکم والی پیش کرو تو پھر ہم سے منع کا مطالبہ کرو اور جب تم صرف فعل والی پیش کرو گے تو ہم سے منع نہیں بلکہ صرف ترک کا مطالبہ کرو!

تو یہاں "اٰتٰی" بمعنی اَمَرَ ہے، دلیل "نَھٰکُمْ" ہے۔ اسی طرح میں نے آپ سے کہا تھا کہ قرآن کریم میں ہے ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡهِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ یہاں اثم سے مراد گناہ نہیں ہے بلکہ اثم سے مراد ضرر ہے، اس کی دلیل ﴿وَ اِثۡمُهُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا﴾ ہے کہ یہاں اثم کے مقابلے میں نفع آرہا ہے۔ تو جب یہاں نفع ہے تو مقابلے میں کیا ہوگا؟ ضرر! ہاں اگر نفع سے مراد ثواب ہوتا تو پھر اثم سے مراد گناہ ہوتا۔ اسی طرح "اٰتٰی" بمعنی اَمَرَ ہے اس لیے کہ اس کے مقابلے میں نہی آرہا ہے۔

مالِ فئی کے حق دار:

﴿لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اَمۡوَالِهِمۡ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانًا وَّ یَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ

الصّٰدِقُوْنَ ﴿٨﴾

یہ جو فرمایا تھا کہ تم مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافروں کو دو! جب مستحقین کی بات کی ہے تو اب بطور خاص فرمایا کہ مستحقین میں ان فقراء کو دو جنہوں نے اپنا گھر چھوڑا اللہ کے لیے، ان کی دنیاوی کوئی غرض نہیں ہے، اللہ کی مدد کرتے ہیں اور اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور بہت سچے لوگ ہیں، اس لیے ان کو دو۔

انصار صحابہ کا ایثار:

﴿وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا﴾

اور اسی طرح یہ مال ان انصار کو دو جو پہلے سے ہی دار الاسلام میں رہتے ہیں یعنی مدینہ منورہ میں رہائش پذیر ہیں۔ جو کوئی ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے تو یہ اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اور ان کو جو مال فئی میں سے ملتا ہے تو ان کو تکلیف نہیں ہوتی بلکہ انصار خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائیوں کو ملا ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ جب بنو نضیر کا مالِ فئی مسلمانوں کو حاصل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کے سردار حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ انصار کو میرے پاس بلاؤ۔ جب سب انصارِ مدینہ آ گئے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں انصارِ مدینہ کی مدح فرمائی کہ انہوں نے مہاجرین کے ساتھ حسنِ سلوک سے کام لیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو! یہ مہاجر مکہ سے مدینہ آئے ہیں اور ان کے پاس مکانات نہیں تھے، تم نے ان کو مکانات دیے ہیں، یہ تمہارے مکانوں میں رہتے ہیں۔ اب جو بنو نضیر کا مال

فئی ملا ہے تو اگر یہ ہم مہاجرین کو دے دیں تاکہ یہ لوگ تمہارے مکانوں کے بجائے اپنے مکانوں میں ٹھہریں تو تمہاری کیا رائے ہے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اختیار تھا لیکن پھر بھی مشورہ کیا۔ یہ بات سن کر انصار کے دو بڑے سردار حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم یہ چاہتے ہیں کہ مال فئی سارا مہاجرین کو دے دیں اور جو ہمارے مکانوں میں رہتے تھے ان کو ہمارے مکانوں میں بھی رہنے دیا جائے۔ کیا قربانی ہے صحابہ کی رضی اللہ عنہم اجمعین! فتوحات کے دور شروع ہوئے ہیں اور کیا تقریر کر رہے ہیں ان کے سردار کہ حضور! ہماری خواہش ہے کہ جو مالِ فئی ہے بنو نضیر والا وہ سارا ان کو دے دیں اور جو ہمارے مکان ہیں ہم ان سے واپس نہیں لیتے! دنیا میں کوئی ایسی مثالیں تلاش کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قائم کیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سارا مال مہاجرین کو دے دیا۔ باقی انصار میں سے سہل بن حنیف اور ابو دجانہ رضی اللہ عنہم یہ دو بہت غریب تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بھی کچھ عطا فرما دیا۔

خود پر دوسروں کو ترجیح:

﴿وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۹﴾﴾

اور خود فاقہ اور تنگی میں ہوں تب بھی اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اور وہ آدمی جس کو بخل سے اللہ بچالیں بس وہی بندہ کامیاب ہے۔

"بخل" یہ چھوٹا ہوتا ہے اور "شُح" یہ بخل کا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے۔ اصل میں انسان کی طبیعت میں بخل ہے۔ مال سمیٹنا اور مال سنبھالنا یہ اس کی عام عادت ہے۔ ہاں اگر اللہ کسی کو اس طبیعت کے خلاف کرنے کی توفیق عطا فرما دیں تو بس کیا ہی کہنے! وہ تو

بہت کامیاب ہے۔

مالِ فیئ میں آئندہ کس کا حصہ ہو گا؟

﴿وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾(۱۰)

اور یہ مالِ فیئ ان لوگوں کو بھی ملے گا جو اِن صحابہ کے بعد آئیں گے، جو یہ دعا کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ان ایمان والوں کے لیے کینہ نہ آئے۔ بے شک آپ شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔

"وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ" سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد مدینہ منورہ میں آئیں گے... یا مراد وہ ہیں جو صحابہ کے بعد ایمان قبول کریں گے... یا بعد سے مراد کہ دنیا میں ان صحابہ کے بعد آئیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ مالِ فیئ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، آپ کے رشتہ داروں کا ہے، یتیموں کا ہے، مساکین کا ہے، مسافروں کا ہے اور مہاجرین صحابہ کا ہے، انصار صحابہ کا ہے اور ان کے بعد جو اہلِ ایمان آنے والے ہیں ان کا بھی ہے۔ یہ ہمیشہ کے لیے مالِ فیئ کا ضابطہ ہے، یہ صرف اس دور کا نہیں تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ نے بعد والے مؤمنین کو پابند کیا ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے استغفار اور دعائیں کریں۔

اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے بُری

رائے اپنے ذہن میں رکھنا جائز نہیں ہے بلکہ تمام مؤمنین؛ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے دعا کرنے کے پابند ہیں۔

منافقین کی وعدہ خلافی:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَ لَا نُطِیْعُ فِیْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱﴾

کیا آپ نے ان منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے اہلِ کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

یہ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول منافق اور اس کے ساتھی تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنوں نے یہود سے معاہدے کر رکھے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم فکر نہ کرو! اگر تمہیں مدینہ سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، تمہارے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، جب یہود کو یہاں سے نکالنے کا موقع آئے گا تو یہ منافق نکلیں گے نہیں، جب ان سے قتال کی باری آئے گی تو دوڑ جائیں گے، یہ لوگ ان کا ساتھ پھر بھی نہیں دیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ بنو نضیر کو جب نکالا گیا تو عبد اللہ ابن ابی کا ایک فرد بھی ساتھ نہیں نکلا۔ جب ان کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا تو ایک فرد بھی ان کے ساتھ نہیں نکلا۔ بنو قینقاع کے لوگ تھے، غزوہ بدر کے بعد جب ان کا محاصرہ کیا گیا اور پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا، ان کے دل میں اللہ نے رعب ڈال دیا اور ان کی بس ہو گئی تو پھر عبد اللہ ابن ابی نے منتیں کی کہ حضور! ان

کی جان بخشی کر دیں اور ان کو یہاں سے نکال دیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، یہ مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں، ہم ان کو کچھ نہیں کہتے۔ تو ان کی جان بخشی ہوئی اور وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔

تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ان منافقین کو دیکھو کہ کیسے معاہدے کرتے ہیں لیکن جب وقت آئے گا تو یہ دوڑ جائیں گے۔

منافقین کی بزدلی کا عالَم:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾

یہ لوگ اتنے بزدل ہیں کہ سارے مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکتے، ہاں قلعہ بند ہو کے لڑیں تو لڑیں کھلا نہیں لڑ سکتے، یا شہر کی حفاظت کے لیے جو بڑی دیوار ہوتی ہے اس کے پیچھے ہو کر تو لڑ سکتے ہیں سامنے دوبدو لڑ ہی نہیں سکتے، ان میں جرأت نہیں ہے۔

اور آپ یقین فرمائیں کہ آج بھی کسی میں جرأت نہیں ہے، اگر جرأت ہے تو وہ ہماری بزدلی کی وجہ سے ہے، ہمارے اندر غیرت ہو تو کسی کی کیا جرأت ہے کہ ہمیں ہاتھ بھی لگائے!

﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٤﴾﴾

فرمایا کہ یہ اکٹھے ہو کر بھی تم سے نہیں لڑ سکتے کیوں کہ ان کی آپس کی جنگ ہے۔ یہ اللہ فرما رہے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ یہ اکٹھے بیٹھے ہیں، یہ اکٹھے نہیں ہیں ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں، ہر کسی کا اپنا عقیدہ ہے، یہ نافہم قسم کی قوم ہے، دین کو سمجھتی نہیں ہے تو تم ان کے اتحاد سے پریشان نہ ہو۔

﴿كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

اَلِيۡمٌ ﴿۱۵﴾

بنو نضیر کی مثال تو ان لوگوں کی ہے جو کچھ عرصہ پہلے اپنے کیے کا بدلہ چکھ چکے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس سے مراد بنو قینقاع کے یہودی ہیں۔ انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے امن کا معاہدہ کیا تھا لیکن خود ہی اس کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ ان کو بھی جلا وطن کیا گیا تھا۔

شیطان کا دھوکہ:

﴿كَمَثَلِ الشَّيۡطٰنِ اِذۡ قَالَ لِلۡاِنۡسَانِ اكۡفُرۡ‌ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّنۡكَ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶﴾﴾

ان کی مثال تو ایسے ہے جیسے شیطان ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کافر ہو جا! بندہ جب کافر ہو جاتا ہے تو پھر شیطان کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

یہاں منافقین کی مثال بیان کی ہے کہ عبد اللہ ابن ابی اور اس کی جماعت کے کرتوتوں کو سمجھنا ہو تو شیطان کو دیکھو۔ جنگ بدر میں شیطان انسانی شکل میں آیا تھا اور ابو جہل اور اس کے ساتھیوں سے کہا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن جب اس نے آسمان سے فرشتے اترتے دیکھے تو کہا کہ میں تم سے بری ہوں، تم جانو اور یہ جانیں، میں جا رہا ہوں۔ پھر وہاں سے دوڑ گیا۔ تو فرمایا کہ عبد اللہ ابن ابی بھی اسی طرح ہے۔ ابھی یہ ان سے کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن جونہی آسمانی مدد آئے گی تو یہ شیطان کی طرح انہیں چھوڑ کر دوڑ جائے گا۔ اللہ ہم سب کو شیطان سے محفوظ رکھیں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ (آمین)

فکرِ آخرت کیجیے!

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا اعمال آگے بھیجے ہیں؟! اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

تم نے کفر کا انجام دیکھا ہے اس لیے اب ذرا اپنا خیال کرو، طاعات کرو، آگے نیک اعمال بھیجو گے تو وہی تمہارے کام آئیں گے۔

پہلے "اتَّقُوا اللّٰهَ" سے مراد ہے کہ طاعات اختیار کرو اور دوسرے "اتَّقُوا اللّٰهَ" سے مراد ہے کہ گناہوں سے بچو! اب یہ تکرار نہیں ہو گا، ہر ایک کا معنی الگ الگ ہو جائے گا... یا پہلے "اتَّقُوا اللّٰهَ" سے مراد ہے کہ نیک اعمال کرو اور دوسرے "اتَّقُوا اللّٰهَ" سے مراد ہے کہ اخلاص کا بھی خیال رکھو! اب بھی کوئی تکرار نہیں ہے کیونکہ اب دونوں کا معنی الگ الگ ہے۔

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا یَسْتَوِیْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھول گئے۔ یہی لوگ فاسق ہیں، گنہگار ہیں اور فاسق لوگ اصحاب النار ہوتے ہیں اور متقی لوگ اصحاب الجنۃ ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: جنتی اور جہنمی کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی لوگ ہی کامیاب ہیں۔

﴿فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾... کیا مطلب کہ ان کو پتا ہی نہیں کہ ہمارے نفع کی کیا چیز ہے اور نقصان کی کیا چیز ہے؟ یہ لوگ گناہوں میں ایسے ڈوبے ہوئے ہیں کہ اپنی جان سے بھی بے پرواہو گئے۔

قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

اللہ تعالی نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے قرآن اتارا۔ فرمایا: اگر ہم اس قرآن مجید کو پہاڑ پر اتارتے تو پہاڑ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور اس کے ریزے ریزے ہو جاتے۔ ہم یہ مثالیں اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ تم کچھ غور و فکر کیا کرو۔

تو پہاڑ بھی اس کے نازل ہونے کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور ایک تمہارے دل ہیں کہ قرآن کا تم پر اثر ہی نہیں ہو رہا۔ اس قرآن کو سمجھو۔

میں کئی بار بیانات میں عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم نے بہت پیاری بات فرمائی ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اگر براہِ راست قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو پہاڑ پھٹ جاتے۔ سوال یہ ہے کہ آٹھ سال کا بچہ قرآن کو اپنے سینے میں رکھ لیتا ہے تو وہ کیوں نہیں پھٹتا؟ اگر قرآن اتنا بوجھ والا ہے کہ پہاڑ پھٹ جاتا ہے تو پھر چھوٹا بچہ کس طرح قرآن کو سینے میں اٹھا لیتا ہے؟ اور قرآن اگر چھوٹا بچہ بھی اٹھا سکتا ہے تو پھر پہاڑ کیوں نہیں اٹھا سکتا؟ حضرت فرماتے ہیں کہ وجہ یہ ہے کہ جس طرح سورج منیر ہوتا ہے اور چاند مستنیر ہوتا ہے، چاند؛ سورج سے روشنی لیتا ہے، جسم براہ

راست سورج کی تپش کو برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ سورج جلالی ہے اور اس کی تپش بھی جلالی ہے، براہ راست سورج کی روشنی آنکھیں نہیں برداشت کر سکتیں لیکن جب بدر چودھویں کا چاند نکلتا ہے تو سورج کی تپش اس چاند سے گزرتی ہے اور پھر برودت میں بدلتی ہے تو جسم کو مزا آتا ہے۔ یہ سورج جلالی ہے اور اس کی تپش بھی جلالی ہے لیکن جب چاند سے گزرتی ہے تو چاند جمالی ہے، یہ حرارت؛ برودت میں بدل جاتی ہے چاند کے جمال کی وجہ سے اور یہ ضیاء نور میں بدل جاتی ہے چاند کے جمال کی وجہ سے تو پھر جسم کو بھی لطف آتا ہے اور آنکھ کو بھی مزا آتا ہے چاند کی وجہ سے۔ اسی طرح اللہ پاک جلالی ہے اور اس کا کلام بھی جلالی ہے، جلالی کلام اگر براہِ راست پہاڑ پر اترتا تو پہاڑ برداشت نہ کرتا، اللہ اپنے جلالی کلام کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالی سینہ پر اتارتے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالی ہونٹوں سے باہر نکالتے ہیں تو جس قرآن کو پہاڑ نہیں اٹھا سکتا تھا یہ حضور کے جمال کی برکت ہے کہ آٹھ سال کا بچہ بھی اٹھا لیتا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

یہ ہے قاری طیب صاحب کا علم! میں کہتا ہوں کہ ایسے ایسے لوگ موجود ہیں تمہیں کیا پڑی ہے کسی اور کو دیکھنے کی؟ اپنے اکابر کو پڑھو اور اپنے اکابر کی تعریفیں کرو! اپنے بیانات میں اپنے اکابر کا تذکرہ کرو! اکابر کا نام لو اور اگلی نسلوں میں منتقل کرو! میری گزارش سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اسمائے حسنیٰ:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾

وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے اور کھلی ہوئی باتوں کو بھی، وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

آگے اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ وہ مَلِک ہے یعنی بادشاہ ہے، قدوس ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ قدوس؛ اسے کہتے ہیں جو زمانہ ماضی میں عیوب سے پاک ہو۔ سلام؛ جو زمانہ مستقبل میں پاک ہو۔ مؤمن؛ جو آدمی کو امن دینے والا ہو، آدمی پر تکلیف نہ آنے دے۔ مھیمن؛ نگرانی کرنے والا کہ اگر تکلیف آجائے تو اس کو رفع کر دے۔ عزیز یعنی غالب ہے۔ جبار اگر جبروت سے ہو تو معنی طاقت ور ہے اور اگر جبر سے ہو تو معنی اصلاح کرنے والا ہے۔ جس طرح جبیرہ وہ لکڑی ہوتی ہے جو بازو ٹوٹنے کے بعد باندھتے ہیں کہ بازو کو ٹھیک کر دے، تو جبار کا معنی ہے اصلاح کرنے والا۔ متکبر... کِبر اللہ کی خاص صفت ہے اور یہ صفت اللہ کو زیب بھی دیتی ہے۔

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾﴾

اللہ تعالی خالق ہیں، باری ہیں یعنی حکمتوں کے ساتھ پیدا کرتے ہیں، مصور ہیں کہ جس کو پیدا کرتے ہیں اسے شکل وصورت دیتے ہیں، اللہ کے نام بھی بہت اچھے ہیں۔ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ سب اللہ تعالی کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص صبح کے وقت تین بار "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھ لے اور اس کے بعد سورۃ الحشر کی آخری تین آیتیں پڑھ لے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لیے شام تک مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور اگر یہ شخص

شام سے پہلے فوت ہو جائے تو اللہ اسے شہیدوں میں شامل فرماتے ہیں اور اگر یہ شام کو پڑھ لیں تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اگر یہ فوت ہو گیا تو اللہ اس کو شہداء میں شامل فرمائیں گے۔[12]

آپ بھی اس کا معمول بنائیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ کم از کم انیس سال ہو گئے ہیں یہ اسی طرح میرے معمول میں شامل ہے۔ بہت ساری ایسی دعائیں ہیں کہ الحمد اللہ میں اپنے معمولات میں رکھتا ہوں۔ بعض ایسی بھی ہیں جو میرے درجہ اولیٰ والے سال سے چل رہی ہیں۔

دعائے مستجاب کا مجرّب طریقہ:

ایک تو اس کے پڑھنے کا اہتمام کریں اور دوسرا یہ میرا اپنا مجرب نسخہ ہے، اور میں یہ سنی سنائی بات نہیں کر رہا اپنا تجربہ بتا رہا ہوں کہ کسی عنوان پر کبھی دعا مانگنی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے درود شریف پڑھیں۔ پھر سورۃ الحشر کے آخری رکوع ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ سے تلاوت شروع کریں اور جب یہاں پہنچیں ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ تو یہاں تلاوت روک دیں، پھر یہاں دعا کریں کہ اے اللہ! میری یہ ضرورت، میری مصیبت، میری تکلیف، میرے لیے پہاڑ ہے، آپ کی قدرت و طاقت کے سامنے اس کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ! میری اس حاجت کو پورا فرما دیں! اس کے بعد پھر آگے تلاوت شروع کریں۔ پھر جب آپ پہنچیں ﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ پر تو اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کو پڑھ لیں۔

12۔ سنن الترمذی، رقم:2922

اسمائے حسنیٰ پڑھتے ہوئے دل میں اپنی مراد کا تصور کریں۔ جب یہ اسماء مکمل ہو جائیں تو پھر تلاوت شروع کر دیں اور رکوع کے اختتام پر گیارہ بار درود شریف پڑھ لیں اور آخر میں جو آپ کی ضرورت ہے وہ مانگیں۔ ان شاء اللہ دعائیں قبول ہوں گی۔

اللہ رب العزت ہماری جائز حاجات کو پورا فرمائے، ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الممتحنۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡھِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ﴾

شانِ نزول:

یہ غزوہ بدر کے بعد اور فتحِ مکہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مکہ کی ایک عورت تھی جو مُغَنِّیہ تھی گانا گاتی اور پیسے کماتی۔ اس کا نام سارہ تھا۔ یہ مدینہ منورہ آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو کر آئی ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ تو پھر یہاں کیوں آئی ہو؟ اس نے کہا کہ آپ لوگ مکہ کے اعلیٰ خاندان تھے۔ مکہ کے سردار تو بدر میں مارے گئے اور آپ لوگ یہاں آگئے، اب میرا گزارا نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ مکہ کے نوجوانوں کا کیا بنا؟ مطلب کہ وہ تو تجھ پہ پیسا لٹاتے تھے، اب ان کا کیا ہوا؟ کہنے لگی کہ جنگِ بدر کے بعد انہوں نے مجھے بلانا چھوڑ دیا ہے اس لیے میں سخت تنگی میں ہوں، میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ میری کچھ مدد کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبد المطلب سے فرمایا کہ اس کو کچھ مال دے کر اس کی کچھ مدد کر کے اس کو مکہ بھجوا دو۔ انہوں نے اس کی کچھ مدد کی۔ اب وہ واپس مکہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔

آپ کے علم میں ہے کہ حدیبیہ میں مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ مشرکین مکہ نے اس معاہدہ کی پاسداری نہیں کی اور معاہدہ کو توڑ ڈالا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین پر حملہ کرنے کے لیے خفیہ طور پر تیاری شروع کر دی تھی۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی خطا:

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی تھے۔ ان کو پتا چلا کہ یہ عورت مکہ سے آئی ہے اور اب واپس جارہی ہے۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اصلاً یمن کے تھے اور مکہ مکرمہ میں آکر آباد ہوئے تھے۔ مکہ مکرمہ میں ان کا قبیلہ نہیں تھا۔ یہ خود تو ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے تھے لیکن ان کے اہل و عیال مکہ مکرمہ ہی میں تھے۔ تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جتنے لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کا خاندان وہاں پر ہے، اگر بیوی بچے بھی مکہ میں ہیں تو ساتھ دوسرا خاندان بھی ہے، رشتہ دار وہاں پر ہیں اس لیے ان کو تو نقصان کا خدشہ نہیں ہے۔

اب مکہ میں جب جنگ ہو گی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بچوں کو نقصان پہنچ جائے۔ تو میں مکہ والوں پر احسان کروں اور انہیں پیغام پہنچادوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اوپر حملہ کرنے والے ہیں تم تیاری کر لو! اگر میں ان کے ساتھ یہ ہمدردی کروں تو وہ بھی اس کے بدلے میں میرے بچوں کا خیال رکھیں گے اور میرے بچے بچ جائیں گے اور یہ تو مجھے پورا یقین ہے کہ مکہ فتح ہونا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتح بننا ہے، میں مکہ والوں کو یہ بات بتاؤں تب بھی مکہ فتح ہونا ہے اور نہ بتاؤں تب بھی ہونا ہے! لیکن اس تدبیر سے میرے بچے بچ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مکہ والوں کو ایک خط لکھا جس میں اس حملے کی خبر دی۔ یہ خط انہوں نے سارہ کو دیا اور کچھ پیسے بھی دیے۔

یہ سارہ ابھی روضہ خاخ ایک جگہ تھی وہاں پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس معاملہ کا سارا حال بتا دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت ابو مرثد اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا کہ فلاں مقام پر یہ عورت پہنچی ہے اور اس کے پاس ایک خط ہے، وہ خط لے کر آؤ! انہوں نے گھوڑے دوڑائے اور وہاں پہنچے۔ وہ عورت پکڑی گئی، ان حضرات نے کہا کہ تمہارے پاس ایک خط ہے وہ ہمیں دے دو۔ اس نے کہا کہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ خط دو ورنہ ہم تمہارے کپڑے اتروا دیں گے، خط ہم نے لینا ہے تم سے! اس سے وہ ڈر گئی۔ خط اس کی ازار میں تھا۔ اس نے وہاں سے نکالا اور ان حضرات کو دے دیا۔ خط لے کر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اسے چھوڑ دو! یہ بدری ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کا پتا چلا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! اس کو ذرا میرے حوالے کریں... میں اس کی گردن اڑا دوں، اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ ہماری بات کفر تک پہنچا دی ہے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے یہ خط دیا ہے؟ کہا کہ جی میں نے دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے ایسے کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! مکہ میں میرے بچے ہیں، میں یمنی ہوں، مکہ کا رہنے والا نہیں ہوں تو میں نے چاہا کہ مکہ والوں پر احسان کر دوں تاکہ میرے بچے بچ جائیں، باقی سب کا خاندان ادھر ہے لیکن میرا کوئی خاندان مکہ میں نہیں ہے، باقی میرے ایمان میں کوئی تزلزل نہیں آیا، مجھے آپ کی فتح پر پورا یقین ہے، یہ میں نے اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاطب سچ کہتا ہے، اس کے بارے میں

خیر ہی کہو، خیر کے علاوہ کوئی بات نہ کہو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے مخاطب ہو کر فرمایا: عمر! یہ بدری نہیں ہے؟ کہا کہ جی بدری ہے۔ فرمایا کہ ان کے گناہوں کی معافی نہیں ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے کہ حضور! آپ نے سچ فرمایا۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جری تھے دین کے معاملہ میں لیکن جب بات سمجھ آتی تھی تو وہیں ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ کہا حضور! آپ نے سچ فرمایا۔ اس پر سورۃ الممتحنہ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

دشمنِ خدا سے دوستی جائز نہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِیَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ﴾

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجنے لگو! حالانکہ ان لوگوں نے تمہارے دین حق کو جھٹلایا ہے۔ ان لوگوں نے اللہ کے نبی کو اور تمہیں مکہ سے صرف اس وجہ سے نکالا تھا کہ تم اللہ رب العزت پر ایمان لاتے ہو!

یہاں دیکھیں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ "لَا تَتَّخِذُوا الْكُفَّارَ اَوْلِیَاءَ" کہ کفار کو اپنا دوست نہ بناؤ بلکہ فرمایا: "لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ" کہ میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ! یہ اسلوب اختیار کیا یہ بتانے کے لیے کہ ان سے دوستی نہ رکھنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ میرے بھی دشمن ہیں اور تمہارے بھی دشمن ہیں۔ کافر جب تک اپنے کفر پہ قائم ہے وہ کسی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا!

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ﴾

یہاں یہ بتایا کہ اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے نکلے ہو اور میری رضا مندی کے لیے نکلے ہو تو پھر ان کفار سے دوستی مت کرو! کفار سے دوستی کا مطلب ہے کہ ان کی رضا مندی کا خیال کیا جائے۔ جب تم اللہ کی رضا مندی کے طالب ہو تو پھر کفار کی رضامندی اور ان کی دوستی کی بالکل پروانہ کرو!

﴿تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ ٭ وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۱﴾﴾

پھر تم ان کے پاس محبت کے خفیہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو میں سب جانتا ہوں۔ جو بھی ایسا کام کرے گا تو وہ راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔

﴿اِنۡ یَّثۡقَفُوۡكُمۡ یَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً وَّ یَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡكُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ وَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَ وَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۲﴾﴾

ان کا بس چلا تو یہ تمہارے خلاف اپنی دشمنی ظاہر کریں گے، تمہارے ساتھ برائی کرنے کے لیے اپنے ہاتھ بھی چلائیں گے اور اپنی زبانیں بھی دراز کریں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ!

اس سے معلوم ہوا کہ کافر جب تک کافر ہے اور مؤمن جب تک مؤمن ہے تو کافر اس مؤمن سے پیار نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ ایمان کو نہ چھوڑ دے۔ اور اب تو اگر کوئی مسلمان ایمان چھوڑ دے تو کافر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ایمان کو چھوڑا ہے مفاد کے لیے تو پھر بھی پیار نہیں کرے گا۔ جب اس کو یقین ہو جائے کہ اس نے ایمان چھوڑا ہے کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے تو پھر شاید وہ پیار کرلے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت

فرمائے۔ آمین

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③﴾

قیامت کے دن نہ تمہاری رشتے داریاں تمہارے کام آئیں گی اور نہ اولاد تمہارے کام آئے گی۔ اللہ ہی وہاں تمہارے بارے میں فیصلہ کریں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اسوہ کو دیکھو! انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بھی بری ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو ان سے بھی بری ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے بھی برأت کا اعلان کیا، بادشاہ سے بھی برأت کا اعلان کیا کہ میں تم سے بیزار ہوں، میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تمہارے نظریات کو نہیں مانتے اور تمہارے اور ہمارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے جب تک تم اللہ وحدہ پر ایمان نہیں لاؤ گے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف یہ نہیں فرمایا "حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ" کہ

ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہے اور یہ ختم ہو گا جب تم اللہ پر ایمان لاؤ! نہیں بلکہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ“ کہ تم ایک اللہ کو مانو، یہ جو تم نے جھوٹے خدا بنا رکھے ہیں ان سب کی نفی کرو اور ایک خدا کو مانو تو پھر ہم تمہارے اور تم ہمارے ہو، جب تک یہ نہیں ہوتا تو ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو اس معاملے میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء کرنی چاہیے اور کفر سے برأت کا اعلان کرنا چاہیے۔ کافر باپ ہو یا بیٹا؛ علیحدگی اختیار کرو۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھو ابراہیم علیہ السلام نے ایک بات ایسی فرمائی تھی اس میں تم نے ان کی اتباع نہیں کرنی۔ وہ بات کیا تھی، فرمایا:

ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے استغفار کرنے کا مطلب:

﴿اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾

یہ جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا کہ میں آپ کے لیے ضرور استغفار کروں گا، باقی میں آپ کو خدا کے عذاب سے بچا تو نہیں سکتا!

تو یہاں منع کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اتباع تو کرو لیکن اس معاملے میں اتباع نہ کرو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں آئے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا: ﴿لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ کہ میں آپ کے لیے استغفار کروں گا! لہذا میں بھی اپنے کافر رشتہ داروں کے لیے استغفار کروں! تو فرمایا کہ اس معاملے میں ان کی اتباع نہ کرو کیونکہ ہر بندہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس فرمان ﴿لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ کا کیا مطلب تھا؟!

دراصل آپ علیہ السلام کے اس فرمان کا معنی یہ تھا کہ میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں ایمان دے پھر اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے! یہ مطلب

نہیں تھا کہ کافر ہوتے ہوئے تمہارے گناہ معاف فرمادے۔

یا اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا خیال یہ تھا کہ میرے ابا کے دل میں ایمان اتر آیا ہے تو اللہ کرے اپنی زبان سے اس کا اظہار کریں لیکن ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ [13] جب آپ کو پورا یقین ہو گیا کہ ان کے دل میں ایمان نہیں اترا تو آپ نے والد سے برأت کا اعلان کر دیا۔

تو یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کافر تھے اور آپ نے کافر والد کے لیے استغفار فرمایا تھا تو بظاہر اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کافر کے لیے استغفار کرنا جائز ہے۔ تو فرمایا کہ باقی سارے معاملات میں ان کی اقتداء کرو لیکن اس معاملے میں نہیں، کافر کے لیے استغفار نہ کرنا کہ کافر ہوتے ہوئے اللہ ان کو معاف فرما دے... یہ کبھی نہ کرنا۔

اہلِ ایمان کی دعائیں:

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۴﴾

اے ہمارے رب! ہم آپ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف ہم نے آنا ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵﴾

اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کی آزمائش سے محفوظ رکھ اور ہماری مغفرت فرما! بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔

13۔ التوبہ 114:9

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷﴾

یہ معاملہ بہت مشکل تھا کہ باپ مسلمان تو بیٹا کافر، بیٹا مسلمان تو باپ کافر، شوہر مسلمان تو بیوی کافرہ، بیوی مسلمان تو شوہر کافر... اور حکم یہ تھا کہ ان سے برأت کا اعلان کر دو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حکمِ شرعی پر عمل کیا لیکن مشکل تو بہت تھا۔ مشکل نہ ہوتا تو پھر ان کو شاباش کیوں ملتی! مشکل بہت تھا اس لیے اللہ نے اس پر ان کو تسلی دی ہے۔

فرمایا: وہ وقت دور نہیں کہ جب اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے دوستی پیدا فرما دے گا۔ اللہ اس بات پر قادر ہے اور مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی یہ کچھ وقت کی بات ہے، بہت جلد یہ عداوت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ مطلب کہ تم فاتح بنو گے اور وہ مسلمان ہو جائیں گے تو دشمنی ختم ہو جائے گی، پھر دوستی دوبارہ لوٹ آئے گی۔ ساتھ ہی اللہ پاک نے تسلی بھی عطا فرمائی کہ یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے، ان شاء اللہ جلدی کام ہو جائے گا۔

رشتہ دار کفار ہوں تو تعلقات کا حکم:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸﴾

جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے بھی نہیں نکالا تو ان سے اچھے تعلقات رکھنے اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتے!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی تھی جن کا نام تھا قُتَیْلہ اور آپ نے زمانہ کفر میں ان کو طلاق دی تھی۔ ان سے آپ کی بیٹی پیدا ہوئی تھیں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا۔ آپ کی دوسری بیوی حضرت ام رومان سے بیٹی پیدا ہوئیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ اب ذرا اندازہ کرنا! حضرت اسماء مسلمان ہیں اور ہجرت کر کے مدینہ آ گئی ہیں۔ آپ کی والدہ قُتَیْلہ کافرہ ہے، وہ مکہ سے مدینہ آئی ہے اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے اور ساتھ ہدیہ بھی لے کر آئی ہے۔ کیا کیفیت ہو گی ایمان کی! اللہ کی قسم بندہ دنگ رہ جاتا ہے۔ میں تو جب خلوت میں بیٹھتا ہوں تو رو پڑتا ہوں یہ واقعات پڑھ کر، مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوتا! مکہ سے ماں چلی ہے اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے اور ہدیے ساتھ لے کر آئی ہے۔ حضرت اسماء نے فرمایا: امی اندر نہیں آنا! گھر نہیں آنے دیا اور ہدیے قبول نہیں کیے۔ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ حضور! میری ماں آئی ہے ملنے کے لیے، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ صلہ رحمی کا خیال کرو! ان کا خیال رکھو، ان سے تعلق میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت اتری ہے۔

حضرت اسماء کا ایمان دیکھو! جب اس سطح پر بندہ کھڑا ہونا پھر اللہ کی طرف سے مدد اترتی ہے، پھر فتوحات اترتی ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹﴾

اور جو لوگ ان سے دوستی رکھیں گے ایسے لوگ ظالم ہیں۔

میں خدا کی قسم کھا کر بڑے درد سے تمہیں سمجھاتا ہوں کہ کافر سے کبھی محبت نہ کرنا، فاسق سے کبھی محبت نہ کرنا، وہ نافرمان ہے، ظالم ہے، ان سے پیار نہ کرو! پیار صلحاء سے کرو، پیار مؤمنین سے کرو! ہاں مدارات و معاملات مجبوری ہیں، رشتہ دار ہیں، خاندان کے لوگ ہیں لیکن موالات نہ کرنا، دل سے کبھی ان سے پیار نہ کرنا، دل

میں کبھی کسی کافر کو جگہ نہ دینا! دل خالص اللہ کے لیے رکھو۔

صلح حدیبیہ کی بعض شرائط:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ﴾

فرمایا: اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان لے لیا کرو۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ ایمان والی ہیں تو انہیں کافروں کو واپس مت کرو! یہ مسلمان عورتیں ان کافروں کے لیے حلال نہیں اور وہ کافران کے لیے حلال نہیں ہیں۔

حدیبیہ میں معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان العیاذ باللہ مرتد ہو کر چلا گیا تو واپس نہیں ہو گا اور اگر کوئی کافر مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے پاس آ گیا تو اس کو واپس کیا جائے گا۔ ابھی یہ معاہدہ لکھا ہی تھا، کہتے ہیں کہ ابھی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ابو جندل آ گئے۔ عرض کرنے لگے: حضور! میرا کچھ کریں۔ ابو جندل کا والد سہیل بن عمرو چونکہ معاہدہ لکھنے والا تھا تو اس نے کہا کہ ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے کہ اگر ہمارا بندہ ہمارے دین کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ جائے تو آپ واپس کرنے کے پابند ہیں، اس لیے ابو جندل کو واپس کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو جندل! واپس چلے جاؤ۔ کہا کہ حضور! یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے، بہت مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔ فرمایا کہ ہم نے معاہدہ کیا ہے۔ ابو جندل! واپس چلے جاؤ، اللہ کوئی اچھی سبیل پیدا فرما دیں گے۔

اسی موقع پر حضرت سعیدہ بنت حارث رضی اللہ عنہا صحابیہ تھیں وہ بھی آ

گئیں کہ حضور! میں بھی آگئی ہوں۔ یہ اس وقت صیفی بن انصب کے نکاح میں تھیں جو کافر تھا۔ وہ بھی ساتھ آگیا اور اس نے حضور سے عرض کیا کہ میری بیوی مجھے واپس کر دیں کیونکہ آپ کے اور ہمارے درمیان معاہدہ ہوا ہے اور آپ نے شرط قبول کر لی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارا معاہدہ عورتوں کے لیے نہیں ہے، یہ صرف مردوں کے لیے ہے، خواتین کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

اصل میں یہ تھا کہ چونکہ معاہدے کے عموم میں بظاہر عورتیں شامل تھیں لیکن وضاحت تو نہیں تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جو شِق ہے یہ مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے کفار کے دل میں بات کو ڈال دیا اور اس کی مخالفت انہوں نے بھی نہیں کی، وہ بھی خاموش ہو گئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعیدہ صحابیہ ہے، اس کو ہم واپس نہیں کریں گے۔

یوں سمجھیں کہ وہ جو تعمیم تھی نا... وہ اس تخصیص سے منسوخ ہو گئی کہ یہ خاص مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم کی یہی آیات نازل ہوئیں۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ام کلثوم بنت عتبہ بن ابی معیط یہ صحابیہ تھیں، عمرو بن عاص کے نکاح میں تھیں، ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی مدینہ منورہ آگئیں اور ان کے دو بھائی تھے، ایک کا نام ولید تھا اور ایک کا نام عمارہ تھا وہ بھی مسلمان ہو کر مدینہ آ گئے۔ عمرو بن عاص ان کو لینے کے لیے آگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ام کلثوم تو واپس نہیں جائے گی، ہاں اس کے بھائیوں کو لے جاؤ۔ اس نے کہا: کیوں؟ فرمایا کہ اس میں ہمارا کوئی معاہدہ نہیں ہے، عورت ہم واپس نہیں کر سکتے، باقی مردوں کو لے جاؤ، ہم اس سے منع نہیں کرتے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان عورتوں سے قسم لی جاتی تھی کہ تم اپنے مرد سے ناراض ہو کر تو نہیں آئیں؟ کہتیں کہ جی نہیں! کسی مرد کی محبت میں تو نہیں آئیں؟ وہ کہتیں کہ جی نہیں! تمہارے آنے کا کوئی اور مقصد تو نہیں ہے؟ کہتیں کہ جی نہیں! پوچھا جاتا کہ صرف اسلام کی وجہ سے آئی ہو؟ جی ہاں۔ بس ٹھیک ہے، یہ مسلمان ہے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لو۔ اس بیعت کے کلمات آگے آرہے ہیں۔

مسلمان عورتوں کے کافر خاوندوں کو مہر واپس کرو:

﴿وَ اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَ سْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَ لْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۰)﴾

ان عورتوں کے خاوندوں نے ان پر جو کچھ خرچ کیا یعنی ان کو مہر دیا تو وہ ان کو ادا کر دو! جب تم ان کے مہر ادا کر دو تو ان سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے پاس نہ رکھو۔ آگے ان عورتوں کا معاملہ یوں طے کرو کہ جو مہر تم نے ان بیویوں کو دیا ہو جو کافر ہیں تو تم اس کا مطالبہ ان کے نئے شوہروں سے کر سکتے ہو اور جو عورتیں مسلمان ہو کے آئی ہیں ان کے شوہر ان کے مہر کا مطالبہ تم سے کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

﴿وَ اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا﴾ کافر نے جو مہر اِن کو دیا تھا تو وہ مہر تم ان کو واپس کر دو۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ عورت حق مہر واپس کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے استعمال کر لیا ہو اور اب دینے کی طاقت نہ رکھتی ہو۔ تو فرمایا کہ مہر تم مسلمان اس کو

واپس کرو اور اس کو رکھ لو۔

﴿وَلَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ﴾... اور کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے پاس نہ رکھو۔ "عصم" یہ عصمت کی جمع ہے یعنی وہ جو کافرہ عورتیں ہیں اب ان کی عصمت کو تم چھوڑ دو، انہیں آزاد کر دو، ان کو تم اپنے نکاح میں نہ رکھو۔ یعنی مسلمان ہجرت کر کے آ گیا اور بیوی اس کی کافرہ ہے تو اس کو چھوڑ دے۔

یہ تقریباً چھ خواتین تھیں۔ ان میں سے پانچ مکہ مکرمہ میں تھیں اور کافرہ تھیں۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو وہ ہجرت کر کے مدینہ نہیں آئیں بلکہ مکہ ہی میں رہیں اور اپنے کفر پر قائم رہیں۔ صرف ایک عورت ام الحکم بنت ابی سفیان یہ حضرت عیاض بن غنم قریشی کے نکاح میں تھی۔ یہ مرتد ہو کر مکہ واپس چلی گئی تھی۔ باقی پانچ ایسی تھیں جو نکاح میں تھیں اور شروع سے ہی کافرہ تھیں، تو انہوں نے ہجرت نہیں کی اور کفر پر باقی رہیں۔ ان کے بارے میں حکم یہ تھا کہ اگر کسی کی بیوی کافرہ ہے اور وہ ہجرت کر کے نہیں آتی تو تمہارا نکاح ختم ہو گیا، اب وہ کافر تمہارا حق مہر تمہیں واپس لوٹائیں اور اگر ان کی عورت تمہارے پاس آئی ہے اور تم اس کے کافر شوہر کو اس کا حق مہر لوٹاؤ۔ کفار تو ظاہر ہے کہ شریعت کو نہیں مانتے تھے انہوں نے تو نہیں دیے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیا۔

جن چھ عورتوں کا ذکر ہوا کہ پانچ تو شروع ہی سے کافر رہیں اور ایک اسلام لانے کے بعد مرتد ہو کر مکہ چلی گئی تھی۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ جو مرتد ہوئی تھی ام الحکم بنت ابی سفیان بعد میں وہ اسلام کی طرف لوٹ آئی تھی اور جو باقی پانچ تھیں انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

﴿وَاِنۡ فَاتَكُمۡ شَىۡءٌ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ اِلَى الۡكُفَّارِ فَعَاقَبۡتُمۡ فَاٰتُوا الَّذِيۡنَ ذَهَبَتۡ اَزۡوَاجُهُمۡ مِّثۡلَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اَنۡتُمۡ بِهٖ

مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾

اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے اس طرح کہ اس کا حق مہر بھی تمہیں نہ مل سکے تو پھر جب تمہاری باری آئے یعنی کافروں کی عورتوں میں سے کوئی عورت مسلمان ہو کر تمہارے پاس آئے اور تم اس سے نکاح کرو تو اب ضابطے کے تحت تمہیں اس عورت کے خاوند کو اس کا حق مہر ادا کرنا چاہیے تھا لیکن چونکہ تمہیں بھی تمہاری بیوی والا حق مہر نہیں ملا اس لیے تم بھی حق مہر نہ دو بلکہ یہ حق مہر اس شخص کو ادا کر دو جس کی بیوی ان کافروں کے پاس چلی گئی تھی۔ اور اللہ سے ڈرا اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو!

ایمان والی عورتوں کی بیعت:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الۡمُؤۡمِنٰتُ یُبَایِعۡنَكَ عَلٰۤی اَنۡ لَّا یُشۡرِكۡنَ بِاللّٰهِ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَسۡرِقۡنَ وَ لَا یَزۡنِیۡنَ وَ لَا یَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ وَ لَا یَاۡتِیۡنَ بِبُهۡتَانٍ یَّفۡتَرِیۡنَهٗ بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِنَّ وَ اَرۡجُلِهِنَّ وَ لَا یَعۡصِیۡنَكَ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ فَبَایِعۡهُنَّ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲﴾﴾

فرمایا کہ اے نبی! جب آپ کے پاس مومن عورتیں آئیں اور بیعت کرنا چاہیں تو انہیں بیعت کرو۔ آگے پھر وہ بیعت کے الفاظ ہیں کہ تم بیعت ان باتوں پر کرو:

[1]: شرک نہیں کریں گی۔

[2]: چوری نہیں کریں گی۔

[3]: زنا نہیں کریں گی۔

[4]: ناحق اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔

[5]: بہتان نہیں باندھیں گی، ﴿بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِنَّ وَ اَرۡجُلِهِنَّ﴾ کے

الفاظ ذکر کیے ہیں یہ بتانے کے لیے کہ قیامت کے دن آدمی کی زبان نہیں بولے بلکہ اس کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ تو یہاں ہاتھ پاؤں کا ذکر اس لیے کیا کہ انسان کو چاہیے کہ کسی پر بہتان باندھنے سے پہلے سوچ لے کہ میں یہ کام دو ہاتھوں اور دو پاؤں کے درمیان کر رہا ہوں اور یہی چار گواہ قیامت میں میرے خلاف گواہی دیں گے۔

[6]: اور ہر نیک بات آپ کی مانیں گی۔

آپ ان کی بیعت بھی کریں اور ان کے لیے اللہ سے دعا بھی کریں۔ اللہ معاف فرمانے والے ہیں۔

عالم سے بیعت کی دلیل (ایک دلچسپ واقعہ):

میں یہاں پر ایک واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ہم نے جب کام کا آغاز کیا تو یہ ادارہ نہیں تھا اور سب سے پہلے ہم نے بچیوں میں کام شروع کیا ہے۔ تو اس وقت پانچ بچیاں غالباً پانچ پانچ سال کی میں نے داخل کیں۔ جو صبح آتیں یہاں گھر پہ ا... ب... ت... ث... پڑھ کر چلی جاتیں، پھر شام کو آتیں، آدھا گھنٹا پھر میں ان کو سبق پڑھاتا اور چھوٹے بھائی قاری شعیب احمد صاحب کو میں نے کہا کہ آپ بچوں کو پڑھاؤ۔ اب وہ بچیاں بھی چلی گئیں۔ ان میں سے ایک بچی نے ہمارے ہاں مرکز اصلاح النساء میں دو سال کا کورس بھی کر لیا ہے۔ مجھے اب نہیں یاد کہ میں نے مہینا پڑھایا یا ڈیڑھ مہینا... بہر حال اس سے زیادہ نہیں پڑھایا۔

اس سے پہلے میں نے چھ ماہ کا کورس کرایا۔ اس میں ایک غیر مقلد لڑکی ہماری گاؤں کی تھی۔ وہ میرے سبق میں آگئی۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ استاد جی! کیا کوئی عورت کسی عالم مرد سے بیعت کر سکتی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، کر سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ دلیل؟ میں نے یہ آیت پڑھی ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ

﴿يُبَايِعۡنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشۡرِكۡنَ بِٱللَّهِ شَيۡـٔٗا﴾ اس نے کہا کہ میرا سوال یہ نہیں کہ کوئی عورت نبی کی بیعت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرا سوال یہ ہے کہ کسی عالم کی بیعت کر سکتی ہے یا نہیں؟ عورت نبی کی بیعت کرے اس کو تو میں مانتی ہوں، اس پر تو مجھے دلیل کی ضرورت نہیں، عورت کسی عالم کی بیعت کرے میں تو اس پر دلیل مانگتی ہوں، اس پر کوئی دلیل پیش کریں۔ آپ اس عورت کی تیاری دیکھیں!

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب نماز کھڑی ہوتی تو جماعت کون کراتا تھا؟ کہا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ جمعہ کے دن خطبہ کون دیتا تھا؟ کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم مسئلہ پوچھتے تو فتویٰ کون دیتا؟ کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ جب جہاد ہوتا تو قیادت کون کرتا؟ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ جب کوئی خواب دیکھتا تو تعبیر کون دیتا؟ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جب مسجد میں نکاح ہوتا تو کون پڑھاتا؟.... کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ جب خواتین ہوتیں تو ان کی بیعت کون لیتا؟.... کہا کہ رسول اللہ صلی للہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ آپ بتائیں کہ

- اب نماز کون پڑھائے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- اب خطبہ جمعہ کون دے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- اب خطبہ نکاح کون دے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- اب فتویٰ کون دے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- اب خواب کی تعبیر کون بتائے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب

میں نے کہا کہ جب عورتوں نے بیعت لینی ہو تو اب بیعت کون لے گا؟ تو اس کے لیے نبی کو لائیں؟ اب چپ ہو گئی۔ میں نے کہا کہ بات اچھی طرح سمجھو! عالم نبی کا وارث ہے اور وارث اپنے مورث کی تمام چیزوں کا وارث ہوتا ہے، صرف ایک کا نہیں ہوتا، اگر باقی سارے کام مولانا صاحب نے کرنے ہیں اور نبی نے نہیں کرنے تو تمہیں بیعت بھی مولانا صاحب نے کرنی ہے، کوئی نبی تمہارے لیے نہیں لا سکتے۔ اس نے کہا کہ مجھے بات سمجھ میں آ گئی ہے۔

اور یہ بات ذہن نشین فرما لیں کہ اس کا تعلق خاص مہاجرات کے ساتھ نہیں ہے، اس کا تعلق بعد میں صحابیات کے ساتھ بھی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیات مہاجرات کے علاوہ ان سے بھی بیعت لی ہے اور امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مرد بیعت کرتے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں ہاتھ دیتے، خواتین بیعت کرتیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نامحرم عورت کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

بیعت کی اقسام:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تین قسم کی بیعت لیتے تھے:

[1]: بیعت علی الایمان... کہ پہلے کافر تھے، اب کلمہ پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بیعت کی کہ ہم مسلمان ہوتے ہیں۔

[2]: بیعت علی الجہاد... میدانِ جہاد میں بیعت کرنی ہے۔ اس کو بیعت علی الموت بھی کہتے ہیں۔ ہم مر جائیں گے لیکن آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، جب تک زندہ ہیں آپ کے ساتھ رہیں گے۔

[3]: بیعت علی ارکان الاسلام... کہ کلمہ پڑھ لیا ہے، جہاد بھی کرتے ہیں، اب ہم بیعت کرتے ہیں کہ احکامِ شریعت پر عمل کرتے رہیں گے اور ہم گناہوں سے بچیں

گے۔

یہ تین قسم کی بیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں آج جو مشائخ بیعت لیتے ہیں یہ نہ تو بیعت علی الایمان ہے، نہ بیعت علی الجہاد ہے بلکہ یہ بیعت علی ارکان الاسلام ہے۔ تو یہ تین قسم کی بیعت مشروع ہے۔

بیعت کی ضرورت واہمیت:

اس لیے جو شخص کسی سے بیعت نہ ہو اس کو بیعت کرنی چاہیے۔ حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ بیعت ضروری ہے لیکن یہ کہتا ہوں کہ تزکیہ نفس ضروری ہے اور مشاہدہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس بغیر بیعت کے ہوتا ہی نہیں ہے، اس لیے بیعت ضروری ہے۔ اللہ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اور جب کسی کے ہاتھ پر بیعت ہوں تو پھر فنائے کلی حاصل کریں۔ پھر اپنی خواہشات کو شیخ کی خواہشات کے تابع کریں تو پھر بیعت کرنے کا فائدہ ہوتا ہے وگرنہ بیعت کا فائدہ نہیں ہوتا۔ بیعت کا مقصد اپنی روح کا علاج ہے اور علاج تب ہوتا ہے جب مریض اپنا پورا مرض معالج کے سامنے رکھے اور اگر اپنا مرض معالج کے سامنے نہ رکھے تو پھر علاج نہیں ہوتا۔ اگر مریض یہ سمجھے کہ میں ڈاکٹر کو اپنا مرض بتاؤں گا تو ڈاکٹر کیا محسوس کرے گا تو علاج نہیں ہو گا۔ تو جس طرح مریض جسمانی مرض کے لیے ڈاکٹر کے سامنے اپنا مرض رکھتا ہے اور اس کو ڈاکٹر پر پورا اعتماد ہوتا ہے، مثلاً کہ ڈاکٹر مجھ سے نفرت نہیں کرے گا، علاج اچھی طرح کرے گا، میری یہ کمزوری کسی اور کو نہیں بتائے گا بالکل اسی طرح اپنے طبیب روحانی یعنی اپنے شیخ پر اعتماد ہونا چاہیے کہ میں اپنے گناہ بتاؤں گا تو میرا شیخ مجھ سے نفرت نہیں کرے گا، پوری ہمت اور کوشش سے میرا علاج کرے گا، یہ میرا مرض کسی اور کو نہیں بتائے گا۔ جب یہ اعتماد ہو تو پھر

کھل کر اپنا مرض بتائیں۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس پر شبہ ہے کہ جب گناہ کرو تو گناہ کسی کو بتانا نہیں چاہیے چونکہ اللہ نے گناہ پر پردہ ڈالا ہے۔ اس لیے اگر شیخ کو اپنا گناہ بتا دیا تو گویا اپنے گناہ پر اسے گواہ بنالیا! میں نے کہا کہ وہ تب ہے کہ جب بندہ گناہ کرے اور لذت کے لیے دوسروں کو بتائے تو پھر تو جائز نہیں ہے اور اگر گناہ ہو گیا ہو اور معالج کو بتائے اپنی اصلاح کے لیے تو اس سے مقصد نہ تو گناہ کا اظہار ہے نہ لذت لینا ہے بلکہ اپنے گناہ کو ختم کرنا ہے۔ نیت کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔

مغضوب علیہم سے دوستی کی ممانعت:

﴿يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ قَدۡ يَئِسُوۡا مِنَ الۡاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الۡكُفَّارُ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡقُبُوۡرِ ۝۱۳﴾

فرمایا کہ اے ایمان والو! ان لوگوں سے پیار نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہے اور وہ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے قبر میں پڑے کافر خدا کی رحمت سے مایوس ہیں۔

جب کافر مر کر قبر میں چلا جاتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اب مجھے جنت نہیں ملنی۔ فرمایا کہ ان یہودیوں کو بھی پتا ہے کہ مسلمان حق پر ہیں اور ہم کفر پر ہیں اور ان کو پتا ہے کہ موت کے بعد ہمیں جہنم ملنی ہے جس طرح قبر میں پڑے کافر کو یقین ہے اسی طرح ان کو بھی یقین ہے۔ تو ایسے کفار سے پیار نہ کرو، ان سے دوریاں اختیار کرو۔

اللہ رب العزت ہم سب کی حفاظت فرمائیں، اللہ ہم سب کو خالص ایمان کی نعمت عطا فرمائیں۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ.

سورۃ الصف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾﴾

شانِ نزول:

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین غزوہ احد میں تھے اور وقتی طور پر ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ جب اعلان ہوا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو بعض صحابہ کمزور ہو گئے اور بعض ڈٹ کر لڑے۔ مزید یہ کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو افراد لے کر ایک طرف ہو گیا اور اس غزوہ میں شریک نہیں ہوا۔ تو مجموعی صورتحال سے بعض صحابہ پر بھی اثر پڑا کہ ہماری کمزوری ہے۔ تو جو کمزوری رہ گئی تھی تو اس کی تلافی کے لیے ان کا جی چاہتا تھا اور یہ باہمی مشاورت کرتے کہ اگر ہمیں پتا چلے کہ اللہ کے ہاں سب سے محبوب عمل کون سا ہے تو ہم اس پر جان ومال سب کچھ لٹا دیں گے۔ اس پر یہ سورۃ الصف نازل ہوئی۔

﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٢ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ ٱللَّهِ أَن تَقُولُوا۟ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٣

جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو! اللہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ایسی بات کرو جو کرتے نہیں ہو!

یہاں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ آدمی کو دعوے نہیں کرنے چاہییں کہ ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَا۟یْءٍ إِنِّى فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝٢٣ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ﴾ [14]

میرے پیغمبر! آپ بھی کوئی بات فرمائیں تو یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کروں گا بلکہ یہ فرمایا کریں کہ ان شاء اللہ کروں گا یعنی اگر اللہ چاہے تو ہو گا نہ چاہے تو نہیں ہو گا۔

تو یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بات سمجھائی ہے کہ یہ بات نہ کرو کہ ہم جان ومال لٹا دیں گے۔ ہاں یہ کہو کہ اگر حکم شرعی ہے تو ہم ان شاء اللہ پوری کوشش کریں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ ایسا لفظ استعمال نہ کرو کہ جس میں بظاہر تعلی ہو۔

کرۂ ارض پر بڑا عالم کون ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کرۂ ارض پر کون ہے؟ فرمایا کہ میں ہوں۔ بڑے عالم تو موسیٰ علیہ السلام ہی تھے کیونکہ نبی تھے لیکن یہ لفظ بظاہر ایسا تھا کہ اس کے بجائے اگر یوں فرماتے کہ میرے علم کے مطابق تو میں ہوں شاید کوئی اور بھی ہو، یہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس پر اللہ کی طرف

14۔ الکہف 18:23،24

سے عتاب آ گیا کہ جائیں ہمارا فلاں بندہ ہے، اس سے ملاقات کریں۔ پھر آپ علیہ السلام نے ملاقات کی حضرت خضر علیہ السلام سے۔ جس کا قصہ سورۃ الکہف میں موجود ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینات کا علم تھا تشریعات کا علم نہیں تھا، شریعت میں پھر بھی موسیٰ علیہ السلام بڑھ کر تھے، نبی جتنا بھی بڑا ہو لیکن اللہ سے تو چھوٹا ہے نا! حضرات انبیاء علیہم السلام ہم سے تو بہت بڑے ہیں لیکن اللہ سے تو چھوٹے ہیں، اس لیے اللہ رب العزت اپنے پیغمبر کو تنبیہ بھی فرماتے ہیں اور پیغمبر کا تزکیہ بھی فرماتے ہیں اور پیغمبر سے اگر خلافِ اولیٰ بات ہو تو اس پر اپنے نبی کو ہدایات بھی دیتے ہیں۔

تو فرمایا کہ ایسی باتیں نہ کرو جو تم کر نہ سکو! اللہ کو ایسی بات پسند نہیں ہے کہ بندہ ایسا دعویٰ کرے جو کر نہ سکے۔

دعویٰ نہ کرے دعوت دیتا رہے:

یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں؛ ایک ہے دعویٰ اور ایک ہے دعوت۔ کسی بڑے عمل کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے یہ اللہ کو پسند نہیں ہے لیکن اگر کوئی نیک عمل نہ کرتا ہو تو اس نیک عمل کی دعوت دینی چاہیے۔ تو یہاں دعوے کی نفی ہو رہی ہے دعوت کی نفی نہیں ہو رہی۔ اس لیے تفسیر بیان القرآن میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ خلاصہ کے طور پر فرما رہے ہیں کہ اس سے وعظ بلا عمل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک یہ ہے کہ آدمی جو دعوت دیتا ہے خود بھی اس پر عمل کرے، اس کا حکم دوسری جگہ پر موجود ہے:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾[15]

کیا تم لوگوں کو حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو!

تو یہاں پر تنبیہ ہے کہ بے عمل نہیں ہونا چاہیے بلکہ با عمل ہونا چاہیے۔

اور یہاں جو بات فرمائی ہے تو یہاں ترغیب اس بات کی دی ہے کہ صرف زبانی دعوے نہ کرو بلکہ عمل بھی کرو۔ تو اگر کوئی شخص عمل نہیں کرتا اور نیک عمل کی دعوت دیتا ہے تو اس کو ایک اجر پھر بھی ملے گا اور اگر عمل بھی کرتا ہے اور نیک عمل کی دعوت بھی دیتا ہے تو اس کو دو اجر ملیں گے اور اگر کوئی شخص نیک عمل کی دعوت نہیں دیتا صرف نیک عمل کرتا ہے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ ہاں البتہ نیک عمل بھی کرے اور دعوت بھی دے تو وہ زیادہ مناسب ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۳۳﴾[16]

اس شخص سے زیادہ کس کی بات اچھی ہو گی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں۔

تو دعوت بھی دیں اور نیک عمل بھی ہونا چاہیے۔ بہر حال یہاں دعوت بلا عمل کی نفی نہیں ہے بلکہ ترغیب دے رہے ہیں کہ جو کہتے ہو وہ کیا بھی کرو۔

مجاہدین اسلام خدا کو محبوب ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ

15۔ البقرۃ 44:2

16۔ حٰم السجدۃ 33:41

مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾

اب اللہ نے محبوب عمل بتا دیا۔ فرمایا کہ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو میدان جہاد میں نکل کے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ کر لڑتے۔

حدیث پاک میں ہے:

أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ، فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ.[17]

اے لوگو! دشمن سے ملاقات یعنی جنگ کی تمنا نہ کرو، بلکہ اللہ سے عافیت مانگو لیکن جب جنگ آجائے تو بس پھر ڈٹ جاؤ! پھر دوڑنا نہیں چاہیے۔

سبب اختیار کرنا بندے کا فعل اور نتیجہ مرتب کرنا اللہ کا فعل:

﴿وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُوۡنَنِیۡ وَ قَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ ؕ فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۵﴾﴾

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اے میری قوم! تم مجھے تکلیفیں کیوں دیتے ہو حالانکہ تمہیں پتا بھی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، جب ان لوگوں نے ٹیڑھا پن اختیار کیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھو کہ ﴿فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ﴾ یا ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ﴾ اس قسم کی جو آیات آتی ہیں تو ان پر کسی کو

17۔ صحیح البخاری، رقم:3024

یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب اللہ نے مہر لگا دی تو بندے کا قصور کیا ہے؟ اللہ نے ہدایت سے دور کر دیا تو بندے کا قصور کیا ہے؟

اس کا جواب سمجھیں کہ اللہ رب العزت نے ہر بندے میں فجور اور تقویٰ دونوں چیزیں رکھی ہیں، گناہ کرنے کی طاقت اور گناہ کو کنٹرول کرنے کی طاقت، جب بندہ گناہ کرنے کی طاقت استعمال کرتا ہے اور کنٹرول کرنے کی طاقت استعمال نہیں کرتا بلکہ قصداً گناہ پہ گناہ کرتا رہتا ہے تو بالآخر اللہ ہدایت کے دروازے بند کر کے گناہ کا دروازہ اس کا کھولتے ہیں، اللہ اس کے دل پر مہر لگاتے ہیں، پھر وہ نیک عمل نہیں کر سکتا۔ تو یہ جو اللہ مہر لگاتا ہے جس کی وجہ سے بندہ نیک عمل نہیں کر سکتا تو اللہ یہ مہر ابتدا سے نہیں لگاتا بلکہ بندے کی ضد اور عناد اور بد کرداری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ جیسے ایک بندہ فیکٹری میں ملازم ہو اور چھٹیاں کرے۔ اس کے بعد اس کا مالک کہے کہ بھائی! چھٹیاں نہ کرو، وہ پھر بھی چھٹیاں کرے۔ او بھائی! چھٹیاں مت کیا کرو۔ وہ پھر بھی کرے۔ اگر تم چھٹیاں کرو گے تو ہم نکال دیں گے۔ یہ پھر بھی چھٹی کرے۔ پھر مالک اس کو نکال دے۔ اب یہ ملازم اس کے بعد کہتا پھرے کہ میں نے کیا کیا ہے؟ مجھے تو ویسے ہی نکال دیا ہے۔ بھائی! تجھے پہلے تو رکھا ہوا تھا، نکالا اس لیے کہ تو ضد پر تھا، بات نہیں مانتا تھا تو نکال دیا تجھے۔ نکالا اس وجہ سے نہیں کہ مالک چاہتا ہے کہ اس کو نکالوں، نکالا اس وجہ سے ہے کہ اس کی اپنی حرکتیں ایسی تھیں۔ جب اللہ مہر لگاتا ہے تو وہ ابتداءً نہیں لگاتا بلکہ جب بندہ حرکتیں ایسی کرتا ہے تو اس پر مہر لگ جاتی ہے۔

بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام:

﴿وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ

اَحۡمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۶﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، تورات کی تصدیق کرتا ہوں، بعد میں آنے والے پیغمبر کی بشارت بھی دیتا ہوں جس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی احمد کی۔ یہاں نام ''محمد ''نہیں لیا بلکہ ''احمد'' بتایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب میں محمد نام رکھا جاتا تھا، احمد نام رکھنا متعارف نہیں تھا، اس لیے ایسا نام بتایا کہ ان کے ہاں پہلے متعارف تھا ہی نہیں، فرمایا کہ ایسے نبی کی بشارت دیتا ہوں کہ جس کا نام احمد ہو گا۔

حضور علیہ السلام بنی اسماعیل میں سے ہیں:

دوسری بات ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ﴾ پر سمجھیں! آج ایک نئی بحث چلی ہے ایک گمراہ قسم کا شخص ہے شیخ محمد کے نام سے، اس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی بن کر آئے تھے تو عربوں میں نہیں تھے بلکہ یہ بنی اسرائیل میں تھے اور اس پر دلیل کے طور پر یہ آیت پیش کرتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىةِ﴾ کہ میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں، ﴿وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ﴾ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دیتا ہوں۔ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ﴾ جب وہ احمد بنی اسرائیل کے پاس آیا تو ﴿قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ﴾ انہوں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے۔ شیخ محمد کہتا ہے کہ دیکھو! یہاں صاف پتا چل رہا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل میں آئے تھے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ میں "هُوَ" ضمیر کا مرجع احمد نہیں ہے، "هُوَ" ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں تورات کی تصدیق بھی کرتا ہوں، احمد کی بشارت بھی دیتا ہوں اور جو دلائل اور معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے ان کے بارے میں بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا: ﴿هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ یہ تو کھلا جادو ہے۔ تو یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے کہی تھی۔ اس کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ہرگز نہیں ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر 110 کو دیکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٠﴾﴾

جب عیسیٰ علیہ السلام دلائل لے کر آئے تو بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہ تو جادو ہے۔ تو اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر ہونے کا طعنہ اہلِ مکہ نے دیا ہے، اہلِ مدینہ نے کبھی نہیں دیا۔ اہلِ مکہ طعنہ دیتے ہیں لیکن مدینہ میں آنے کے بعد یہود نے کبھی نہیں کہا تھا کہ آپ ساحر ہیں۔ معلوم ہوا کہ عربوں کا معاملہ الگ ہے

اور بنی اسرائیل کا معاملہ الگ ہے۔ اس سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔

ظالم کون ہے؟

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ یُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۷﴾

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے جبکہ اس کو اسلام کی طرف دعوت دی جارہی ہوتی ہے۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے!

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸﴾

یہ لوگ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں جبکہ اللہ اپنے نور کو مکمل کریں گے اگرچہ کافروں کو یہ بات جتنی بھی برے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے منہ سے اس دین کو ختم کرنا چاہتے ہیں یعنی یہ ان کے زبانی دعوے ہیں کہ ہم دین کو مٹا دیں گے لیکن یہ دین ان کے دعوؤں سے مٹ نہیں سکتا۔ ایک معنی تو یہ ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ واقعتاً جیسے اللہ کے نور کو کوئی بندہ اپنے منہ کے پھونکوں سے بجھانا چاہے تو ایسے ہی ہے کہ جیسے اللہ کے دین کو کوئی بندہ اپنی طاقت سے ختم کرنا چاہے، جس طرح اللہ کے نور کے مقابلے میں انسان کی پھونک کی کوئی حیثیت نہیں ہے اسی طرح اللہ کے دین کے مقابلے میں ان کی پوری طاقت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

غلبہ عملی اور غلبہ برہانی:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ

كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۹﴾

وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی قرآن کریم دے کر بھیجا اور دینِ حق یعنی دین اسلام دے کر بھیجا ہے تاکہ اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب آ جائے، اور مشرک جتنا بھی چاہے بالآخر یہ دین غالب ہو کر ہی رہے گا۔

بظاہر اس پر اشکال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تئیس سالہ دورِ نبوت گزار کر چلے گئے لیکن دین تمام ادیان پر غالب نہیں آیا بلکہ جزیرہ عرب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور تھوڑا سا باہر نکلے اور یہ غالب تو بعد کے ادوار میں ہوا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی پوری دنیا پر دین غالب نہیں آیا تھا۔ بہت سارے خطے ایسے تھے جہاں دین نہیں پہنچا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آئے گا تو پھر دین اسلام تمام ادیان پر غالب آئے گا اور ایک شخص بھی ایسا نہیں ہو گا جو کلمہ پڑھ کر مسلمان نہ ہو بلکہ سب کے سب موت سے پہلے پہلے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں گے۔ تو اس کا مطلب کیا ہوا کہ اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا تاکہ تمام ادیان پر غالب فرما دیں؟

اس کا جواب سمجھ لیں کہ غلبہ کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہے غلبہ عملی اور ایک ہے غلبہ برہانی۔ جو غلبہ برہانی ہے وہ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہو گیا تھا، کوئی بھی ایسا کافر اور کوئی بھی ایسا بے دین نہیں ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہو گفتگو کے لیے اور دلیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غالب نہ آئے ہوں، کیونکہ دلیل قرآن کریم ہے اور وہ تمام دلائل پر غالب ہے، اور ایک ہے غلبہ عملی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ہوا اور جو ہر شخص کا کلمہ پڑھنا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہو جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر دین کے نفاذ کی بات فرمائیں گے۔

اب اگر ہم کسی جگہ پر غالب آتے ہیں تو ہمارا یہ غلبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہے، حضور کا دین ہے، حضور کی لائی ہوئی ہدایت ہے، اسی کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام چلیں گے اور غالب آئیں گے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے غالب آئیں گے تو غلبہ بظاہر کسی کا بھی ہو درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ہے۔ تو یہاں غلبہ برہانی مراد ہے۔

نفع بخش تجارت جہاد فی سبیل اللہ:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝١٠ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝١١ۙ﴾

یہاں جہاد کی بات کی ہے کہ ہم تمہیں ایسی تجارت بتائیں کہ جس کے دو نفع ہیں؛ ایک آخرت کا اور ایک دنیا کا۔ آخرت کا نفع یہ ہے کہ ﴿تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب سے بچائیں گے، اور دنیا کا نفع کیا ہے: ﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ کہ اللہ کی مدد ملتی ہے اور فتح بھی عنقریب ملے گی۔

مومن کے ہاں دنیا کا نفع اصل نہیں ہوتا بلکہ آخرت کا نفع اصل ہوتا ہے، اس لیے اللہ نے آخرت کے نفع کو مقدم کیا ہے۔

فرمایا: وہ تجارت جو تمہیں نفع دے وہ یہ ہے کہ تم اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اپنی جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو تو۔

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝١٢ۙ﴾

اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کریں گے اور تمہیں ایسے باغات میں بھیجیں گے جہاں نہریں جاری ہوں گی اور ہمیشہ رہنے والے باغات اور اچھے اچھے مکانات بھی ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾

اس کے علاوہ اللہ تمہیں ایک اور چیز بھی دے گا اور وہ تمہیں پسند بھی ہے، وہ ہے اللہ کی مدد اور عنقریب ملنے والی فتح۔ اور مؤمنین کو خوشخبری سنا دیں۔

اس سے مراد فتح مکہ ہو یا فتحِ خیبر ہو جو بھی فتوحات ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں اور قیامت تک آنے والی فتوحات بھی اس میں شامل ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت ہے کہ یہ جلدی کو پسند کرتا ہے اس لیے اللہ نے جلدی نفع دنیا والا ان کو دیا اور دینے کا وعدہ فرمایا۔

جہاد کا معنی قتال ہے:

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور شریعت میں جو اصطلاح ہے جہاد، شرعاً جہاد کا معنی متعین ہے یعنی اللہ کے راستے میں قتال کرنا اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے۔

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.[18]

جو شخص اس لیے قتال کرے کہ اللہ کا دین بلند ہو تو یہ شخص واقعتاً اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا ہے۔

احکامِ شریعت میں جتنے بھی احکامات ہیں تو ان میں ایک معنی لغوی ہوتا ہے اور ایک معنی اصطلاحی ہوتا ہے۔ تو یہ لغوی معنی معتبر نہیں ہوتا بلکہ اصطلاحی معنی معتبر

18۔ صحیح البخاری، رقم: 2810

ہوتا ہے۔ جس طرح صلوٰۃ حکمِ شرعی ہے، اس کا لغوی معنی ہے تحریک الالیتین، اپنے سرین کو حرکت دینا لیکن یہاں صلوٰۃ کا معنی شریعت میں سرین کو حرکت دینے والا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ارکان مخصوصہ کا اوقات مخصوصہ میں اذکار مخصوصہ کے ساتھ ہونا یہ نماز ہوتی ہے۔ اذان لغت میں "هُوَ الْإِعْلَامُ" ہے کہ اعلان کرنا اور شریعت میں عام اعلان مراد نہیں ہے بلکہ مخصوص اعلان مراد ہے مخصوص کلمات کے ساتھ مخصوص اوقات میں۔ اسی طرح حج کا لغوی معنی ہے "ارادہ" لیکن شریعت میں ہر ارادے کو حج نہیں کہتے بلکہ عملاً انسان مخصوص اوقات اور مخصوص جگہ میں مخصوص افعال ادا کرے تو اس کا نام حج ہے۔ اسی طرح صوم کا لغوی معنی ہے "اَلْإِمساك" یعنی مطلقاً رکنا روزہ ہے لیکن شریعت میں صوم کہتے ہیں صبح سے لے کر شام تک رکنا کھانے، پینے اور جماع سے نیت کے ساتھ۔ بالکل اسی طرح جہاد کا لغوی معنی ہے مشقت اور اصطلاحِ شریعت میں ہر مشقت والے کام کو جہاد نہیں کہتے بلکہ جہاد کا معنی متعین ہے جس کو کہتے ہیں قتال فی سبیل اللہ۔ آپ تفاسیر اٹھالیں آپ کو یہی معنی ملے گا اور تمام کتب احادیث اٹھالیں جہاں بھی کتاب الجہاد ہو گا اس کے ساتھ صرف اور صرف قتال کا مسئلہ ہو گا، کوئی اور نہیں ہو گا اور جہاں بھی فقہ میں کتاب الجہاد ہو گا تو وہاں صرف جہاد کے مسائل ہوں گے اور کوئی مسئلہ وہاں پر زیر بحث نہیں آئے گا۔

آیات جہاد میں تحریف کا حکم:

اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ جہاد نہیں کر سکتے تو نہ کریں، جہاد نہ کرنا تو گناہ ہے لیکن آیاتِ جہاد میں تحریف کرنا یہ کفر ہے۔ فسق: اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ معافی ہے لیکن کفر قابلِ معافی نہیں ہوتا، اپنی جان چھڑانے کے لیے ہم تحریفات شروع کر دیتے ہیں، یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔ اس لیے اپنے ایمان کی ہمیں بہت زیادہ فکر کرنی چاہیے۔

اس لیے میں شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ جہاد کا معنی قتال فی سبیل اللہ ہے، یہ امت پر فرض عین ہے، اس کا منکر کافر ہے اور اس کا تارک فاسق ہے۔ ایک تو جہاد کا معنی ٹھیک کریں، جہاد کا حکم ٹھیک بتائیں اور اس کے بعد آپ نہیں کر سکتے تو اپنے فسق کو تسلیم کریں کہ بھائی! میں مانتا ہوں کہ میں فاسق ہوں، میں عملاً جہاد نہیں کر رہا لیکن اس کا یہ معنی کہ میں تاویل کروں.... یہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ مسئلہ ہمیشہ ٹھیک بتائیں، کمی بیشی نہ کریں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

مثال کے ذریعے وضاحت:

اب آپ بتائیں! ہم یہاں پر بیٹھے ہیں اور باہر سے کسی مدرسے کے مہتمم صاحب آ جائیں یا کسی مدرسے کا مدرس آ جائے جو تھوڑی تنخواہ پر زیادہ پڑھاتے ہوں اور مشقت بہت برداشت کرتے ہوں تو آپ کیا کہیں گے کہ استاد جی! آپ کو ملنے کے لیے فلاں مدرسے کے مجاہد صاحب آئے ہیں یا یہ کہیں گے کہ فلاں مدرسے کے مدرس یا مہتمم صاحب آئے ہیں؟ سارے یہی کہیں گے کہ مدرس یا مہتمم آیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کے دور دراز علاقے میں خانقاہ ہو، پانی نہ ملتا ہو، ضروریاتِ زندگی میسر نہ ہوں، مشقت کے ساتھ اللہ اللہ کرتا ہو اور وہ ملنے کے لیے آئے تو آپ کیا کہیں گے کہ استاد جی! فلاں خانقاہ کے شیخ آئے ہیں یا یہ کہیں گے کہ فلاں خانقاہ کے مجاہد آئے ہیں؟ (فلاں خانقاہ کے شیخ آئے ہیں۔ سامعین) اسی طرح اگر کوئی تبلیغی جماعت آئی ہو اور مشقت کے ساتھ تبلیغ کرتے ہوں، ہمیں ملنے کے لیے آ جائیں تو آپ کیا کہیں گے کہ استاد جی! چند تبلیغ والے آئے ہیں یا مجاہدین آئے ہیں؟ (تبلیغ والے آئے ہیں۔ سامعین) اور جب یہ کہیں کہ ایک مجاہد ملنے کے لیے آیا ہے تو اب معنی یہ ہو گا کہ جہاد کرنے والا مجاہد آیا ہے۔ دیکھو! ہمارے عرف میں بھی جہاد کا معنی متعین ہے۔ پھر کیوں ہم جھوٹ بولتے ہیں، کیوں دھوکہ دیتے ہیں اور اپنے ایمان کو کیوں تباہ کرتے ہیں؟

بھائی! پڑھانے پر فضائل موجود ہیں، تزکیہ پر فضائل موجود ہیں، دعوت و تبلیغ پر فضائل موجود ہیں تو جہاد کے فضائل کیوں مروڑتے ہو؟

خدا کے لیے تحریفیں کر کے دین کو مت بگاڑو! دین کو خراب مت کرو! اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دین کے مددگار بنو!

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾﴾

فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے جو اللہ کے واسطے میری مدد کرے؟ حواریوں نے کہا کہ ہم مدد کریں گے۔ پھر یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک نے کفر کیا۔ اللہ نے ایمان والوں کی مدد کی ان کے دشمنوں کے خلاف اور بالآخر ایمان والے غالب آ گئے۔

حواری کی تعریف:

حوارین جمع ہے حواری کی۔ حواری کہتے ہیں ایسے مخلص دوست کو جس میں عیب نہ ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے ایسے بارہ دوست دیے تھے جن میں عیب نہیں تھے۔ عیب دو قسم کا ہوتا ہے؛ ایک عیب ہوتا ہے لازمی اور ایک عیب ہوتا ہے متعدی۔ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں کہ جن کا نقصان انسان کی ذات کو ہوتا ہے اور کچھ کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا نقصان انسان کی ذات کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو

ہوتا ہے۔ یہ جو لازمی عیب ہے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے اور جو متعدی عیوب ہوتے ہیں ان کی تلافی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے اپنے مزاج میں یہ چیز شامل کریں کہ متعدی گناہ کبھی نہ کرو۔ لازمی بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن متعدی گناہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نصاریٰ کے تین فرقے تھے؛ ایک فرقہ یہ کہتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں لہذا اوپر چلے گئے ہیں۔ بعض کہتے کہ خدا کے بیٹے تھے لہذا خدا نے اپنے پاس بلا لیا اور بعض کہتے کہ خدا کے بندے تھے، اللہ نے ان کو محفوظ کرنے کے لیے اوپر بلا لیا۔ تو تین قسم کے فرقے ان میں ہو گئے تھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورة الجمعة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ الۡمَلِكِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ۝١
هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝٢﴾

جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں وہ اللہ جو بادشاہ ہے، ہر عیب سے پاک ہے، غالب ہے اور حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے اُمیوں کے لیے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے کتاب اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، انہیں پاک کرتا ہے، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ واضح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

پیغمبر کی چار صفات:

اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر کی چار صفات بیان فرمائی ہیں:

[1]: ”يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ“ انہیں قرآن کریم پڑھ کر سناتے ہیں۔

[2]: ”وَيُزَكِّيۡهِمۡ“ تزکیہ سے ہے یعنی اخلاق رذیلہ سے پاک کرتے ہیں۔ عُجب، کبر، حسد، بغض اور گندے عقائد سے پاک کرتے ہیں۔

[3]: ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ“ قرآن مجید کا معنی سمجھاتے ہیں۔

[4]: ”وَالْحِكْمَةَ“ اور سنت کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ چار کام ہیں یعنی عملاً بتاتے ہیں کہ قرآن پر عمل کیسے کرنا ہے؟

یہاں ”الْاُمِّيّٖنَ“ سے مراد تو عرب ہیں۔ اُمی کہتے ہیں اَن پڑھ شخص کو۔ اَن پڑھ کا معنی جس نے کسی آدمی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو۔ اس معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُمی ہیں کہ آپ نے کسی آدمی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اُمی کا یہ معنی کرنا کہ جسے کچھ نہ آتا ہو یہ معنی ٹھیک نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا، براہِ راست اللہ نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی آپ کے معلم نہیں ہیں، نبی کا معلم خدا ہوتا ہے اور جبرائیل علیہ السلام درمیان میں واسطہ ہیں۔ میں سمجھانے کے لیے مثال دیتا ہوں کہ جیسے یہ پینسل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ پینسل اُس طالب علم کو دے دو، تو یہ دینے والا درمیان میں واسطہ ہے۔ میں تمہیں ایک پیغام دے رہا ہو کہ فلاں بندے کو دے دو، یہ واسطہ ہے۔ اسی طرح جبرائیل علیہ السلام اللہ عزوجل اور پیغمبر کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔

پیغمبر پاک کی بعثت عامہ:

﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳﴾

اللہ تعالی کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اُمیوں کی طرف بھی بھیجے گئے اور ان لوگوں کی طرف بھی بھیجے گئے، ﴿لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ جو ابھی ان کے ساتھ نہیں ملے۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ کا معنی ”ابھی تک پیدا نہیں ہوئے“ بھی کر سکتے ہیں

اور "ابھی تک انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا" بھی کر سکتے ہیں، دونوں معانی ٹھیک ہیں۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾

یہ اللہ کا فضل ہے اللہ جسے چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ اللہ بہت بڑے فضل کا مالک ہے۔

یہاں ایک بات سمجھیں کہ یہ جو "فِی الْاُمِّيّٖنَ" میں لفظ "فی" ہے یہ بمعنی "لام" ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اللہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا "فِی الْاُمِّيّٖنَ" امیوں کے لیے "وَّاٰخَرِيْنَ" اور بعد والوں کے لیے۔ اگر یہ ترجمہ نہیں کریں گے تو اشکال پیدا ہو گا کہ اُمّیّین میں نبی بنا کر بھیجا ہے یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے اور جو موجود نہیں تھے ان میں نبی بن کر کیسے آئے؟ وہ تو موجود ہی نہیں تھے۔ اس لیے یہاں "فی" کا معنی "لام" کریں گے۔ اب اشکال ختم ہو جائے گا۔ اور "فی" کا معنی "لام" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القران میں کیا ہے۔ میں نے کتنی مرتبہ آپ سے کہا کہ آپ کو کتنے اشکالات متن قرآن پر ہوں تو بیان القرآن کھولو، آپ دیکھنا کہ قرآن کریم کے متن کے اشکال کیسے حل ہوتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کی بشارت:

﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ﴾

ایک روایت میں ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "اٰخَرِيْنَ" سے مراد کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔ پھر پوچھا گیا کہ "اٰخَرِيْنَ" سے مراد کون ہیں؟ پھر سکوت فرمایا۔ پھر پوچھا گیا کہ "اٰخَرِيْنَ" سے مراد کون ہیں؟ تیسری بار جب پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ

عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رِجَالٌ أَوْ رَجُلٌ مِنْ هَؤُلَاءِ.[19]

کہ اگر ایمان ثریاستارے پر بھی پہنچ گیا تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قبیلے کے لوگ وہاں سے بھی لائیں گے۔

ایک روایت میں دین کا لفظ ہے[20] اور ایک روایت میں علم کا لفظ ہے۔[21]

امام جلال الدین حضرت سیوطی رحمہ اللہ شافعی ہونے کے باوجود لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔[22]

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ عجم سے تھے۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ میں سے کوئی بھی عجمی نہیں تھے، تنہا امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ عجمی تھے اور فارسی تھے۔ تو یہ بشارت ان کے بارے میں ہے۔

﴿وَآخَرِينَ مِنْهُمْ﴾ کا مصداق امام ابو حنیفہ:

اس پر پھر میرے اپنے دلائل ہیں جو میں پیش کرتا ہوں بات سمجھانے کے لیے:

[1]: دیکھو! ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ"[23]

19۔ صحیح البخاری، رقم: 4897

20۔ صحیح مسلم، رقم: 2546

21۔ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی: ج6 ص64، 65

22۔ تبییض الصحیفۃ ص59، 60

23۔ مشکوۃ المصابیح: ص554 باب مناقب الصحابۃ

میرے صحابہ نجوم ہدایت ہیں۔

ثریا ایک ستارہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اٰخَرِیْنَ" حضرت سلمان فارسی کے قبیلے کے لوگ ہوں گے، ثریا تک جب دین ہو گا تو وہ اسے وہاں سے بھی لیں گے۔ اس کا معنی کہ آخرین میں ایسے لوگ ہوں گے جو براہِ راست صحابہ سے دین حاصل کریں گے اور وہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں۔ یہ ہمارا استدلال ہے۔ اب دیکھیں! نفسِ مسئلہ ٹھیک ہو تو دلائل آپ جمع کرتے جائیں۔ تو آخرین کا مصداق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔

[2]: میں ایک اور توجیہ پیش کرتا ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرب ہیں اور آپ کا دین عرب و عجم سب کے لیے ہے۔ تو ایک ایسا شخص چاہیے کہ جو عجمی ہو اور عربی جانتا ہو، وہ باقی تینوں ائمہ میں سے کوئی امام نہیں ہے بلکہ یہ صرف امام اعظم ابو حنیفہ ہے جو عجمی اور عربی دونوں جانتے ہیں۔ کیا معنی کہ عربی پڑھیں گے اور عجمیوں کو سکھائیں گے، تو آخرین کا مصداق وہ آدمی ہے۔

[3]: ایک ایسا شخص ہونا چاہیے کہ جو عرب و عجم کے درمیان میں ہو، عرب سے لے اور عجم کو دے، یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہے۔ کیوں، اس لیے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کوفہ میں تھے اور کوفہ عرب و عجم کے درمیان سنگم ہے، یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بسایا تھا۔ تو ضرورت ہے کہ ایسا شخص ہو جو سنگم پر بیٹھا ہو، اُدھر سے لے اور اِدھر دے، امام مالک رحمہ اللہ ہیں ہی مدینہ میں، اُدھر سے لیں گے تو اُدھر ہی دیں گے کیونکہ دونوں طرف مدینہ ہے۔ یہ واحد امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو سنگم کوفہ پر بیٹھے ہیں، عرب سے لیتے ہیں اور عجم کو دیتے ہیں۔

جہاں پر بڑا کام چھوڑے وہاں سے چھوٹا شروع کرے:

آپ بڑی جرأت سے کہا کریں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ائمہ فقہاء میں پہلے

فقیہ ہیں جنہوں نے علم شریعت کو مدون فرمایا ہے اور ان سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا اور پہلا شخص مکہ اور مدینہ کا نہیں بلکہ کوفہ کا ہونا چاہیے تھا.... اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بڑا کام چھوڑ کر جائے تو چھوٹا وہاں سے شروع کرتا ہے، صدیق چھوٹے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں، حضور مدینہ سے گئے.... صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، صدیق رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ چھوٹے ہیں، صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ سے گئے.... عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور عثمان رضی اللہ عنہ چھوٹے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے گئے.... عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور علی رضی اللہ عنہ چھوٹے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ سے گئے.... حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، اب حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور ان کے بعد چار فقہاء ہیں، حضرت علی ان چاروں سے بڑے ہیں۔

اب توجہ رکھنا! خلفاء میں چار ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اور فقہاء میں چار امام احمد، امام شافعی، امام مالک اور امام ابو حنیفہ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ خلفاء بڑے ہیں اور فقہاء چھوٹے ہیں۔ تو جہاں سب سے آخری خلیفہ گیا ہے تو سب سے پہلا فقیہ وہیں آئے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ سے جاتے تو پہلا امام مکہ میں آتا، حضرت علی مدینہ سے جاتے تو پہلا امام مدینہ میں آتا۔ چونکہ آخری خلیفہ کوفہ سے ہی گیا ہے لہذا پہلے امام کو کوفہ میں ہی ہونا چاہیے۔ کوفہ آخری خلیفہ کی جائے شہادت ہے اور پہلے امام کی جائے ولادت ہے! (سبحان اللہ۔ سامعین) اب دیکھو! بات کیسے کھلتی ہے! لوگوں کو بات سمجھ آتی ہے۔

با ادب اور بے ادب:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حنفی ڈائریکٹ مدینہ کی بات نہیں کرتے بلکہ کوفہ کی

بات کرتے ہیں کہ کوفہ کے ذریعے مدینے جاؤ جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ڈائریکٹ مدینہ چلو!

ہم نے کہا کہ یہ ترغیب تو احادیث میں ہے۔ المستدرک علی الصحیحین میں روایت موجود ہے:

"أَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا، فَمَنْ أَرَادَ الْمَدِيْنَةَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ." [24]

میں نبی علم کا شہر ہوں اور علی شہر علم کا دروازہ ہے۔ جو شہر علم میں آنا چاہتا ہے وہ دروازے سے ہو کر آئے۔

میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ مسجد کا امام اعلان کرتا ہے کہ صفِ اول میں نماز پڑھو اس کا اجر بہت ملتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو دروازے سے گزر کر صفِ اول میں جائے، یہ باادب نمازی ہے، ایک شخص وہ ہے جو دروازہ پھلانگ کر صفِ اول میں جائے، یہ بے ادب نمازی ہے۔ تو جو شخص کوفہ کراس کر کے جائے تو یہ بے ادب ہے اور جو کوفہ سے ہو کر مدینہ جائے یہ باادب ہے۔

یہ تعلیم تو ہمیں احادیث سے ملی ہے کہ اول کوفہ جانا چاہیے۔ یہ باتیں سمجھاؤ! پھر دیکھو کہ عوام کیسے ساتھ ملتی ہے؟!

ہم عاشقِ مدینہ ہیں:

پھر سوال کرتے ہیں کہ جی امام بخاری رحمہ اللہ کتنے بڑے آدمی ہیں! آپ لوگ امام بخاری کی تقلید نہیں کرتے، امام ابو حنیفہ کی تقلید کرتے ہو، امیر المؤمنین فی الحدیث کو چھوڑ کر آپ نے امام اعظم ابو حنیفہ کی تقلید کی ہے۔

ہم نے کہا کہ ہم عاشقِ مدینہ ہیں اور عاشق کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے معشوق کے پاس جلدی پہنچے۔ امام بخاری سے کہیں کہ مدینہ جانا ہے، امام بخاری سٹاپ

24۔ المستدرک علی الصحیحین: ج4 ص96 رقم الحدیث 4693

بہت کرتے ہیں، مثلاً "وَبِهٖ قَالَ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ أَشْكَابَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ عَنْ عُمَارَةَ بْنِ الْقَعْقَاعِ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لو جی مدینہ آ گیا۔

اور جب امام ابو حنیفہ سے کہیں کہ مدینہ جانا ہے تو وہ کیا کہتے ہیں....

عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

دیکھو! فوراً سٹاپ آتا ہے۔ ہم نے کہا کہ امام بخاری کی رفتار بہت تھوڑی ہے، امام ابو حنیفہ نان سٹاپ چلتے ہیں۔ اس لیے ہم ان کے مقلد بنتے ہیں۔

اور یہ بات الگ ہے کہ علم حدیث امام بخاری کے پاس زیادہ تھا یا امام ابو حنیفہ کے پاس زیادہ تھا؟ یہ مستقل بحث ہے۔ حضرت امام صاحب نے اپنے بیٹے حماد کو وصیت کی ہے۔ وصایا میں انیسویں نمبر پر یہ وصیت ہے کہ میرا بیٹا! میرے پاس پانچ لاکھ احادیث ہیں، ان میں سے پانچ حدیثیں تجھے دے رہا ہوں، ان پر عمل کرنا![25]

پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ دی ہیں اپنے بیٹے کو تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ ان کے پاس تھوڑی احادیث تھیں! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

گدھے کی مثال:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي

25۔ کتاب الوصیۃ لابی حنیفۃ: ص78 رقم الوصیۃ 19

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾

اور فرمایا کہ ان یہود کی مثال ایسی ہے جیسے گدھا ہو اور اس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔ یہ ان کتابوں سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ "اسفار" سِفُر کی جمع ہے، سِفُر بڑی کتاب کو کہتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں گدھے پر لاد دو تو وہ عمل نہیں کرتا۔ اللہ ہمیں گدھا بننے سے محفوظ فرمائیں۔ جانوروں میں گدھا ایسا جانور ہے کہ جب حماقت میں مثال دینی ہو تو گدھے کی مثال دیتے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کی بات فرمائی ہے۔

اب یہاں ذرا حسنِ ترتیب کو دیکھیں کہ بہت عجیب ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا﴾ میں پہلے رسول کی بات کی ہے، اس کے بعد ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ میں صحابہ کی بات کی ہے، ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ میں پھر فقہاء مجتہدین کی بات کی ہے اور اس کے بعد ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ﴾ میں پھر گدھوں کی بات کی ہے۔ کیسی ترتیب اللہ نے قائم فرمائی! پہلے نبی، پھر صحابہ، پھر مجتہد اور بعد میں گدھے جو کتابیں اٹھا کر پھرتے ہیں اور بات سمجھتے نہیں ہیں۔ ان کی آواز بھی گدھے کی طرح ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ سب سے بدترین آواز گدھے کی ہے۔

گدھے پر بوجھ ہو تو ٹانگیں چوڑی ہو جاتی ہیں:

اور ہمارا واسطہ گدھوں سے پڑا ہے۔ میں بتایا کرتا ہوں کہ یہ گدھے کی علامت ہے کہ گدھے کی کمر پر پانچ من گندم رکھو تو وہ اٹھالے گا لیکن سر پر ایک چھٹانک کا کپڑا رکھو تو نہیں اٹھائے گا۔ یہ کمر پر بوجھ اٹھالیں گے اور جب سر پر جالی کی ٹوپی بھی رکھو گے تو یہ نہیں اٹھاسکتے! یہ گدھے کا کام ہے۔ عام حالت میں گدھا بالکل

صحیح کھڑا ہو گا اور جب آپ اس پر بوجھ لا دو گے تو اس کی ٹانگیں چوڑی ہو جائیں گی۔ یہ گدھے کی نشانی ہے۔ میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾﴾[26]

کہ وہ مومن کامیاب ہیں جو نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

اور خشوع والے کون ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

وَلَا یَرْفَعُوْنَ اَیْدِیَهُمْ فِی الصَّلَاةِ.[27]

کہ ترک رفع یدین والی نماز یہ خشوع والی ہے اور ترک رفع یدین نہ ہو تو پھر خشوع نہیں ہوتا۔ اور قرآن میں ہے:

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾[28]

تو ترک رفع الیدین خشوع ہے اور جہاں ترک رفع الیدین ختم ہو گیا تو نماز بھاری ہو گئی، بوجھ پڑا تو پھر فوراً ٹانگیں کھل جاتی ہیں۔ یہ گدھے کا کام ہے کہ جب تک کھڑا ہو ٹھیک ٹھاک ہوتا ہے اور جب اس پر بوجھ ڈالو تو اس کی ٹانگیں کھل جاتی ہیں، یہ بھی بالکل ٹھیک ٹھیک کھڑے ہوتے ہیں، جونہی بوجھ ڈالو فوراً ٹانگیں کھول دیتے ہیں۔

شیطان کے لیے محفوظ گزرگاہ:

اور پھر ان کے دماغ دیکھو اور استدلال دیکھو۔ جماعت کے ساتھ نماز ہو رہی ہے، ساتھ ساتھ نمازی ہیں۔ اب کہتے ہیں کہ پاؤں سے پاؤں ملاؤ! ٹانگیں کھلی کرو! میں نے کہا کہ بھائی! پاؤں سے پاؤں کیوں ملاتے ہو؟ کہتے ہیں کہ ہم پاؤں سے پاؤں ملاتے

26۔ المؤمنون 23:1،2

27۔ تفسیر ابن عباس: ص 212

28۔ البقرۃ 2:45

ہیں تاکہ شیطان درمیان میں نہ گزرے۔ میں نے کہا کہ پاؤں سے پاؤں چپکا کر نہ رکھو بلکہ درمیان میں جگہ رکھو تاکہ شیطان یہاں سے گزرے، اس کو یہاں سے جانے دو، لیکن یہ لوگ پاؤں سے پاؤں ملاتے ہیں اور ٹانگیں کھول دیتے ہیں تاکہ شیطان وہاں سے نہ آئے یہاں سے آئے، شیطان کو راستہ دینا ہے لیکن خطرناک راستہ دینا ہے۔ تو ہے نا گدھوں والا دماغ؟ حماقت ہے یا نہیں؟

سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٦ وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝٧﴾

یہود کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اللہ کے دوست ہیں۔ فرمایا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو تو دوست تو دوست سے ملنے کی بہت چاہت کرتا ہے، کیوں کہ "اَلْمَوْتُ جِسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ" [29] موت تو ایسا پل ہے کہ دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اللہ کے محبوب ہو تو پھر موت مانگو! لیکن یہ موت نہیں مانگتے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ یہ لوگ کبھی موت نہیں مانگیں گے، اس لیے کہ ان کو اپنے کرتوتوں کا پتا ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہونا ہے!

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک موت کی دعا مانگتا تو فوراً مر جاتا۔

29۔ التذکرہ للقرطبی: ص 13

جمعۃ المبارک:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۹﴾

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جانے کا اہتمام کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔

کعب بن لوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے پانچ سو ساٹھ سال قبل جمعہ شروع کیا تھا، وہ توحید پر تھے، جب جمعہ کا دن آتا تو لوگوں کو جمع کرتے، خطبہ دیتے اور اللہ کی توحید بیان کرتے تھے۔ انصارِ مدینہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے جمعہ کے دن کا اجتماع شروع کر دیا تھا۔ اللہ کو جمعہ کا اجتماع پسند تھا تو شریعت نے باضابطہ جمعہ کا دن دیا ہے۔

جمعہ کی دوسری اذان سنت ہے:

جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک اذان ہوتی تھی جو مؤذن خطبہ کے وقت امام کے سامنے کھڑے ہو کر دیتا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ایسے تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ایسے ہی معاملہ رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دوسری اذان شروع کروائی۔ ایک اذان تو امام کے سامنے ہوتی ہے یہ تو پہلے سے تھی اور ایک اذان اس سے پہلے والی حضرت عثمان نے شروع کروائی۔ دوسری اذان کا معنی یہ نہیں کہ امام کے منبر کے سامنے جو اذان دی جاتی ہے اس کے بعد والی اذان ہو، ایسا نہیں بلکہ دوسری کا معنی یہ

ہے کہ پہلے ایک اذان تھی اور اب دو اذانیں ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک اذان مقام زوراء پر دی جاتی جس کی آواز پورے مدینے میں پہنچتی تھی اور دوسری اذان سابقہ معمول کے مطابق منبر کے سامنے ہوتی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے:

أَنَّ التَّأْذِيْنَ الثَّانِيَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَمَرَ بِهٖ عُثْمَانُ حِيْنَ كَثُرَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ وَكَانَ التَّأْذِيْنُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ حِيْنَ يَجْلِسُ الْإِمَامُ.[30]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوسری اذان شروع فرمائی تھی اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہ کا اتفاق تھا کہ ٹھیک ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو بتایا تھا کہ اجماعِ صحابہ نبوت کی طرح معصوم ہوتا ہے۔

پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ میں دنیا میں نہیں ہوں گا "فَإِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ"[31]

تو پھر خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا۔

اذانِ اول کے بعد خرید و فروخت ممنوع ہے:

اور اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ یہ جو قرآن کریم میں ہے: ﴿إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ کہ جب جمعہ کے لیے بلایا جائے تو اس وقت تم کاروبار وغیرہ چھوڑ دو، اس سے مراد پہلی اذان ہے۔ پہلی اذان کے بعد یہاں تک لکھا ہے کہ عالم کو مطالعہ کرنا بھی چھوڑ دینا چاہیے، اب صرف اور صرف جمعہ کی تیاری ہو۔

30۔ صحیح البخاری، رقم:915

31۔ سنن ابی داؤد، رقم:4607

سعی الی الجمعہ کا اہتمام کیجیے!

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ اس پر میں اور آپ عمل کی کوشش کریں۔ اللہ کے لیے یوں نہ کریں کہ ہم علماء نے جب جمعہ پڑھانا ہو تو پھر جلدی آئیں اور جب جمعہ پڑھنا ہو تو پھر دیر سے آئیں۔ جمعہ سے متعلقہ چیزیں تو ہو سکتی ہیں مثلاً جمعہ کی تیاری ہے لیکن جو چیزیں جمعہ کی تیاری کے علاوہ ہیں اس سے ہم بچنے کی کوشش کریں۔ مجھے اور آپ کو اپنی کوتاہی پر توبہ کرنی چاہیے اور اس کا بھرپور اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾

"فَاسْعَوْا" کا معنی آپ نے دوڑنا نہیں کرنا کہ "دوڑو!" بلکہ "فَاسْعَوْا" کا معنی ہے کہ "اہتمام کرو"۔ جب جمعہ کی پہلی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف جانے کا اہتمام کرو!

سعی کا معنی ہمیشہ دوڑنا نہیں ہوتا۔ دیکھو! صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہوتی ہے تو اس کا معنی دوڑنا ہے؟ نہیں بلکہ اہتمام سے چلو۔ تھوڑی دوڑ تو مخصوص جگہ پر ہے، باقی کو اہتمام کے ساتھ کرو۔ تو سعی کا معنی ہمیشہ دوڑنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی اہتمام کرنا ہے۔

دیہات اور جمعہ کی ادائیگی:

﴿وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ شہر میں ہوتا ہے، "الْبَيْعَ" اس کی ایک دلیل ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چالیس شخص عاقل بالغ

ایک جگہ پر اکٹھے ہو جائیں تو جمعہ فرض ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ عاقل بالغ تو بے شک دو ہی ہوں جنہوں نے جمعہ پڑھنا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ شہر ہو یا قصبہ ہو، بازار ہو، قاضی ہو یہ جمعہ کی شرائط میں سے ہیں۔

اذانِ اول کے بعد کوئی بھی کام کریں تو یہ ممنوع ہے۔ جس طرح اذان اول کے بعد تجارت کرنی ٹھیک نہیں ہے اسی طرح کوئی اور کام بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن شہروں میں عموماً تجارت ہوتی ہے اس لیے لفظ "وَ ذَرُوا الْبَيْعَ" استعمال فرمایا۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھیں کہ یہاں لفظ "بیع" میں خریدنا بھی شامل ہے، صرف فروخت اس میں شامل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ خرید و فروخت کو چھوڑو اور جمعہ کی تیاری کرو۔

صحابہ کرام کے خطبہ چھوڑ کر جانے کی وجہ:

﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن جمعہ کے فرض کے بعد خطبہ دیتے تھے جیسے ہمارے ہاں عیدین کا خطبہ ہوتا ہے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض پڑھا لیے اور خطبہ دے رہے تھے کہ ندا آئی کہ قافلہ آگیا ہے۔ یہ قافلہ تھا دحیہ بن خلف کلبی کا۔ یہ قافلہ شام سے آیا تھا۔ ان کا قافلہ جب بھی آتا تو ضروریاتِ زندگی کا سارا سامان اس میں ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد تجارت کے لیے چلی گئی۔ کچھ رہ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سارے چلے جاتے تو مدینہ کی وادی آگ کے عذاب سے بھر جاتی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور سمجھایا گیا کہ جب کوئی تجارت ہو، کوئی مشغولیت کی چیز ہو تو خطبہ کو چھوڑ کر جانا جائز نہیں ہے۔ اللہ کے پاس جو چیز ہے وہ تجارت کی ان چیزوں سے بہتر ہے۔ تو تجارت کی وجہ سے دنیاوی اسباب پر بھروسہ نہ کرو بلکہ اللہ کی جو چیزیں ہیں وہ اس سے بہتر ہیں، ان پر اعتماد کرو۔

اب اس پر شبہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلے گئے تو یہ بہت بڑا گناہ تھا حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے، کیوں کہ خطبہ تھا جمعہ کے بعد اور ضروریاتِ زندگی کی ان کو ضرورت تھی۔ اب قافلہ آگیا اور آواز ایسی لگی کہ عورتوں اور مردوں کو جانا پڑا۔ عورتوں پر تو جمعہ فرض نہیں ہے اس لیے وہ چلی گئیں اور بعض ایسے تھے کہ جن کی اہلیہ چلی گئی اور شوہر یہاں پر ہے تو ضروریات زندگی تو دونوں کو معلوم ہوتی ہیں اس لیے وہ بھی چلے گئے اور ایسے موقع پر جب کچھ حضرات یہیں پر موجود ہیں اور کچھ چلے گئے ہیں تو اس طرف ذہن نہیں جاتا کہ ہم کو رہنا چاہیے تھا، بلکہ ذہن میں تھا کہ ہم جائیں گے تو ضرورت کی چیزیں ختم ہو جائیں گی۔

بسا اوقات انسان اپنا ایک اجتہاد کر لیتا ہے کہ میں جاؤں گا تو ضرورت کی چیزیں ختم ہو گئی ہوں گی تو مجھے ذرا دقت پیش آئے گی۔ اس لیے میں جا کر ضروری چیزیں حاصل کر لوں۔ یہ ایسے ہے جس طرح ہمارے ہاں جماعت کھڑی ہو اور بندہ کہے کہ میں تھوڑا سا کام کر لوں پھر جماعت میں پہنچوں گا، اسی دوران ایک رکعت چلی جاتی ہے۔ تو جس طرح اس بندے کا اجتہاد ہوتا ہے نا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی یہ اجتہاد تھا لیکن یہ چونکہ اللہ کو پسند نہیں آیا اس لیے اس پر تنبیہ آگئی ہے کہ ایسا نہ کیا کرو، عبادات کے وقت عبادات پر توجہ دیا کرو اور یہ کام تو بعد میں بھی ہو جائیں گے۔ یوں تنبیہ فرمائی۔

اس واقعے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے دینا شروع فرما دیا ورنہ پہلے فرض نماز پڑھی جاتی تھی اور بعد میں خطبہ ہوتا تھا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ المنافقون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ ۚ﴿۱﴾﴾

سورت کا شانِ نزول (مفصل واقعہ):

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا کہ قبیلہ بنو المصطلق کا سردار حارث بن ضرّار کچھ افراد کو لے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگی تیاری کر رہا ہے۔ یہ حارث بن ضرّار حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد تھے جو اس غزوہ کے بعد مسلمان ہوئیں اور ازواجِ مطہرات میں شامل ہوئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم خود پیش قدمی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر چل دیے۔ ساتھ منافق بھی چلے گئے تاکہ مالِ غنیمت میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بنو المصطلق کے مقام پر پہنچے تو وہاں ایک کنواں یا چشمہ تھا، جس کا نام تھا مریسیع، وہاں پر پڑاؤ ڈالا۔ اس لیے اس کو غزوہ بنو المصطلق بھی کہتے ہیں اور غزوہ مریسیع بھی کہتے ہیں۔ خیر وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے۔ حارث بن ضرار اپنا لشکر لے کر پہنچا۔ فریقین نے صفیں درست کیں اور دونوں نے

تیروں سے ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ اس میں بنو المصطلق کے کئی افراد مارے گئے اور اللہ نے فتح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔

لیکن یہاں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا کہ ابھی مریسیع کے کنویں پر ہی تھے، انصار اور مہاجرین صحابہ موجود تھے۔ ایک انصاری اور مہاجر میں تھوڑی سی بات پر تکرار ہوئی اور نوبت جھگڑے تک پہنچ گئی۔ مہاجر صحابی کا نام تھا جہجاہ اور انصاری صحابی کا نام تھا سنان بن وبرہ جہنی رضی اللہ عنہما۔ انصاری نے انصار کو بلایا اور مہاجر نے مہاجرین کو بلایا۔ قریب تھا کہ کوئی بڑا فتنہ کھڑا ہو جاتا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ سب کو جمع کیا اور فرمایا: ''مَابَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟'' کہ یہ کیا جاہلیت کی آوازیں ابھی سے اٹھ رہی ہیں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سمجھایا کہ مسلمان کو چاہیے کہ ظالم اور مظلوم کی مدد کرے، مظلوم کی مدد اس طرح کہ اس سے ظلم کو روکے اور ظالم کی مدد اس طرح کہ ظالم کا ہاتھ ظلم سے روک دے تاکہ وہ جہنم میں نہ چلا جائے۔ خیر صحابہ رضی اللہ عنہ میں صلح ہو گئی۔

عبد اللہ ابن ابی کی ہرزہ سرائی:

عبد اللہ ابن ابی ابن سلول منافق کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے اس موقع کو اپنے لیے نہایت غنیمت جانا کہ اب مسلمانوں کو لڑانے کا خوب موقع ہے۔ لشکر ابھی مریسیع کے مقام پر ہی تھا تو عبد اللہ بن ابی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک جگہ پر بیٹھا تھا۔ اتفاق سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی وہاں پر تھے۔ یہ صحابی تھے اور عمر اِن کی تھوڑی تھی، یہ بھی ساتھ بیٹھے تھے تو عبد اللہ بن ابی نے فتنے کی آگ کو بھڑکانے کے لیے کہا کہ دیکھو! تم نے مہاجرین کو سر پر چڑھا دیا ہے، پہلے تم نے ان کو کھانے کھلائے ہیں، اب یہ ہمارے سر پر چڑھتے ہیں، ہر بات پر ہمیں ڈانٹتے ہیں، ہمیں

لے کر جنگوں میں نکلتے ہیں، ایک تو ان کا نان ونفقہ ختم کر دو یہ خود تنگ ہو کر چھوڑ کر چلے جائیں گے، باقی جب ہم عزت والے واپس جائیں گے تو ان ذلیل لوگوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو جاکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھ کر کہ زید بن ارقم ابھی چھوٹے ہیں، ممکن ہے ان کو غلط فہمی ہو گئی ہو ان سے پوچھا: کیا تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ عرض کیا: نہیں حضور، میں نے خود سنا ہے۔ فرمایا: دیکھ لو۔ کہا کہ حضور میں نے سنا ہے اور مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔

یہ بات لشکر میں پھیلی کہ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی نے یہ بات کی ہے تو چونکہ عبد اللہ بن ابی قبیلہ خزرج کا معزز آدمی سمجھا جاتا تھا تو اس کے بارے میں لوگوں نے کہا کہ نہیں وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے ایسی بات کی ہے؟ اس نے کہا: حضور! یہ بالکل جھوٹ ہے، میں نے تو ایسی بات نہیں کہی اور قسمیں کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلایا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی بات سن کر اس کا عذر قبول فرمایا لیا۔ اب لوگ حضرت زید بن ارقم کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے ایک سردار کے بارے میں ایسی بات کہی ہے، اس پر تہمت لگائی ہے اور اس کے ساتھ قطع رحمی کا معاملہ کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا پتا چلا تو حضرت عمر نے کہا کہ حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں عبد اللہ بن ابی کا سر قلم کروں! اس کو جرأت کیسے ہوئی بات کرنے کی؟! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں عمر! ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے بندوں کو مارتا ہے، پھر ایک نیا پروپیگنڈا شروع ہو جائے گا۔

عبد اللہ بن ابی بن سلول منافق کے بیٹے حضرت عبد اللہ مسلمان تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے

اجازت دیں میں اپنے باپ کا سر قلم کر کے لاتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اور میرے باپ کا سر قلم کرے گا تو ممکن ہے کہ وہ میرے سامنے آئے گا تو مجھے تکلیف ہو گی اور پھر میں اس کو قتل کر بیٹھوں گا اور جہنم میں جاؤں گا، مجھے اجازت دیجیے، میں اپنے باپ کا سر خود قلم کرتا ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی منع فرما دیا۔

غزوہ سے فارغ ہوئے۔ جب واپس آنے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافِ معمول پورا دن سفر کیا، پوری رات سفر کیا اور اگلے دن پھر سفر کیا۔ جب دوپہر کا وقت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ آرام کیا۔ اس کا مقصد مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ یہ اپنے قبیلہ کا بڑا آدمی ہے، ایک افواہ پھیل گئی ہے، اگر یہ افواہ سچی ہے تو مسئلہ اور اگر جھوٹی ہے تو بھی مسئلہ کیونکہ ایک انتشار کا خدشہ تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل سفر کر کے لشکر کو تھکانا شروع کیا تاکہ اس بات سے توجہ ہٹ جائے۔

دوران سفر جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عبد اللہ بن ابی کے بارے میں کوئی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں تو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی کو نصیحت کی کہ دیکھو! تم نے بات کی ہے، بہتر ہے کہ غلطی کا اعتراف کر لو ورنہ وحی آئے گی تو تم پریشان ہو جاؤ گے لیکن عبد اللہ بن ابی نے یہ بات سن کر منہ پھیر لیا۔ حضرت عبادہ بن صامت فرمانے لگے کہ مجھے لگتا ہے کہ تو جس طرح تو منہ پھیر رہا ہے تو ضرور تیرے بارے میں قرآن اترے گا۔

جب راستے میں تھے تو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ میں سامنے جاؤں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کروں۔ اس لیے وہ قریب ہوتے، پھر پیچھے ہٹتے، قریب ہوتے، پھر پیچھے ہٹتے۔ تھوڑا سفر آگے ہوا تو حضرت زید بن ارقم

رضی اللہ عنہ کا گھوڑا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل ساتھ چل رہا تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بہت منتظر تھا کہ کوئی وحی آئے اور میرے بارے میں صفائی ہو ورنہ میں تو بدنام ہو جاؤں گا۔

حضرت زید بن ارقم فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر پسینہ آگیا، سانس پھولنا شروع ہوا اور سواری پر بوجھ پڑنا شروع ہوا تو میں سمجھ گیا کہ وحی آرہی ہے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو چونکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی تھا سواری پر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت میرا کان پکڑا اور فرمایا: اے بچے! جو تم نے بات کی تھی وہ ٹھیک ہے، اللہ نے تمہاری تصدیق کر دی ہے اور سورت المنافقون نازل ہو گئی ہے۔ یوں عبد اللہ بن ابی کے بارے میں بات کھل گئی۔

جب یہ لشکر مدینہ میں داخل ہونے لگا تو عبد اللہ بن ابی منافق کے بیٹے حضرت عبد اللہ صحابی نے اپنے باپ کی سواری کو روک لیا اور پاؤں سواری کے گھٹنے پر رکھ کر بٹھا لیا۔ انہوں نے کہا کہ تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ تو نے کہا تھا کہ میں مدینہ میں داخل ہوں گا تو عزت والے ذلت والوں کو نکال دیں گے! تو بتا کہ تو نے کس کو ذلت والا کہا اور کس کو عزت والا کہا؟ عزت والا تو ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ ابا! تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں! اس وقت عبد اللہ بن ابی نے کہا کہ میں تو عورتوں اور بچوں سے بھی زیادہ ذلیل ہو گیا ہوں۔ مطلب کہ میرا اپنا بیٹا میرے مقابلے میں اتر آیا ہے۔ پیچھے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری آئی۔ فرمایا: کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے باپ کو چھوڑ دو! انہوں نے پھر اسے مدینہ میں داخل ہونے دیا۔ تو یہ سورت اس سفر میں نازل ہوئی۔

منافقین کی دروغ گوئی:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾﴾

یہ منافق کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ منافق لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

جھوٹ بولنے سے مراد کیا ہے؟ کہ منافق کہتے ہیں کہ ہم دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مانتے ہیں۔ فرمایا کہ تم دل سے نہیں مانتے بلکہ محض زبان سے کہتے ہو، تمہارے یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں۔

﴿اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾

یہ لوگ دو کام کرتے تھے:

1: ایک تو جھوٹی قسمیں کھاتے تھے اپنی جان اور مال کو بچانے کے لیے۔

2: لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔

﴿اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ یہ ان کا لازمی جرم تھا اور ﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یہ ان کا متعدی جرم تھا۔ ایک جرم ان کی ذات کی حد تک تھا کہ جھوٹ بولتے تھے اور دوسرا جرم یہ کہ یہ لوگوں کو دین سے روکتے تھے، یہ ان کا متعدی جرم تھا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾﴾

تمہارے سامنے کلمہ پڑھتے ہیں اور جب اپنے بندوں کے پاس جاتے ہیں تو

پھر زبان سے کفر بکتے ہیں۔ ان کے بار بار جرم کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بات کو سمجھتے نہیں۔

﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴﴾

منافقین کے ظاہر کو دیکھو تو بڑے بڑے ان کے جسم ہیں لیکن جب ان کی باتیں سنو تو ایسے لگتے ہیں کہ جیسے یہ لکڑیاں ہیں جو سہارے پر کھڑی ہوئی ہیں، یہ ڈرپوک اور بزدل قسم کے لوگ ہیں۔ جسم دیکھو تو بڑے بڑے اور جب باتیں دیکھو تو اتنے بزدل لوگ ہیں۔ ان کو ہر وقت خدشہ رہتا تھا یعنی جب بھی کہیں سے تھوڑی سی بھی آواز آئی گھوڑوں کی تو منافق سمجھتے تھے ہمارے بارے میں وحی آگئی ہے ہمارا پتہ چل گیا ہے اب ہماری خیر نہیں ہے۔ ہر چیخ و پکار کو سمجھتے ہیں کہ ہمارے اوپر کوئی آفت آنے لگی ہے، یہ تمہارے دشمن ہیں، بچو ان سے۔ اللہ ان کو برباد کرے۔ یہ لوگ کہاں پھرے جاتے ہیں!

عبد اللہ ابن ابی کا متکبرانہ رویہ:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۵﴾

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی بن سلول سے کہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے جاؤ اور جا کر معافی مانگ لو۔ اس نے کہا تھا کہ تمہارے کہنے پر کلمہ بھی پڑھا ہے، تمہارے کہنے پر زکوٰۃ بھی دیتا ہوں، اب حضور کو سجدہ رہ گیا ہے وہ میں کر لیتا ہوں، آخر تم کیا چاہتے ہو مجھ سے ؟!

فرمایا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ! رسول اللہ تمہارے لیے مغفرت کی دعا کریں تو یہ لوگ اپنے سروں کو جھٹکنے لگتے ہیں، آپ ان کو دیکھیں کہ یہ کیسے تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں۔

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

اے میرے پیغمبر! آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں ان کے لیے برابر ہے، اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا! اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۗ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾

یہی منافق لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے ساتھ ہیں ان پر مال خرچ نہ کرو تاکہ یہ لوگ چلے جائیں۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں کے سارے خزانوں کا مالک اللہ ہے لیکن منافق لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے!

﴿يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۗ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

یہ منافق کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ میں پہنچیں گے تو عزت والے لوگ ذلت والوں کو باہر نکال دیں گے حالانکہ عزت بالذات اللہ کے لیے ہے، اللہ کے واسطہ سے پیغمبر کے لیے ہے، پھر پیغمبر کے دین پر عمل کریں گے تو مومنین کے لیے ہے لیکن منافق اس بات کو نہیں سمجھتے نہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝﴾

یہاں مسلمانوں کو ترغیب ہے کہ مال اور اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے، جو ایسا کرے گا نقصان اٹھائے گا۔

﴿وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾﴾

موت آنے سے پہلے پہلے صدقات واجبہ ادا کرو ورنہ موت آئے گی تو بندہ کہے گا کہ اے کاش! مجھے تھوڑا سا وقت مل جائے کہ میں صدقہ کروں اور نیک ہو جاؤں!

﴿وَ لَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ وَ اللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾

جب موت کا وقت آئے گا تو مہلت نہیں ملتی۔ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ التغابن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ لَہُ الۡمُلۡکُ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱﴾﴾

پانچ مسبحات:

میں نے بتایا تھا کہ پانچ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے۔ انہیں مُسَبِّحات کہتے ہیں۔ ان میں سے چار سورتیں سورت حدید، سورت حشر، سورت صف اور سورت جمعہ تو گزر چکی ہیں، یہ آخری سورت ہے سورت تغابن۔

فرمایا: جو چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ اللہ ہی کی بادشاہت ہے اور تمام تعریفیں بھی اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تخلیقاتِ باری تعالیٰ:

﴿ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲﴾﴾

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ تم سب اللہ کی عبادت کرتے لیکن تم نے کیا کیا؟ بعض کافر ہو گئے اور بعض مؤمن ہو گئے۔ تو

تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ سب کو چاہیے کہ اللہ کو مانیں۔ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ تمہارے ان اعمال کو بھی جانتا ہے جو ایمان والے ہیں اور ان اعمال کو بھی جانتا ہے جو کفریہ ہیں۔

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳﴾

اللہ رب العزت نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا فرمایا۔ اللہ نے تمہیں صورتیں دی ہیں اور بہت بہترین صورتیں تمہیں عطا کی ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

"بِالْحَقِّ" حق سے مراد ہے حکمت اور منفعت یعنی حکمت کے ساتھ اور نفع کے ساتھ پیدا فرمایا۔ اللہ کی تخلیق نہ نفع کے بغیر ہے اور نہ حکمت کے بغیر۔

﴿فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ جتنی بھی صورتیں پیدا کی ہیں سب سے بہترین صورت انسان کو دی ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ کہ دنیا میں جتنی شکلیں اللہ نے بنائی ہیں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت شکل انسان کو عطا فرمائی ہے۔

﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴﴾

جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اللہ اسے جانتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو اللہ اس کو بھی جانتا ہے۔ اللہ دلوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔

منکرین کا انجام:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾

کیا تمہارے پاس ان کافروں کے حالات نہیں پہنچے جو پہلے گزر چکے ہیں، انہوں نے اپنے کرتوتوں کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۶﴾﴾

ان کے انکار اور اس پر عذاب کی وجہ یہ بنی کہ ان کے پاس جب رسول واضح دلائل لے کر آتے تو یہ ان سے کہتے کہ کیا بشر ہی ہمیں ہدایت کی راہ دکھائیں گے؟ اس لیے انہوں نے کفر اختیار کیا اور منہ موڑا تو اللہ نے بھی شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ بے نیاز اور لائق تعریف ذات ہے۔

﴿اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا﴾ میں اس پر پہلے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ان کی رائے یہ تھی کہ بشر نبی نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے آج بھی بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہوتا۔ ذہن دونوں کا ایک ہے کہ بشریت نبوت کے منافی ہے۔ اُنہوں نے دیکھا تو نبی نہیں مانا اور اِنہوں نے نہیں دیکھا تو نبی مانا مگر بشر نہیں مانا۔ بشر لفظاً مفرد ہے لیکن معناً جمع ہے، اس لیے آگے "يَّهْدُوْنَنَا" یہ جمع ہے معنی کی رعایت کرتے ہوئے۔

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷﴾﴾

کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن نہیں اٹھایا جائے گا۔ اے پیغمبر! آپ فرمائیں کہ نہیں، اللہ تمہیں ضرور اٹھائے گا۔ پھر تمہیں تمہارے بارے میں بتائے گا۔ اللہ پر یہ بہت آسان ہے۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

خَبِيْرٌ﴿۸﴾

اس لیے اللہ پر ایمان لاؤ، اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس نور پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا۔ یہاں نور سے مراد قرآن کریم ہے۔

مؤمنین کا انجام:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴿۹﴾﴾

جس دن اللہ تمہیں جمع کریں گے وہ بڑا خسارے کا دن ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو اللہ ان کے گناہ معاف فرمائیں گے اور انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جنتی ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ﴿۱۰﴾﴾

اللہ جنتیوں کا تذکرہ فرماتے ہیں تو جہنمیوں کا ذکر بھی فرماتے ہیں۔ فرمایا: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو یہ لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

تکالیف آنے کی وجوہات:

﴿مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾

دنیا میں جو بھی تکلیف آتی ہے وہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی، اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ چاہتے ہیں کہ بندے کو تکلیف ہو بلکہ اس کا معنی یہ ہے

کہ انسان اسباب تکلیف جمع کر بھی لے لیکن اللہ نہ چاہیں تو تکلیف نہیں آسکتی۔

عموماً مصیبت آتی ہے گناہ کی وجہ سے۔ کبھی بندہ گناہ کرتا ہے تو گناہ کی وجہ سے تکلیف آجاتی ہے، کبھی تکلیف آتی ہے بندے کے گناہ کے کفارے کی وجہ سے کہ تکلیف آتی ہے تو بندے کے کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے اور کبھی تکلیف بغیر کسی گناہ کے رفعِ درجات کے لیے آتی ہے۔

دنیا میں انسان کو جو بھی مصیبت آئے تو اگر دیکھنا ہو کہ یہ کفارہ ہے یا یہ عذاب ہے یا رفع درجات کا ذریعہ ہے؟ تو یہ دیکھیں کہ اگر تکلیف کے آنے سے پہلے گناہ سے بچتا تھا اور تکلیف کے بعد بھی بچتا ہے تو یہ تکلیف رفع درجات کے لیے ہے۔ اگر پہلے گناہوں سے نہیں بچتا تھا لیکن تکلیف کے بعد بچنا شروع ہو گیا ہے تو یہ تکلیف کفارہ سیئات کے لیے ہے اور اگر پہلے بھی گناہ کرتا تھا اور تکلیف کے بعد بھی گناہ کرتا ہے تو یہ تکلیف اس کے حق میں عذاب ہے، راحت کا ذریعہ نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾﴾

جو اللہ کو مانتا ہے، اللہ اس کے دل کو صبر اور رضا کی توفیق دیتے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتے ہیں۔

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۲﴾﴾

اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم نے منہ موڑا تو یاد رکھو ہمارے پیغمبر کی ذمہ داری صرف پہنچانا ہے۔ انکار کا وبال اور اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾

اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ مومنین کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

”بیوی اور اولاد دشمن ہیں“ کا مفہوم

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾

اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولادیں تمہارے دین کی دشمن ہیں، اس لیے تم ان سے احتیاط کرو۔

یہ آیتِ کریمہ کس موقع پر نازل ہوئی ہے؟ بعض کہتے ہیں فلاں خاص صحابی کے بارے میں ہے کہ وہ جہاد پر جانا چاہتے تو کبھی بیوی رکاوٹ بنتی، کبھی اولاد رکاوٹ بنتی کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جائیں گے تو ہمارے پاس کون ہو گا؟ ان کی بات سن کر وہ رک جاتے۔ عوف بن مالک الاشجعی ان کا نام تھا۔ یہ بات ان کے بارے میں ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ آیات ان صحابہ کرام کے بارے میں ہے جو مکہ مکرمہ میں تھے، مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت جو شخص مکہ میں مسلمان ہوتا تو اس کے لیے ہجرت کرنا فرض تھا۔ اس کے ذمہ تھا کہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آئے۔ بعض اپنے گھر والوں کی وجہ سے مکہ نہیں چھوڑ سکے تو فرمایا کہ یہ تمہارے دین کے دشمن ہیں، ان سے بچو۔

﴿وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

اور اگر تم ان کو معاف کر دو۔ مثلاً اگر بیوی سے خطا ہو جائے اور تم سے معافی مانگے تو معاف کر دو، ”وَ تَصْفَحُوْا“ اور تم در گزر کرو! در گزر کا معنی کہ جب معافی دے دی ہے تو بار بار ملامت نہ کرو، اس کے جرم کو بار بار مت ذکر کرو۔ ”وَ تَغْفِرُوْا“ اور تم ان کو بخش دو۔ بخش دینے کا معنی کہ اب دل سے بھی نکال دو۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے ہیں، رحم کرنے والے ہیں۔

﴿اِنَّمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۵﴾﴾

تمہارے اموال اور تمہاری اولاد امتحان ہیں اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ﴾

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم تھا کہ تقویٰ اختیار کرو۔ ان کو شبہ ہوتا کہ ہم تقویٰ اختیار کیسے کریں؟! ہم انسان ہیں اس لیے کبھی گناہ ہو جائیں گے، کبھی نیک عمل چھوٹ جائے گا، کبھی اللہ کے حکم پر عمل نہیں ہو گا۔ فرمایا: ”مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ“ تم اتنا کرو جتنا تمہارے بس میں ہے، پھر بھی کمی ہو جائے تو اللہ معاف فرمائیں گے۔ بات کو سنو، عمل کرو اور کچھ اللہ کی راہ میں صدقہ دو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

﴿وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾

اور جو بندہ بخل سے بچ گیا تو یہ انسان یقیناً کامیاب ہو جائے گا۔

﴿اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۷﴾ۙ﴾

اگر تم اللہ کو قرض دو اخلاص کے ساتھ، یہ صورت قرض کی ہے لیکن درحقیقت صدقہ ہے، تو اللہ تعالی اسے بڑھا کر تمہیں دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف بھی کرے گا۔ ”وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ“ اللہ قدر کرتے ہیں تو نیک اعمال قبول فرما لیتے ہیں، ”حَلِيۡمٌ“ اللہ بردبار ہیں کہ اگر بندہ گناہ کرے تو سزا فوراً نہیں دیتے، توبہ کا موقع دیتے ہیں، پھر بھی بندہ توبہ نہ کرے تو اس سزا کو آخرت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔

﴿عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۸﴾﴾

اللہ ظاہر اور باطن سب کو جانتے ہیں۔ غالب ہیں، حکمت والے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ.

سورۃ الطلاق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّۃَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمۡ ۚ﴾

سورۃ الطلاق کو بعض روایات میں سورۃ النساء الصغریٰ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں تمام تر احکام عورتوں کے متعلق ہیں۔

”یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ“ اور ”یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوۡلُ“ کہنے میں فرق:

﴿یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ﴾.... قرآن کریم میں اللہ رب العزت کبھی ”یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ“ فرماتے ہیں اور کبھی ”یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوۡلُ“ فرماتے ہیں۔ جب ”یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوۡلُ“ فرمائیں تو اس وقت خاص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرنا ہوتا ہے اور جب ”یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ“ فرمائیں تو خطاب نبی کو ہوتا ہے لیکن احکام امت کو سنانے مقصود ہوتے ہیں۔

طلاق کے متعلق چند احکام:

﴿اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ﴾.... یہاں سوال یہ ہے کہ جب ﴿یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ﴾ فرمایا تو بظاہر یہ تھا ”اِذَا طَلَّقۡتَ“ یعنی واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں واحد نہیں

بلکہ جمع کا صیغہ "طَلَّقْتُمْ" لائے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا ایک جواب تو میں نے ویسے ہی ذکر کیا کہ چونکہ مقصود امت کو احکام بتانے تھے اس لیے "اِذَا طَلَّقْتُمْ" جمع کا صیغہ فرمایا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں لفظ "قُلْ" محذوف ہے، عبارت یوں ہو گی: "یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ (قُلْ) اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ" کہ آپ ایمان والو کو بتائیں کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو۔

﴿النِّسَآءَ﴾.... یہاں نساء سے مراد وہ عورت ہے جس کے ساتھ خلوت صحیحہ ہو چکی ہو اور اگر خلوت صحیحہ نہ ہو تو اس کے لیے عدت ہے ہی نہیں۔ عورت کو طلاق ہو جائے اور خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو تو اس عورت کی عدت نہیں ہوتی۔ خاوند جب طلاق دے تو فوراً فارغ ہو جاتی ہے۔ خلوت صحیحہ کا معنی ہوتا ہے کہ ایسی بند جگہ ہو جہاں اگر شوہر اپنی بیوی سے ہمبستری کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ تو اس خلوت صحیحہ کو مباشرت کے قائم مقام قرار دے دیا جاتا ہے۔

﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾.... ان عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو کہ عدت گزارنا ان کے لیے آسان ہو یعنی حالتِ طہر میں طلاق دو۔ جب ان کو طلاق دے دو اور عدت شروع ہو جائے تو عدت کو شمار بھی کیا کرو! عدت کا خیال عورت کو بھی کرنا چاہیے اور مرد کو بھی کرنا چاہیے لیکن خطاب مردوں کو فرمایا ہے کہ مرد اس کا اہتمام کریں۔

عورت عدت کہاں گزارے؟

﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُیُوْتِهِنَّ وَ لَا یَخْرُجْنَ﴾

جب عورت کو طلاق ہو جائے تو عورت عدت کے دوران مرد کے گھر رہنے

کی پابند ہے، اس کا سکنیٰ مرد کے ذمے ہے، نفقہ مرد کے ذمے ہے، کھانا پینا اور رہائش بھی مرد کے ذمے ہے۔ یہ حقِ شوہر نہیں ہے بلکہ یہ حقِ شرع ہے۔ کیا مطلب ؟ کہ ایک تو مرد اس کو گھر سے نکالے مت۔ دوسرا اگر مرد راضی بھی ہو کہ عورت کہے میں جانا چاہتی ہوں پھر بھی جانا جائز نہیں ہے۔ یہ شرع کا حق ہے، مرد کا حق نہیں ہے۔ اس لیے بلاوجہ عورتوں کے لیے ان کے گھروں سے خود بھی نکلنا جائز نہیں ہے اور مردوں کے لیے نکالنا بھی جائز نہیں ہے۔ دونوں حکم آ گئے۔

﴿بُيُوْتِهِنَّ﴾.... یہاں ''بیوت'' کی نسبت عورت کی طرف کی ہے حالانکہ ''بیوت'' کا مالک مرد ہے عورت نہیں ہے، اس میں عورت کا اعزاز بیان کیا ہے کہ جو تم نے عورت کو رہنے کے لیے گھر دیا ہے اس گھر سے عورت کو مت نکالو اور قرآن کریم میں تمام مقامات میں ''بیت'' کی نسبت عورت کی طرف کی ہے۔ ایک مقام پہ فرمایا:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾[32]

یہاں بھی بیت کی نسبت عورت کی طرف ہے۔

ہاں ایک مقام ایسا ہے کہ جہاں عورت گناہ کرتی ہے تو گھر کی نسبت عورت کی طرف نہیں رہتی۔ سورۃ النساء میں ہے:

﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ﴾[33]

اب یہاں یہ نہیں فرمایا کہ '' فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِيْ بُيُوْتِهِنَّ '' کیونکہ جب

32۔ الاحزاب 34:33

33۔ النساء 15:4

عورت نے گناہ کر لیا اور گناہ پر گواہ مکمل ہو گئے تو اب اس کا گھر ختم ہو گیا۔ اب اس نے سزا کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہے۔ اس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے:

ان صورتوں میں خاوند کے گھر سے نکل سکتی ہے:

﴿وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ﴾

نہ تم ان کو گھروں سے نکالو اور نہ یہ عورتیں خود نکلیں۔ یہ نہیں کہ شوہر راضی ہے تو چلی جائے۔ شوہر اگر جانے کے لیے راضی ہے پھر بھی ان کے لیے جانا جائز نہیں ہے بغیر کسی عذر شرعی کے۔ ہاں البتہ کچھ صورتوں میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے، تم اس کو نکال سکتے ہو جب یہ عورت کسی فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کرے۔

- فاحشہ مبینہ سے مراد کہ زنا کر لے اور گواہی سے ثابت بھی ہو جائے تو اب حد لگانے کے لیے اس کو گھر سے نکالو!
- ایک صورت فاحشہ مبینہ کی یہ بھی ہے کہ عورت زبان دراز بہت ہے، اس کے ساتھ رہنا بس میں نہیں ہے تو بھی نکال سکتے ہو۔
- اور تیسری صورت فاحشہ مبینہ کی یہ ہے کہ عورت خود گھر سے بھاگ کر نکل جائے۔ اب جانے دو اس کو۔

﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ﴾

یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو شریعت کا نقصان نہیں بلکہ یہ اپنا نقصان کرے گا۔

﴿لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝۱﴾

جب تم شریعت کا خیال کرو گے، حدود اللہ کا خیال کرو گے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی بہترین صورت پیدا فرما دیں۔

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾

جب یہ عورتیں عدت کے قریب ہو جائیں اب چاہو تو ان کو چھوڑ دو یعنی رجوع نہ کرو اور چاہو تو روک لو یعنی رجوع کر لو۔ دونوں صورتیں ٹھیک ہیں۔ اس پر تمہیں دو گواہ بنا لینے چاہییں اور شہادت کا بہت زیادہ خیال کرو۔ اللہ اس کے ذریعے نصیحت کرتے ہیں اس آدمی کو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتا ہے۔

گواہ بنانا مستحب ہے، واجب نہیں۔ گواہ کیوں بنانے چاہییں؟ ہو سکتا ہے کہ شوہر رجوع نہ کرے اور عورت کہہ دے کہ اس نے رجوع کیا تھا، اسی طرح اگر مرد نے رجوع نہ کیا ہو اور عدت پوری ہو جائے، اب عورت اس کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں کرنا چاہتی جبکہ شوہر کہتا ہے کہ نکاح کی تو ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے تو رجوع کیا تھا... تو دونوں طرف سے خدشہ ہے، اس لیے یہاں پر گواہ بنا لینے چاہییں۔

تقویٰ پر ملنے والے انعامات:

﴿وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾﴾

اس سورت میں اللہ رب العزت نے تقویٰ پر پانچ انعامات کا ذکر فرمایا ہے:

[1]: ”وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا“ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے مصائب سے نکلنے کا راستہ بنا دیتے ہیں۔

[2]: ”وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ“ اللہ اس کو بے گمان روزی عطا فرما دیتے ہیں۔

[3]: ”وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا“ اللہ ان کے لیے تمام امور میں

آسانیاں پیدا فرمادیتے ہیں۔

[4]: ”وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ“ اور جو تقویٰ اختیار کرے اللہ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں۔

[5]: ”وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا“ اللہ اس کو اجر عطا فرمادیتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر سورت انفال میں فرمایا:

﴿اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾[34]

جب تم تقویٰ اختیار کروگے تو اللہ حق اور باطل کے درمیان امتیاز عطا فرما دیتے ہیں کہ حق اور باطل میں فرق کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

یہ عجیب اللہ کی نعمت ہے کہ حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا معلوم ہو جائے اور باطل کے وار سمجھ میں آجائیں۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ باطل ایسا وار کرتا ہے کہ بندہ اس کا وار سمجھتا نہیں ہے کہ باطل چاہتا کیا ہے! لیکن تقویٰ ایسی بڑی نعمت ہے کہ اللہ اس کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنا سمجھا دیتا ہے اور یہ بات گناہوں کی آلودگی میں سمجھ نہیں آتی۔ اللہ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝۳﴾

جو اللہ پر توکل کرے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے اور اللہ جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ کر کے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنے علم کے مطابق متعین کر رکھا ہے۔

”توکل“ اور چیز ہے اور ”تعطل“ اور چیز ہے۔ اسباب اختیار کیے بغیر اللہ پر بھروسہ کرنا یہ تعطل ہے اور اسباب اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرنا یہ توکل ہے۔ ہم

34۔ الانفال 29:8

تعطل کے پابند نہیں ہیں بلکہ ہم توکل کے پابند ہیں۔

جن کو حیض نہیں آتا ان کی عدت:

﴿وَ الّٰٓـِٔیۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشۡہُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ﴾

یہاں ان عورتوں کی عدت بتائی ہے کہ جن کو حیض نہیں آتا بڑھاپے کی وجہ سے یا بچپن کی وجہ سے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اس میں حیض اور طہر کا کوئی دخل نہیں ہے۔

حاملہ کی عدت:

﴿وَ اُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُہُنَّ اَنۡ یَّضَعۡنَ حَمۡلَہُنَّ ؕ﴾

اور وہ عورت جو حاملہ ہے اس کی عدت وضعِ حمل ہے۔ جب بچہ پیدا ہو جائے تو عدت ختم۔ کسی عورت کو خاوند نے طلاق دی اور بچے کی پیدائش میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ آدھے گھنٹے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس عورت کی عدت فوراً ختم ہو جائے گی۔

﴿اَسۡکِنُوۡہُنَّ مِنۡ حَیۡثُ سَکَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِکُمۡ﴾

اپنی حیثیت کے مطابق سکنیٰ دو! عورت اگر مالدار ہو اور شوہر غریب ہو تو شوہر کے ذمے مالداروں والا سکنیٰ اور رہائش نہیں ہے بلکہ اس کے ذمہ غریبوں والی رہائش ہے اور اگر عورت غریب ہو اور شوہر مالدار ہو تو پھر شوہر کی حیثیت کے مطابق امیروں والا سکنیٰ اور امیروں والا نفقہ دینا ضروری ہے۔ اب شوہر کی حیثیت کا خیال کیا ہے۔

﴿وَ لَا تُضَآرُّوۡہُنَّ لِتُضَیِّقُوۡا عَلَیۡہِنَّ ؕ﴾

عورتوں کو تنگ نہ کرو تکلیف دینے کے لیے کہ تم ان کو طلاق دو حیض میں

اس وجہ سے ان کی عدت لمبی ہو جائے گی، ایسا نہ کرو! تین طلاق اکٹھی بھی نہ دو! تم نے اس کو طلاق دے دی ہے اور جب آخری حیض آتا ہے تو پھر رجوع کر لیتے ہو، اس کے بعد پھر طلاق دیتے ہو، ایسا نہ کیا کرو!

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

یعنی وہ عورت جس کو طلاق بائنہ ہو، طلاق مغلظہ ہو، طلاق رجعی ہو... کسی قسم کی طلاق ہو، کسی بھی قسم کی عدت ہو، اس کا نفقہ اور سکنٰی شوہر کے ذمے ہے۔

بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ:

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾

اگر عورت حاملہ ہو اور بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کی عدت تو ختم ہو گئی لیکن یاد رکھنا اگر عورت کو طلاق ہو اور عورت عدت میں ہو تو اس صورت میں شوہر کے بچے کو دودھ پلانا اس عورت کے ذمہ ہے، اس دودھ پلانے پر شوہر سے پیسے لینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ جب تک عورت عدت میں ہے اس کا نفقہ اور سکنی شوہر کے ذمہ ہے، اب پیسے کس بات کے لے گی ؟! لیکن جب عورت کی عدت پوری ہو جائے تو اب دودھ پر پیسے لینا چاہے تو لے سکتی ہے۔ اب شوہر کتنے پیسے دے گا؟ تو جتنے عام معمول کے مطابق چلتے ہیں اتنے دے گا۔ یہ بھی درست نہیں کہ عورت پیسے زیادہ مانگے کیوں کہ مرد کی مجبوری ہے، اس نے دودھ تو مجھ سے پلوانا ہے.... اور شوہر کے لیے بھی یہ درست نہیں کہ وہ پیسے کم دے کیونکہ ماں ہے، اس نے دودھ تو پلانا ہی پلانا ہے۔ تو دونوں یوں نہ کریں بلکہ جتنے اس دور میں پیسے بنتے ہیں اس کا خیال کریں۔ یہ اس ساری بات کا خلاصہ ہے۔

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ﴾

وہ تمہارے لیے بچوں کو دودھ پلائیں تو ان کا خرچہ دو! کیونکہ اب تو عدت پوری ہو گئی ہے۔ اور باہمی مشورہ کرو کہ ماہانہ دودھ پلانے کے کتنے پیسے ہونے چاہییں۔

﴿وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ؕ۝۶﴾

اگر شوہر اور بیوی میں بحث چل پڑے، تکرار ہو جائے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچیں تو پھر کسی اور عورت سے دودھ پلوا دو۔

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ﴾

ہر صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق نفقہ دے اور جس شخص کا رزق تنگ ہو تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے!

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝۷﴾

یعنی اگر پیسے کم ہیں تو پھر بھی خرچہ دو، اپنی تنگی کا بہانا نہ کرو کہ میرے پاس تو ہیں ہی نہیں، جو ہیں وہ بھی خرچ ہو جائیں گے تو اللہ اس کے بعد اور عطا فرما دے گا۔

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸﴾

کتنی بستیاں ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے ان سے سخت حساب لیا اور انہیں سخت عذاب دیا۔ اس سے مراد اگر دنیا ہے تو پھر "فَحَاسَبْنٰهَا" ماضی کا صیغہ ہے، اس حساب سے اعمال کا وہ حساب مراد نہیں ہے جو حشر میں ہو گا۔ یہاں حساب سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان کو دنیا میں سزا دی ہے اور اگر اس سے مراد آخرت کا حساب ہے تو پھر "فَحَاسَبْنٰهَا" اور "عَذَّبْنٰهَا" یہ ماضی کا صیغہ تحقق کے لیے ہے کہ جہاں کسی کام کے کرنے کا یقین ہو وہاں پر ماضی کا صیغہ

استعمال کیا جاتا ہے۔

حقیقی عقلمند کون؟

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝١٠﴾

یہاں عقل مند ایمان والوں کو بتایا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو! اللہ نے تمہارے پاس ذکر بھیجا ہے۔ ذکر یعنی نصیحت کا پیغام۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ایمان والا ہے وہ حقیقی عقل مند ہے اور جو ایمان قبول نہیں کرتا وہ جتنا بھی سمجھدار ہو وہ عقل مند نہیں ہے۔ عمرو بن ہشام کو ابو الحکم کہا جاتا تھا یعنی حکمتوں والا لیکن جب ایمان قبول نہیں کیا تو ابو الحکم کے بجائے ابو جہل کہا جانے لگا کہ اس کے پاس کوئی حکمت کی چیز نہیں۔ سب سے بڑی نعمت اللہ کی طرف سے ایمان ہے۔ ایمان قبول کیا تو عقلمند ہے اور اگر قبول نہ کیا تو بے وقوف ہو گا۔

حدیث مبارک میں ہے:

"اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ" عقل مند وہ شخص ہے جو موت کی تیاری کرے، "وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ" اور بے وقوف شخص وہ ہے کہ جو نیک عمل نہ کرے بس اسی خواہش پر رہے کہ اللہ بخش دیں گے۔ ایسے ہی بلاوجہ امیدوں پر کھڑا رہے، فرمایا کہ یہ بہت بڑا بے قوف آدمی ہے۔[35]

سات آسمان اور سات زمینیں:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ﴾

35۔ سنن الترمذی، رقم:2459

اللہ رب العزت کی ذات وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور انہی کی طرح سات زمینیں بھی پیدا فرمائیں۔

﴿مِثْلَهُنَّ﴾.... مِثل کی دو قسمیں ہوتی ہیں؛ مثل بالکم اور مثل بالکیف۔ کیا مطلب کہ ایک چیز دوسری کی طرح ہو مقدار میں تو یہ مثل بالکم ہے اور اگر ایک چیز دوسری کی طرح ہو کیفیت میں تو یہ مثل بالکیفیت ہے۔

میں ایک بات کہہ چکا ہوں کہ اشکال ہوتا ہے کہ ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ [36] میں اللہ نے فرمایا کہ اگر صحابہ جیسا ایمان ہو گا تو تمہیں نجات ملے گی، صحابہ جیسا ایمان نہیں ہو گا تو تمہیں نجات نہیں ملے گی۔ اس پر سوال یہ تھا کہ صحابہ جیسا ایمان تو امت کے بس میں نہیں ہے، جو ایمان صحبتِ نبوت سے ملتا ہے وہ صحبتِ نبوت کے بغیر کیسے مل سکتا ہے؟ صحبتِ نبوت کی وجہ سے آدمی کا ایمان کمال تک پہنچ جاتا ہے، اس کے لیے اعمال کی حاجت بھی نہیں ہوتی! تو اس کا کیا معنی کہ صحابہ جیسا ایمان ہو گا تو تمہیں نجات ملے گی۔ یہ تو بظاہر تکلیف مالا یطاق ہے کہ ایسے کام کا مکلّف بنانا ہے کہ جو بندے کے بس میں نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ یہاں مثل فی الکم مراد ہے، کیفیت مراد نہیں ہے۔

یعنی یہ مراد نہیں کہ تمہارے ایمان کی کیفیت وہ ہو جو صحابہ کے ایمان کی کیفیت تھی، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ جن جن چیزوں پر صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لاتے تھے ان ان چیزوں پر تم ایمان لاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے، ان میں سے ایک چیز بھی چھوڑ دو گے تو تم ناکام ہو جاؤ گے۔ صحابہ پانچ نمازیں مانتے تھے اب تم نے بھی پانچ ماننی ہیں، تم چار مانو گے تو ناکام ہو جاؤ گے لیکن جس کیفیت سے وہ

36۔ البقرۃ 137:2

پڑھتے تھے ویسے تم پڑھو یہ مطلوب نہیں ہے۔ اشکال اس لیے پیدا ہوا کہ ہمارے ذہن میں کیفیت ہے کہ جو صحابہ کے ایمان کی کیفیت ہے تمہارے ایمان کی بھی وہی کیفیت ہونی چاہیے، یہ مراد نہیں ہے بلکہ یہاں کمیت مراد ہے کہ جتنی چیزوں پر صحابہ ایمان لائے اتنی پر تم بھی ایمان لاؤ۔

اور یہاں ﴿مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ میں جو مثل ہے تو اس سے مراد مثل فی الکم ہے، کیفیت نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ آسمان بھی سات ہیں تو ان کی مثل زمینیں بھی سات ہیں اور مثل سے مراد کیفیت نہیں ہے، مثل سے مراد کمیت ہے یعنی سات آسمان اور سات زمینیں کیفیت میں ایک جیسی نہیں ہیں۔ زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ ہے، اسی طرح ہر دو آسمانوں کے درمیان بہت طویل فاصلہ ہے تو کیا ہر دو زمینوں کے درمیان بھی اتنا طویل فاصلہ ہے؟ یہ ہمارے علم میں نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے۔ ہر دو آسمانوں کے درمیان ملائکہ کی ایک بہت بڑی تعداد ہے تو کیا ہر دو زمینوں کے درمیان بھی اسی طرح کی مخلوق ہو گی، یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ یہاں پر مثل سے مراد کمیت ہے، کیفیت نہیں ہے۔

اثرِ ابن عباس کی توجیہہ (از حضرت نانوتوی)

اگرچہ بعض روایات میں ساتوں زمینوں پر مخلوقات کا ہونا بھی منقول ہے۔ جس طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوَّر اللّٰہُ مَرقدَہ کی کتاب ہے ”تحذیر الناس عن انکار اثر ابن عباس“ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اثر ہے کہ جس طرح سات آسمان ہیں اسی طرح اللہ نے سات زمینیں پیدا فرمائی ہیں اور ہر زمین میں ”نَبِیٌّ كَنَبِيِّكُمْ وَاٰدَمُ كَاٰدَمَ، وَنُوْحٌ كَنُوْحٍ، وَاِبْرَاهِيْمُ كَاِبْرَاهِيْمَ، وَعِيْسٰى

کعیسی “[37] کہ ان میں نبی ہیں جیسے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آدم ہیں آدم جیسے، نوح ہیں نوح جیسے، ابراہیم ہیں ابراہیم جیسے اور عیسیٰ ہیں عیسیٰ جیسے علیہم السلام، اور اسی پر اشکال ہے کہ اگر سات زمینوں میں سے ہر زمین پر محمد ہیں تو خاتم الانبیاء کون سے محمد ہوں گے ؟ - صلی اللہ علیہ وسلم - بعض لوگوں نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا انکار کر دو۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انکار نہ کرو بلکہ صحابی کے قول کا معنی ایسا بیان کرو کہ جس پر کوئی اشکال باقی نہ رہے۔ تو ”تحذیر الناس“ اصل میں اس اعتراض کا جواب ہے اور یہ بڑی بہترین پڑھنے والی مدلل کتاب ہے۔ اللہ ہم سب کو پڑھنے کی اور پھر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سات زمینیں ہیں اوپر نیچے، تو جو دنیا کا ضابطہ ہے کہ سات منزلہ مکان ہو تو ساتویں منزل کو آخری کہتے ہیں، پہلی منزل کو آخری نہیں کہتے۔ اسی طرح ساتویں زمین کو آخری کہتے ہیں، پہلی کو آخری نہیں کہتے۔ تو جب ہماری زمین آخری ہے تو ہماری زمین کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی آخری ہوں گے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چھ زمینیں نہ ماننا اور صرف ایک زمین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا یہ اتنا باعثِ کمال نہیں ہے جتنا چھ زمینوں میں محمد مان کر اس ہماری زمین کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے افضل ماننا یہ کمال ہے۔ عجیب توجیہ فرمائی ہے۔ فرمایا کوئی بادشاہ ایک ملک کا بادشاہ ہو اور دوسرا بادشاہ ایک ملک کا نہیں ہے بلکہ چھ ملک اور بھی ہیں، ان چھ ممالک کے چھ بادشاہ ہوں اور یہ ساتویں ملک کا بادشاہ ان چھ ملکوں کے بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہو اور اپنے ملک کا

37۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج3 ص315 رقم الحدیث 3875

بھی بادشاہ ہو تو اب بتاؤ! زیادہ فضیلت کس میں ہے؟ چھ ملکوں کے بادشاہ مان کر ان کو ان چھ کے اوپر بادشاہ مانا جائے اس میں فضیلت زیادہ ہے یا چھ اور ملکوں کے بادشاہ ہی نہ مانے جائیں؟

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں فضیلت زیادہ ہے جب چھے ملکوں کے بادشاہ مان کر ان کے اوپر بادشاہ مانا جائے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ عجیب بات فرماتے ہیں، حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ اگر مجھ سے پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آئی تو اس سے میرا بڑا ہونا تھوڑا لازم آتا ہے، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹوں کے ذہن میں ایسی بات آئی جو بڑوں کے ذہن میں نہیں آئی۔ عجیب تواضع ہے حضرت رحمہ اللہ کی۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ توجیہ آپ بدلتے رہیں لیکن موقف نہ تبدیل ہو۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ ایک یہ ہے کہ آپ ایسی توجیہ بیان کریں کہ موقف ہی تبدیل ہو جائے، یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔

ناقل بنو محقق نہیں:

ہمارے ہاں ہر ماہ فیصل آباد میں جمعرات کے دن طلبہ اور بطورِ خاص علماء میں جو پروگرام ہوتا ہے اس میں ایک بات میں نے انہیں بھی عرض کی تھی اور میں آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ تمام طلبہ یہ ذہن بنالو کہ ہم نے مسلک اھل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا ناقل بننا ہے محقق نہیں بننا! حدیث پاک میں علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ "وَلَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَوَّلَهَا"[38] کہ بعد والے پہلے والوں پر لعنت کریں گے۔ اگر بعد والے ناقل ہوں گے تو پھر لعنت نہیں کریں گے اور جب بعد والوں میں سے ہر بندہ محقق بنے گا تو پھر لعنت کی نوبت آئے گی۔

38۔ سنن الترمذی، رقم: 2211

ایک مسئلے پر چودہ سو سال سے تحقیق ہو چکی ہے، اب میں ان کے مقابلے میں نئی تحقیق پیش کرتا ہوں اور ان کو ٹھیک نہیں کہتا تو میں تو شاید اعتدال کر لوں لیکن میرے ماننے والے ان کو برا کہیں گے، مجھے اچھا کہیں گے اور اب لعنت شروع ہو جائے گی، اور اگر چودہ سو سال کی جو تحقیق ہے میں اسی کو آگے لے کر چلوں، اسی کو سمجھاؤں، اس پر ہونے والے اشکال کا جواب دوں تو اب بعد والے لعنت نہیں کریں گے۔

اس کو میں دوسرے لفظوں میں یوں سمجھاتا ہوں کہ آج ہر بندہ کہتا ہے کہ امت کو جوڑنا چاہیے۔ اب اس کے دو مفہوم ہیں؛ ایک یہ کہ بعد والی امت کو پہلی امت سے جوڑو تا کہ تسلسل باقی رہے اور ایک یہ ہے کہ بعد والوں کو تو پہلوں سے کاٹ دو لیکن موجودہ مختلف طبقات کو جوڑو! تو لوگوں کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ امت کے جو موجودہ طبقات ہیں ان کو جوڑو۔ ہم کہتے ہیں کہ نہیں، ان کو جوڑو نہ جوڑو یہ بعد کا مسئلہ ہے لیکن بعد والوں کو پہلوں سے جوڑو تا کہ امت کا تسلسل برقرار رہے اور اکابرینِ امت پر اعتماد بحال رہے۔

ایسی تحقیق پیش کرنا جو پہلوں کے خلاف ہو اس سے آدمی کو بچنا چاہیے۔ اگر آپ کی تحقیقات پہلوں کے خلاف ہیں اور آپ دلائل کی بنیاد پر تحقیق کے قائل ہوئے ہیں تو پھر بھی آپ کا ذہن تو ہے ناں کہ آپ نبی نہیں ہیں، امتی ہیں، نبی کا اجتہاد ہو تو اس میں بھی بعض مرتبہ خطا ہو جاتی ہے تو ہمارے اجتہاد میں خطا کیسے نہیں ہو گی۔ ایک اجتہاد پہلے والوں کا ہے اور ایک اجتہاد آج کا ہے، ہم اپنے اجتہاد کو قربان کر دیں پہلے والے اجتہاد پر، ایک وقت آئے گا کہ اللہ کریم دلیل بھی عطا فرما دے گا۔

اچھی طرح بات ذہن نشین فرما لیں اور اس کا ذہن بھی بنا لیں کہ اگر آپ کی تحقیق اکابرین والی ہو گی اور اسی کو لے کر چلیں گے تو جو مدد اکابرین کے ساتھ تھی وہی

مدد آپ کے ساتھ ہو گی، جو محبوبیت لوگوں میں ان کی تھی وہی آپ کی ہو گی، جو مقبولیت اللہ کے ہاں ان کو حاصل تھی وہی آپ کو ہو گی اور قیامت کے دن جو مقام ان کا ہو گا اللہ اس مقام پر آپ کو بھی لے کر جائے گا۔

﴿يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

تو بات چل رہی تھی کہ سات آسمان اور سات ہی زمینیں ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کے فیصلے اترتے ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ کے حکم کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہے حکمِ تشریعی اور دوسرا ہے حکمِ تکوینی۔ اگر یہاں "امر" سے مراد وہ احکام ہوں جو اللہ رب العزت فرشتوں کے ذریعے اپنے نبی کو اور نبی کے واسطے سے انسانوں اور جنات کو دیتے ہیں تو اس کو حکمِ تشریعی کہتے ہیں کہ یہ کرو گے تو ثواب ملے گا، نہیں کرو گے تو گناہ ہو گا۔ یہ حکمِ تشریعی ہے۔ اگر اس زمین کے نیچے والی زمینوں پر بھی مخلوق ہو اور "الْاَمْرُ" سے مراد حکمِ تشریعی ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور اگر "الْاَمْرُ" سے مراد حکمِ تکوینی ہو تو پھر ساتوں زمینوں پر جن وانس کا ہونا کوئی ضروری نہیں، حکمِ تکوینی جس طرح انسانوں اور جنات پر لاگو ہوتے ہیں اسی طرح حکمِ تکوینی دیگر مخلوقات پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ پھر اشکال ہی کوئی نہیں رہتا۔

معیتِ ذاتیہ:

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝١٢﴾

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

اس سے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ یہاں "عِلْمًا" کی بات کی ہے،

یہاں "ذَاتًا" کی بات تو نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احاطہ علمی تو ہے احاطہ ذاتی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کریم میں ﴿وَّ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا﴾ ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ﴿وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطًا﴾[39] بھی ہے۔ دونوں آیتیں موجود ہیں، احاطہ علمی بھی ہے اور احاطہ ذاتی بھی ہے اور جب علمِ الٰہی؛ ذاتِ الٰہی سے جدا نہیں ہے تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں علم ہوگا وہاں ذات ہوگی، پھر تو احاطہ علمی سے احاطہ ذاتی خود بخود مراد ہوگا۔[40]

حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت پیاری بات فرماتے ہیں کہ ہمارے جن مشائخ نے معیتِ ذاتیہ کا انکار کیا ہے بظاہر لگتا ہے کہ وہ تجسیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں کہ لوگ معیتِ ذاتی کو تجسیم نہ سمجھ لیں، اس لیے یہ حضرات معیتِ ذاتیہ کی نفی کر لیتے ہیں اور معیتِ وصفی کے قائل ہو جاتے ہیں۔

اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

39۔ النساء4:126

40۔ مکاتیب رشیدیہ: ص42

سورة التحریم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ۚ تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِکَ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱﴾﴾

سورت کا شانِ نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ عصر کی نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے کھڑے تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس تشریف لے جاتے، یہ آپ کا معمول تھا۔ ایک دن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور معمول سے زیادہ ٹھہرے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد پیش کیا۔ آپ نے شہد پی لیا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی باری تھی۔ تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہے کہ حضور! آپ نے مغافیر پیا ہے! مغافیر ایک گوند ہوتا ہے اور اس میں خاص قسم کی کچھ بو بھی ہوتی ہے۔

چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا کہ حضور! آج تو آپ کے منہ سے گوند مغافیر کی بو آ رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں نے تو شہد پیا ہے۔ انہوں نے

کہا کہ ہو سکتا ہے کہ مکھی نے مغافیر گوند چوسا ہو اور اس سے شہد بنا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں آئندہ شہد نہیں پیوں گا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ زینب کو یہ بات نہ بتانا، اس کا دل دکھے گا۔ انہوں نے آگے بات بتا دی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اور یوں بات آگے نکل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آگئی، ساری بات علم میں آگئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک بات آگے بتانے سے منع کیا تھا لیکن تم نے پھر آگے بتا دی، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا بھی ارادہ کیا تھا کہ میں نے منع کیا اور پھر بھی تم نے ایسا کیا! جبرائیل امین علیہ السلام حاضر ہوئے، کہا کہ حضرت حفصہ کو طلاق نہ دیں، یہ بہت نیک عورت ہیں، نمازیں بہت پڑھتی ہیں، ان کو کچھ نہ کہیں! تو یہ اس کا خلاصہ ہے۔ اللہ کی طرف سے حکم آگیا کہ آپ نے جو قسم کھائی ہے اس کا کفارہ ادا کریں اور اپنی قسم کو توڑ دیں۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِى مَرْضَاتَ أَزْوَٰجِكَ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ①﴾

اے نبی! آپ ان چیزوں کو کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہیں اور وہ بھی اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لیے، ﴿وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ یہ جو آپ نے کیا ہے یہ گناہ نہیں ہے، گناہ ہوتا ہم تب بھی معاف کر دیتے!

یہاں بظاہر اسلوب ایسے ہے کہ جیسے آپ سے جواب طلبی ہو رہی ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا! حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ حقیقت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ نے شفقت والا معاملہ کیا ہے کہ ہم نے شہد حلال کیا ہے تو آپ نے اپنے اوپر کیوں حرام کیا ہے؟ اب کفارہ دیں، قسم توڑیں، کیوں آپ حلال کو حرام

کرتے ہیں؟ یہ شفقت کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن اسلوب ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے جواب طلبی ہو، اس لیے فرمایا ﴿وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ کہ اگر ہو بھی تو ہم رحم کرنے والے ہیں۔

الیاس! تم نے خون کیوں دیا؟

میں اس پر اپنا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں، شاید پھر آپ کو جلدی بات سمجھ آ جائے۔ میں جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں درجہ خامسہ میں پڑھتا تھا۔ وہاں ایک طالب علم تھے ڈی آئی خان کے مولانا عبید اللہ صاحب، مدرسہ کے ساتھ ایک بڑا گراؤنڈ تھا اس میں فٹبال کھیلتے تھے عصر کے بعد۔ مولانا عبید اللہ کھیل کے دوران دوڑتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگے تو بازو ٹوٹ گیا، خون نکلا تو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ لڑکوں نے خون دینا چاہا لیکن گروپ نہیں ملا، میرا گروپ مل گیا تو میں نے خون دے دیا۔ دوسرے دن ظہر کے بعد میں سبق میں تھا تو استاذ جی شیخ نذیر صاحب رحمہ اللہ کلاس کے باہر تشریف لائے اور مجھے بلایا: الیاس! ادھر آؤ۔ مجھے باہر لے گئے اور فرمایا: تو نے خون کیوں دیا؟! اور کوئی لڑکا نہیں تھا؟! اس طرح مجھے ڈانٹا۔

میں جس مدرسے میں پڑھتا تھا تو ایسے پڑھتا تھا کہ اساتذہ کو بھی مزا آتا تھا۔ پھر مجھے کمرے میں لے گئے، دو سو روپے دیے اور کہا کہ ان سے دودھ پینا! پھر مجھے کھجوریں دیں، پھر کہا کہ میرے کمرے میں پنجیری پڑی ہے، تم کھا لینا۔ اب دیکھنے والا کیا سمجھ رہا ہے کہ استاذ ڈانٹ رہا ہے لیکن یہ ڈانٹنا نہیں تھا، یہ شفقت تھی کہ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

تو اللہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے شفقت فرما رہے ہیں کہ آپ نے کیوں حرام کیا؟ آپ شہد پیا کریں! اب بتاؤ شفقت ہے کہ نہیں؟ لیکن اس پوری بات کو نہ سمجھیں تو بندہ سمجھتا ہے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطی ہو گئی ہے کہ آپ

نے شہد کو حرام فرمالیا ہے۔

حلال کو حرام سمجھنے کے تین درجے:

کسی حلال چیز کو حرام کرنے کے تین درجے ہیں:

[1]: حلال کو اعتقاداً حرام سمجھے، یہ کفر ہے۔

[2]: اعتقاداً تو حرام نہ سمجھے لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے قسم کھا کر حرام کر لے، یہ گناہ تو نہیں ہے لیکن مناسب بھی نہیں ہے اور اگر بغیر کسی مصلحت اور فائدے کے حرام کر لے تو یہ گناہ ہے۔

[3]: اعتقاداً بھی حلال سمجھے اور قسم کھا کر حرام بھی نہ کرے البتہ کسی عذر کی وجہ سے اس کے ساتھ معاملہ ایسا کرے کہ جیسے حرام سمجھتا ہے۔ جیسے ایک آدمی شوگر کا مریض ہو، اس سے پوچھا جائے کہ چائے پیو گے؟ وہ کہے کہ میں نے تو چائے اپنے اوپر حرام کی ہوئی ہے، میں نے نہیں پینی! اب اس طرح حلال کو حرام کرنا یہ حرام نہیں ہے یعنی عملاً ایسے ہے کہ گویا حرام ہے۔ ایک بندہ کہتا ہے کہ حرام ہے کہ میں نے دس سال سے یہ بات کی ہو! کسی مصلحت و ضرورت کی وجہ سے ایسا کہنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں ہے۔ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے حلال چیز کو چھوڑ دیا ہو، کبھی عذر بیماری ہوتی ہے اور کبھی عذر باطنی اصلاح ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی تھی مصلحت کی وجہ سے تو فرمایا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا محبت کا انداز ہے اللہ کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ!

﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾﴾

اللہ نے تمہاری قسموں سے نکلنے کا طریقہ مقرر فرما دیا ہے، اللہ تمہارا مولا

ہے، اللہ جانتا ہے حکمتوں والا ہے۔

یعنی آپ اپنی قسموں کو توڑیں اور اس کا کفار ادا کریں۔

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝﴾

اس وقت کو یاد کرو کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی سے کوئی راز کی بات کی تھی اور جب اس بیوی نے آگے بات بتائی تو اللہ نے نبی کو بتا دی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے پوری بات بتا دی لیکن اللہ کے نبی نے پھر بھی یہ پوری بات بیوی سے نہیں کی تاکہ ان کو زیادہ شرمندگی نہ ہو، بس اتنا کہا کہ تم نے اچھا نہیں کیا، ہمارا راز فاش کیا، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس بیوی نے عرض کیا کہ حضور! آپ کو کس نے بتایا؟ فرمایا: مجھے اللہ نے بتایا جو علیم اور خبیر ذات ہے۔

محبتِ رسول مطلوب ہے:

﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾

آیت سمجھنا ذرا! اس سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر کبھی شبہ نہیں ہو گا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے ایسا کام کیوں کیا تھا؟ اصل میں وہ چاہتی تھیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت زیادہ سے زیادہ حاصل کریں اور نبی کی محبت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا یہ شریعت میں مطلوب ہے۔ ایسے طریقے اختیار کرنا کہ جس سے کوئی بندہ پیغمبر کا محبوب بنے یہ مطلوب ہے لیکن اس میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا کہ جس سے دوسرے کی حق تلفی کا خدشہ ہو تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو فرمایا: ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ کہ عائشہ اور حفصہ! تم نے یہ سارا کام

کیوں کیا تا کہ حضور کی محبت ہم سے زیادہ ہو، زینب سے کم ہو تو تم توبہ کرو!" فَقَدْ صَغَتْ "تمہیں توبہ کرنی چاہیے! یہ "ف" تعلیلیہ ہے، مطلب کہ تمہیں توبہ کا حکم اس لیے ہے کہ تمہارے دل مائل ہو گئے تھے اس بات کی طرف کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بن جائیں اور زینب کی محبت کم ہو جائے۔ اگر زینب کی محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کم ہوئی تو زینب کے حقوق میں کمی کا خدشہ ہے، اس لیے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالی سے معافی مانگو!

﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ کہ اگر تم نے توبہ کی، یہاں "اِنْ" شرطیہ کی جزاء محذوف ہے یعنی "اگر تم نے توبہ کی تو بہت اچھا ہے۔"

﴿وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۴﴾﴾

اگر توبہ نہ کرو اور تم چاہو کہ ہم ایسی کوشش کریں کہ نبی پر غالب آ جائیں تو یہ نہیں ہو سکتا! کیوں، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تو اللہ تعالیٰ ہیں اور جبرائیل علیہ السلام ہیں اور نیک ایمان والے ہیں، پھر فرشتے آپ کے مددگار ہیں۔ تو تم ایسی باتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب نہیں آ سکتیں!

﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ﴿۵﴾﴾

اور اگر تمہارے ذہن میں یہ ہو کہ ﴿لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ ہم کائنات میں سب سے بہترین عورتیں ہیں، ہم سے بہتر کون سی عورت ہو گی جس سے حضور نکاح کریں گے! فرمایا کہ ٹھیک ہے ابھی تو تم بہتر ہو لیکن جب اللہ فیصلہ فرمائیں گے تو تم سے بھی بہتر عورتیں ہو جائیں گی۔

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ﴾.... یہ اشکال کا جواب ہے کہ نبی کی بیویاں تو سب سے بہتر ہوتی ہیں تو ان سے بہتر کون سی عورت ہو سکتی ہے؟ فرمایا: اگرچہ اس وقت تو تم سب سے بہتر ہو اور تم سے بہتر دنیا میں کوئی عورت موجود نہیں ہے لیکن جب نبی تمہیں طلاق دینے کا فیصلہ کریں گے تو پھر اللہ تم سے بہتر عورتیں بنا دیں گے یا کچھ عورتوں کو تم سے بہتر بنا دیں گے، وہ نبی کے نکاح میں آ جائیں گی تو اللہ تمہارے بدلے میں اپنے نبی کو دیں گے، ایسی بیویاں "مُسْلِمٰتٍ" جو اطاعت بھی کریں، "مُّؤْمِنٰتٍ" ان کے عقیدے بھی ٹھیک ہوں، "قٰنِتٰتٍ" فرمانبرداری بھی کریں، "تٰٓئِبٰتٍ" اللہ کی طرف متوجہ بھی ہوں، "عٰبِدٰتٍ" عبادت بھی کریں، "سٰٓئِحٰتٍ" روزے بھی رکھیں، "ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا" ان میں سے کچھ باکرہ؛ کنواری ہوں گی اور کچھ ثیبہ؛ پہلے سے شادی شدہ ہوں گی۔

اپنی اور گھر والوں کی فکر کیجیے!

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴿۶﴾﴾

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، اس آگ پر ایسے فرشتے مامور ہیں جو تند خو اور سخت مزاج ہیں، اللہ جو حکم انہیں دے اس میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! خود کو جہنم کی آگ سے بچائیں یہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اہل و عیال کو کیسے بچائیں؟ فرمایا کہ خود گناہوں سے بچو اور ان کو بھی گناہوں سے بچاؤ، خود نیک اعمال کرو اور ان کو بھی نیک اعمال پہ لاؤ تو یہ

بھی آگ سے بچ جائیں گے۔

توبۃ نصوحا کیا ہے؟

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾

اے ایمان والو! خالص توبہ کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے خالص توبہ یہ ہے کہ:

1: جو گناہ کیا ہے اس پر آدمی کو ندامت ہو جائے۔

2: جو فرض چھوڑ دیا تھا اس کی قضا کر لے۔

3: کسی کا مال لوٹا تھا تو اس کو واپس کر دے۔

4: کسی سے زیادتی کی تھی تو اس سے معافی مانگ لے۔

5: آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کر لے۔

6: اور جس طرح نفس کو گناہ کرتے دیکھا تھا اسی طرح نفس کو اللہ کی اطاعت کرتے بھی دیکھے! یہ ہے توبہ نصوحا۔

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾

قرآن کریم میں بار بار یہ بات آئے گی کہ جب تم خالص توبہ کرو گے تو تمہیں امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔ تو جب اللہ نے گناہوں کے معاف کرنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر امید نہیں یقین ہونا چاہیے، پھر "عَسٰی" یعنی امید کا لفظ کیوں لاتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان نیک عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیک عمل پر دنیا میں نعمتیں دیتے ہیں۔ اس نیک عمل کے بدلے میں نعمت تو مل گئی، اب جنت کس بات کی؟! اگرچہ ہم نے وعدہ کیا تھا لیکن جو تم نے عمل کیا تھا اس کا بدلہ تو تمہیں دنیا میں مل گیا تھا، اس لیے اب تمہیں امید ہونی چاہیے۔

پیغمبر کو جہاد اور سختی کا حکم:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾

یہاں اللہ نے دو حکم دیے ہیں:

1: جہاد کا

2: سخت ہونے کا

جہاد کرنے کا تعلق کفار کے ساتھ ہے اور سخت ہونے کا تعلق منافقین کے ساتھ ہے یعنی کفار سے جہاد کرو اور منافقین پر سختی کرو۔

اب کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سختی نہیں فرماتے تھے تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ جب تک اسلام کا غلبہ نہیں تھا تو اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی فرمائی ہے۔ پارہ نمبر گیارہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں آپ تفسیر ابن کثیر اٹھا کر دیکھ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے اور ایک ایک منافق کا نام لے کر مسجد سے نکالا "اُخْرُجْ يَا فُلَانُ! اُخْرُجْ يَا فُلَانُ!" نکل جاؤ مسجد سے! جب تک غلبہ نہیں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت نرمی فرمائی ہے اور جب غلبہ ہو گیا تو پھر صفوں سے باہر نکال دیا۔ اس لیے یہ غلطی کبھی بھی نہ کرنا کہ مکی دور کی بات لے کر تم مدنی دور پر فٹ کر دو! اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دو مومن اور دو کافر عورتوں کی مثال:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ﴾

حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں اور بیوی کافرہ ہے، نام واغلہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور بیوی کافرہ ہے، اس کا نام والہہ ہے۔ دونوں کفر پر تھیں اور

پیغمبر کا ساتھ نہیں دیا تو دونوں جہنم میں گئیں۔

﴿وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ﴾

فرعون کی بیوی آسیہ کافر کی بیوی ہیں لیکن نبی کا ساتھ دیا تو جنت میں گئیں۔

﴿وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾﴾

حضرت مریم علیہ السلام کا خاوند نہیں تھا۔ ان کے والد مسجد اقصیٰ کے امام تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے۔

اللہ نے دو مومن عورتوں اور دو کافرہ عورتوں کی مثالیں دی ہیں۔ اللہ ہم سب کو نیک بنادیں اور ہماری عورتوں کو بھی نیک بنادیں اور ہم سب کو شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الملک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُۨ ۙ﴿۱﴾﴾

سورت الملک کی فضیلت:

سورۃ الملک کا ایک نام "اَلۡمَانِعَۃُ" ہے اور "اَلۡمُنۡجِیَۃُ" بھی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هِيَ الۡمَانِعَةُ هِيَ الۡمُنۡجِيَةُ تُنۡجِيۡهِ مِنۡ عَذَابِ الۡقَبۡرِ.[41]

کہ سورۃ الملک عذابِ قبر کو روکنے والی اور عذابِ قبر سے نجات دلانے والی ہے۔

صفاتِ متشابہات کے متعلق ہمارا موقف:

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ﴾

برکت والا ہے وہ اللہ جس کے قبضہ قدرت میں بادشاہی ہے۔

اس پر کئی بار بات ہو چکی ہے کہ "ید" اللہ کی صفت ہے جس کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ متقدمین اھل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ "ید" متشابہات میں سے ہے اور اس کا معنی کوئی نہیں جانتا۔ متاخرین اھل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ

41۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج6 ص110 رقم الحدیث 12630

”ید“ سے مراد قدرت ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں:

"وَلَا يُقَالُ إِنَّ يَدَهٗ قُدْرَتُهٗ أَوْ نِعْمَتُهٗ لِأَنَّ فِيْهِ إِبْطَالَ الصِّفَةِ وَهُوَ قَوْلُ أَهْلِ الْقَدْرِ وَالْاِعْتِزَالِ وَلٰكِنْ يَدُهٗ صِفَتُهٗ بِلَا كَيْفٍ." [42]

”ید“ کا معنی قدرت کرنا یہ معتزلہ کا مذہب ہے، اس لیے ”ید“ کا معنی قدرت نہ کریں بلکہ ”ید“ اللہ کی صفت ہے جس کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور معتزلہ کہتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی قدرت ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر ”ید“ کا معنی قدرت کرنا معتزلہ کا مسلک ہے تو تقریباً ننانوے فیصد اکابر اھل السنۃ والجماعۃ بھی ”ید“ کا معنی قدرت ہی کرتے ہیں۔ جس طرح حدیث میں ہے کہ:

وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ أَنْ أُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَأُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَا فَأُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَا فَأُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَا فَأُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَا. [43]

اس کا ترجمہ ہمارے سارے اکابر یہی کرتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ جب ”ید“ کا معنی قدرت کرنا معتزلہ کا مذہب ہے تو پھر اھل السنۃ والجماعۃ ”ید“ کا معنی قدرت کیوں کرتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ”ید“ سے مراد قدرت یہ صرف معتزلہ کا مذہب نہیں ہے بلکہ متأخرین اھل السنۃ والجماعۃ اکابر کا بھی ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ”ید“ سے مراد قدرت ہے تو پھر واقعی سوال ہو گا کہ متأخرین اھل السنۃ والجماعۃ کے ہاں بھی ”ید“ کا معنی قدرت اور معتزلہ جو گمراہ ہیں ان کے ہاں بھی ”ید“ کا معنی قدرت ہو تو دونوں میں

42۔ الفقہ الاکبر: ص 2

43۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج 9 ص 157 رقم 18957

فرق کیا ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ متأخرین اھل السنۃ والجماعۃ اھلِ حق کے ہاں "ید" کا معنی قدرت ہے درجہ ظن اور درجہ گمان میں جبکہ معتزلہ کے ہاں "ید" کا معنی قدرت ہے درجہ یقین میں۔ اس لیے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

اور "ید" کا معنی ہاتھ کرنا متقدمین اور متاخرین اھل السنۃ والجماعۃ میں سے کسی کا مسلک نہیں۔ سن تین سو ہجری سے پہلے کے علماء متقدمین ہیں اور سن تین سو ہجری کے بعد کے علماء کو متأخرین کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات "ید" کا معنی بعض حضرات ہاتھ کرتے ہیں تو وہ لغت کو دیکھ کر کرتے ہیں، اس کا اصطلاحِ شرع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

احسنُ عملاً اور اکثر عملاً میں فرق:

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾﴾

اللہ وہ ذات ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ آزمائے کہ تم میں سے کس کے اعمال زیادہ اچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

یہاں موت کو حیات پر مقدم کیا حالانکہ حیات پہلے ہے اور موت بعد میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے تاکہ موت کی تیاری کرے اور تیاری وہی کر سکتا ہے جو موت کو ذہن میں رکھ کر زندگی گزارے۔ یہ موت بمنزلہ شرط کے ہے آخرت کی تیاری کے لیے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے آخرت کی تیاری کے لیے یعنی حیات وہ جگہ ہے جہاں انسان رہ کر کام کرتا ہے اگر اللہ کسی کو زندگی نہ دے تو تیاری کیسے کرے گا؟ اور موت نہ رکھی ہو تو تیاری کیوں کرے گا؟ تو موت بمنزلہ شرط کے ہے۔

﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ایک ہوتا ہے احسنُ عملاً اور ایک ہوتا ہے اکثرُ عملاً۔ یہاں احسنُ عملاً فرمایا ہے اکثرُ عملاً نہیں فرمایا۔ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہو گا اور وزن کی بنیاد کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہو گی۔ یہ بات میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ احادیث میں جہاں وزنِ اعمال کی بات ہے وہاں یہ نہیں ہے کہ اعمال کو قیامت کے دن گنا جائے گا بلکہ یہ ہے کہ اعمال کو قیامت کے دن تولا جائے گا۔ قیامت کے دن اعمال کو نہ گننا بلکہ وزن کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وزن کی بنیاد کیفیت ہے کمیت نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ یہ دیکھے گا کہ تم میں سے کس نے اعمال زیادہ کیے ہیں، بلکہ فرمایا کہ اللہ یہ دیکھے گا کہ اعمال کس نے زیادہ اچھے کیے ہیں؟

سببِ تخلیقِ کائنات:

یہاں پر تو نہیں دوسرے ایک مقام پر مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کی تخلیق کا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ کیوں، اس لیے کہ کائنات میں سب سے احسنُ عملاً اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اکثرُ عملاً تو ہو سکتے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر احسنُ عملاً کوئی نہیں ہو سکتا۔

اور یہ جو ہے کہ موت اور حیات کو پیدا فرمایا تو حیات کے درجات ہیں۔ حیات کا ایک درجہ ہے کہ جس میں حس ہو کہ محسوس کرے اور ایک درجہ ہے کہ جس میں حرکت ہو کہ چلے پھرے اور ایک درجہ یہ ہے کہ اس میں نمو ہو کہ بڑھے۔ اب دیکھو! انسان میں حس بھی ہے، حرکت بھی ہے اور بڑھنا بھی ہے اور درخت نباتات میں نمو ہوتا ہے لیکن حرکت نہیں ہوتی دائیں بائیں کی۔ تو انسان، حیوان اور نباتات ان

میں حیات کی تینوں قسمیں پائی جاتی ہیں؛ حس، حرکت اور نمو اور یہ جو جمادات ہیں ان میں یہ تینوں قسمیں نہیں پائی جاتیں، ہاں البتہ ایک درجہ کی حیات ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔

تقلید واجب ہے:

﴿وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۰﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۱﴾﴾

وہ لوگ کہیں گے کہ کاش ہم کسی کی بات سن لیتے یا خود ہی عقل سے کام لے لیتے تو آج جہنم میں داخل نہ ہوتے! وہاں اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہو گا کہ دفع ہو جاؤ اہل جہنم!

تقلید کرنا واجب ہے اور تقلید کے بغیر انسان کبھی بھی شریعت پر عمل نہیں کر سکتا۔ عمل کرنا تو دور کی بات ہے تقلید کے بغیر انسان کو عمل مل ہی نہیں سکتا۔

درجہ حفظ کے بچوں کو مناظرہ سکھانا:

میراہری پور ایک جگہ بیان تھا۔ میں وہاں سے گزرتے ہوئے ایک مدرسہ میں رکا تو درجہ حفظ کے طلبہ تھے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ ان میں بیان کر دیں تو میں نے قاری صاحب سے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے طلبہ کو مناظرہ سکھاؤں؟ مجھے وہ کہنے لگے کہ بچے کیسے سیکھیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ سے یہ سوال تو نہیں کیا کہ آپ کے بچے مناظرہ سیکھیں گے یا نہیں سیکھیں گے؟ میں نے تو آپ سے یہ سوال کیا ہے کہ مناظرہ سکھاؤں یا نہ سکھاؤں؟ آپ کہہ دیں کہ سکھا دو یا کہہ دیں کہ نہ سکھاؤ۔ انہوں نے کہا کہ آپ سکھا سکتے ہیں تو سکھا دیں!

میں نے بچوں سے کہا کہ آپ مسجد سے باہر نکلیں گے، ایک شخص آپ سے

پوچھے گا: آپ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں؟ آپ نے کہنا ہے کہ نہیں۔ وہ پوچھے گا: کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ نے کہنا ہے کہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ تو وہ کہے گا کہ میں سکھا دوں؟ آپ کہیں کہ جی سکھا دیں تو ہم پڑھ لیں گے۔ جب وہ آپ کو فاتحہ سکھانی شروع کرے تو وہ کہے گا: الف لام زبر "اَلْ" تو ایک بچے نے کہنا ہے: الف لام پیش "اُلْ" وہ کہے گا: نہیں، الف لام زبر "اَلْ" آپ نے کہنا ہے: الف لام زیر "اِلْ" تو وہ کہے گا کہ آپ "اَلْ" کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ اس سے پوچھو کہ انکل! آپ "اُلْ" کیوں نہیں پڑھتے، "اِلْ" کیوں نہیں پڑھتے؟ وہ کہے گا کہ دیکھو! یہاں زبر لکھا ہوا ہے۔ آپ نے کہنا ہے کہ یہ زبر اللہ نے لکھا ہے؟ اللہ کے رسول نے لکھا ہے؟ کس نے لکھا ہے، اس کا نام بتاؤ؟ اب اس کو نام کا تو پتا نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے گا کہ حجاج بن یوسف نے لکھوایا تھا۔ لکھنے والے کا تو اس کو بھی نہیں پتا۔ تو آپ نے کہنا ہے کہ حجاج بن یوسف تو کوفہ کا ظالم آدمی تھا، ہم تو کوفہ کے نیک آدمی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات بھی نہیں مانتے تو ظالم کی بات کیوں مانیں؟ یہ ان کا سبق انہی کو سنائیں۔

اس لیے کسی نیک آدمی کی بات کرو اور ہمیں بتاؤ کہ "اَلْحَمْدُ" کے شروع میں جو زبر ہے یہ زبر کیوں ہے؟ اصل میں تو ہمزہ ہوتا ہے نا، ابتدائے کلام میں مفتوح ہوتا ہے لیکن اس کو تو ہر بندہ نہیں سمجھتا، لوگ اس کو الف ہی کہتے ہیں اس لیے میں اس کو الف کہہ کر بات سمجھا دیتا ہوں۔ اب وہ پھنس جائے گا۔ اب دیکھو! اگر کسی شخص کی تقلید نہ کرو تو قرآن کریم کے شروع میں جو ہمزہ ہے اس پر جو زبر ہے وہ بھی ثابت نہیں ہوتی تقلید کے بغیر۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تقلید نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس تو دلیل ہے۔ تو اس سے پوچھو کہ کیا دلیل ہے؟ وہ کہے گا کہ نحو کا اصول ہے کہ ہمزہ وصلی ابتدائے کلام میں مفتوح ہوتا ہے۔ تو اس سے پوچھو کہ یہ اصول کس نے دیا ہے؟ کسی کا نام تو لو! تو وہ

بندہ ابو الاسود دؤلی کا نام لے یا کسی کا بھی نام لے تو اسے کہیں کہ یہ نہ اللہ ہے اور نہ اللہ کا رسول ہے۔ یہ تو تقلید ہی ہوئی نا۔ تقلید کے بغیر ہمزہ کا زبر ثابت کر کے دو! نہیں کر سکتے تو پورے قرآن کو تقلید کے بغیر کیسے ثابت کرو گے؟ پھر شریعت کے اعمال تو بعد کا مسئلہ ہے، تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

تقلید نہ کرنے کے نقصانات:

لیکن جو شخص تقلید نہ کرے اس کا ایک نقصان دنیا میں ہے، ایک قبر میں ہے اور ایک آخرت میں۔ دنیا میں نقصان یہ ہوتا ہے کہ اسے شریعت نہیں ملتی جس کی وجہ سے گمراہ ہی رہتا ہے۔ قبر میں نقصان کیا ہوتا ہے؟ صحیح بخاری میں ہے کہ جب مردے کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں: مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟

کہ تمہارا اس شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ وہ اس کا جواب نہیں دے پاتا تو کہتا ہے "لَا أَدْرِيْ كُنْتُ أَقُوْلُ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ" مجھے کچھ پتا نہیں ہے، جو لوگ کہتے تھے میں بھی وہی کہتا تھا۔ تو اسے کہا جاتا ہے "لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ" پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے کنپٹیوں پر مارا جاتا ہے تو وہ چیختا ہے، اس کی چیخ وپکار کو جن وانس کے علاوہ ساری مخلوق سنتی ہے۔[44]

علامہ کرمانی رحمہ اللہ شارح بخاری نے "لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ" کا معنی لکھا ہے:

(قَوْلُهٗ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ) اَيْ لَا عَلِمْتَ بِنَفْسِكَ بِالْاِسْتِدْلَالِ وَ لَا

44۔ صحیح البخاری، رقم:1338

تَلَوْتَ الْقُرْآنَ اَوِ الْمَعْنٰى لَا اتَّبَعْتَ الْعُلَمَاءَ بِالتَّقْلِيْدِ فِيْمَا يَقُوْلُوْنَ.[45]

کہ تو دلیل کی بنیاد پر بات جانتا بھی نہیں تھا اور علماء کی تقلید کر کے بات مانتا بھی نہیں تھا۔

اور آخرت کے دن ترک تقلید کا نقصان کیا ہو گا؟ تارکینِ تقلید کہیں گے:

﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰﴾

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں:

"بعض حضرات مفسرین کرام نے "نَسْمَعُ" کو تقلید پر اور "نَعْقِلُ" کو تحقیق واجتہاد پر محمول کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں سے یہی مراد ہے کہ یہ دونوں نجات کے ذریعے ہیں۔"[46]

"نَعْقِلُ" کا معنی ہوتا ہے دلیل سے خود بات سمجھنا اور "نَسْمَعُ" کا معنی کہ دلیل نہیں سمجھ سکتے تھے تو سمجھانے والے کی بات توجہ سے سن لیتے اور مان لیتے۔ اسی کا نام تقلید اور اجتہاد ہے۔ تو ترکِ تقلید کا نقصان آخرت میں یہ ہے کہ انسان جہنم میں جائے گا۔

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝۱۵﴾

ذلول کہتے ہیں ایسے جانور کو جو سواری کے لیے خود کو پیش کرے اور سرکشی نہ کرے، ایسا جانور جو آرام سے سوار کو اپنے اوپر بٹھائے اور آگے ہے ﴿فَامْشُوْا فِيْ

45۔ حاشیۃ صحیح البخاری: ج 1 ص 178 طبع قدیمی کتب خانہ کراچی

46۔ تفسیر عزیزی اردو: ج 3 ص 23

﴿مَنَاكِبِهَا﴾ مناکب کہتے ہیں کندھے کو۔ بیٹھتے تو جانور کی پیٹھ پر ہیں، کندھوں پر نہیں بیٹھتے لیکن یہاں کندھوں کا ذکر ہے۔ دراصل یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسا جانور جو اپنے کندھے بھی پیش کر دے تو بتاؤ وہ کتنا مطیع ہو گا؟ تو یہ سمجھایا ہے کہ دیکھو! زمین کو اللہ نے اس جانور کی طرح بنایا ہے کہ جو اپنے کندھے بھی پیش کر دے یعنی اللہ نے کیسے زمین کو تمہارے لیے مطیع کر دیا ہے۔

اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کا علمی جائزہ:

﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿١٧﴾﴾

کیا تم اس اللہ کی اس بات سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور زمین تمہیں نگل جائے، کیا تم اس اللہ کی اس بات سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہارے اوپر پتھر برسائے۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہے۔

اب یہاں دیکھو! اللہ کی ذات کے بارے میں فرمایا "مَّنْ فِي السَّمَآءِ" کہ وہ اللہ جو آسمان میں ہے۔ تو وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ عرش پر ہے، یہ دونوں آیتیں ان کے خلاف ہیں کیوں کہ آسمانوں پر کرسی ہے، کرسی پر سمندر ہے، سمندر پر عرش ہے یہ یہاں "مَّنْ فِي السَّمَآءِ" فرمایا۔ اگر "عَلَى الْعَرْشِ" ہو گا تو "مَّنْ فِي السَّمَآءِ" کیسے ہو گا؟ یہ تو قرآن کا ظاہر بتا رہا ہے کہ اللہ عرش پر نہیں ہے بلکہ آسمان میں ہے! اور جہاں تک معاملہ ہے ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ تو اس کو بہت سارے علماء نے متشابہات میں سے لکھا ہے جبکہ یہ آیت ﴿مَّنْ فِي السَّمَآءِ﴾ تو متشابہات میں سے

بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا عرش پر ہونا قرآن کے ظاہر کے مطابق ہے تو اس سے بڑا دنیا میں جھوٹ کیا ہو گا؟ ظاہر کے مطابق کیسے ہے ؟ زیادہ سے زیادہ اگر آپ نے کہنا ہی ہے تو یہ کہہ دو کہ قرآن کریم کی بعض آیات کے ظاہر کے مطابق ہے، یہ تو نہ کہو کہ ظاہر کے مطابق ہے۔ میں اس لیے آپ حضرات کو سمجھاتا ہوں کہ بعض لوگ اعتدال کا نام استعمال کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہم سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں اور نام اعتدال کا ہوتا ہے۔

بس یہ چند آیتیں عقائد کے متعلقہ تھیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ ہمیں صحیح عقائد و نظریات پر قائم رکھے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورة القلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿نٓ وَ الۡقَلَمِ وَ مَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾﴾

"نٓ" متشابہات میں سے ہے، حروف مقطعات میں سے ہے جس کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

قلم سے کیا مراد ہے؟

"وَ الۡقَلَمِ" قسم ہے قلم۔ اس سے مراد یا تو قلمِ تقدیر ہے یا مراد قلمِ خلائق ہے۔ قلمِ تقدیر سے مراد وہ قلم ہے جسے اللہ نے مخلوقات کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے حکم دیا تھا کہ لکھو، اللہ پاک نے جو کچھ لکھوانا تھا وہ سب کچھ لکھ دیا۔ یا اس سے مراد قلمِ خلائق ہے یعنی مخلوقات کی قلم جس سے مخلوق لکھتی ہے۔ یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، قلمِ تقدیر بھی اور قلمِ خلائق بھی لیکن سورۃ العلق میں ﴿اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾﴾ میں قلم سے مراد قلمِ تقدیر نہیں بلکہ قلمِ خلائق ہے یعنی مخلوق والی قلم۔ لیکن یہاں سورۃ القلم میں تو دونوں مراد ہیں۔

﴿مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ﴾ میرے پیغمبر! اللہ کا فضل ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو آپ کو مجنون کہتے ہیں۔

خلق عظیم کی حامل شخصیت:

﴿وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝۳ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صاحبِ اخلاق تھے۔ ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بات جو چلائی جاتی ہے کہ اسلام اخلاق سے پھیلا ہے، جہاد اور تلوار سے نہیں پھیلا یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور شریعت پر بہت بڑا بہتان اور الزام ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تلوار کو اخلاق سے الگ کیا جا رہا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے گھر سے تلواریں ہی نکلی تھیں۔ تو نبی کے گھر سے نکلنے والی چیز اخلاق کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے تلوار اخلاق کا جز ہے، اخلاق سے خارج نہیں ہے۔

تلوار؛ اخلاق سے خارج نہیں:

زبان سے سمجھانا چاہیے لیکن جب سمجھ میں نہ آئے تو پھر دماغ ٹھیک کرنا چاہیے۔ جس طرح کسی آدمی کو سمجھانا اخلاق ہے اسی طرح کسی بد دماغ آدمی کا دماغ ٹھیک کرنا بھی اخلاق ہے۔ تلوار اخلاق میں شامل ہے، اخلاق سے خارج نہیں ہے۔ پھر لوگ بعض مثالیں دیتے ہیں کہ سن کر بھی بندے کو شرم آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک شہزادہ گرفتار ہو کر آیا تو اس نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پانی مانگا۔ جب پانی لے لیا پینے کے لیے تو اس نے کہا کہ جی میں ڈر رہا ہوں کہ پانی پینے لگوں تو مجھے قتل نہ کر دیں۔ فرمایا: نہیں کریں گے! اس نے کہا: جب تک میں پانی نہ پیوں مجھے نہیں ماریں گے؟ فرمایا نہیں ماریں گے۔ اس نے پانی گرا دیا اور اس نے کہا کہ مجھے پتا ہے کہ مسلمان قول کے پکے ہیں، یہ مجھے نہیں ماریں گے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جاؤ تمہیں آزادی ہے، تمہیں نہیں ماریں

گے۔ اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ تو دیکھو! یہ تلوار سے ڈر کر نہیں ہوا تھا بلکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اخلاق کو دیکھ کر ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ شخص حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایسے ہی بیٹھا ہوا تھا؟

جب یہ ایران میں تھا تو ایسی بات کیوں نہیں کرتا تھا وہاں اس کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اخلاق کیوں نظر نہیں آتے تھے؟ تلوار کے سائے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں آیا، یہاں تک اس کو تلوار لائی ہے، اس کے بعد پھر اخلاق دیکھے ہیں۔ تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ تلوار اخلاق سے خارج ہے؟! عجیب بے وقوفی کی بات ہے یہ۔ سورۃ النصر میں ہے: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝۱ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾ جب طاقت استعمال ہوئی نا تو پھر فرد نہیں بلکہ افراد اسلام میں آئے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح فرمایا ہے تو بتاؤ وہ دس آدمی گئے تھے یا دس ہزار گئے تھے؟ (دس ہزار گئے تھے۔ سامعین) خالی ہاتھ گئے تھے یا اسلحہ لے کر گئے تھے (اسلحہ لے کر گئے تھے۔ سامعین) اور جب مکہ میں داخل بھی ہوئے نا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام سے فرمایا تھا کہ ایک دوسرے سے دور دور بیٹھو اور تھوڑے تھوڑے ہو کر بیٹھو، آگ جلاؤ تاکہ پتا چلے کہ ان کی طاقت بہت ہے اور ایک ایک قبیلہ مکہ میں داخل ہو اور تکبیر کے نعرے لگاتے چلے جاؤ! مکہ والوں پر رعب بیٹھ گیا، کسی کی جرأت نہیں تھی دم مارنے کی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق دیکھو کہ "مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِيْ سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ"[47]

47۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج4 ص194 رقم الحدیث 7115

یہ کیسی جرأت سے اعلان ہو رہے ہیں؟! کہ آج جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے گا تو اسے کچھ نہیں کہیں گے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا تو اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے! اور جو حرم میں داخل ہو جائے گا تو اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے!

لوگ کہتے ہیں کہ جی دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا۔ ہم نے کہا: ٹھیک ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف فرمادیا ہے لیکن یہ تو دیکھو کہ کب معاف فرمایا؟ معاف فرمایا ہے جب یہ لوگ تلوار کے نیچے تھے تبھی معاف فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بھی معاف کرتے رہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت نہیں کی تھی تو اس وقت بھی معاف فرماتے رہے لیکن اس وقت تو کوئی مسلمان نہیں ہو رہا تھا اور اب معاف کیا تو اب گروہ در گروہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ اب طاقت والے ہو کر معاف کر رہے ہیں۔ بات سمجھ میں آئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لیے رات کو چھپ کر نکلے تھے جب طاقت نہیں تھی لیکن جب واپس آئے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کا قافلہ لے کر آئے۔

طاقت کی اہمیت کا انکار کبھی نہ کرنا:

اس لیے طاقت کا انکار کبھی نہیں کرنا! ہاں یہ اقرار کرو کہ ہمارے پاس طاقت نہیں ہے! اپنے پاس طاقت نہ ہو اور بندہ طاقت کا انکار کر دے تو یہ درست نہیں ہے! اپنے پاس دولت نہیں ہے تو دولت کا انکار کر دے کہ جی دولت سے کیا ہوتا ہے! یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹنیوں کی مالیت کے برابر کپڑے بھی پہنے ہیں۔ مدینہ میں سب سے قیمتی گھوڑا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا تھا، قیمتی تلوار اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی تھی۔ تمہارے پاس اگر یہ

چیزیں نہیں ہیں تو ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟! میں اس لیے کہتا ہوں کہ شریعت کے مزاج کو سمجھو! بس مزاجِ شریعت سمجھ میں آجائے تو مزہ آتا ہے۔

مداہنت سے احتراز کرو!

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹﴾

یہ عام کفار کے بارے میں بھی ہے اور بطورِ خاص ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہے۔ نو اوصاف اللہ نے اس کے ذکر فرمائے ہیں کہ یہ کتنا گندہ انسان ہے! اگر اس کے پاس دولت ہے تو پھر کیا ہوا؟ اس کی گندگی دیکھو اور ایسے بندے کی بات نہ مانو۔

فرمایا: آپ جھٹلانے والوں کی بات کبھی نہ مانیں۔ یہ کافر چاہتے ہیں کہ تم مداہنت اختیار کرو، دین میں کمزوری اختیار کرو، "فَيُدْهِنُوْنَ" وہ بھی مداہن بن جائیں گے اور تمہاری مخالفت کم کریں گے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مشرکین اور کفار چاہتے ہیں کہ تم ان کے مقابلے میں توحید بیان کرنا کم کر دو تو وہ تمہاری مخالفت میں کمی کر دیں گے۔

مداہنت فی الدین حرام ہے:

اور اس آیت کے تحت تفسیر مظہری اور معارف القرآن میں ہے کہ کفار کی رعایت میں ان کی مخالفت کم کرنا یہ مداہنت فی الدین اور حرام ہے، اضطرار کی صورت اس سے الگ ہے لیکن بغیر کسی اضطراری کیفیت کے ایسا کرنا جائز نہیں۔[48]

میں کہتا ہوں کہ تم کون سی اضطراری صورت میں ہو کہ کبھی ان کی رعایت ہے، کبھی منکرین حیات کی رعایت ہے، کبھی اہلِ بدعت کی رعایت ہے، کبھی فلاں کی

48۔ معارف القرآن: ج 8 ص 533

رعایت ہے! تم کون سی اضطراری کیفیت میں ہو؟ میں نے ایک جگہ عرض کیا، میں نے کہا کہ بین الاقوامی سطح پر تم کفر کو پیغام دینا چاہتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہم اکٹھے ہیں تو ٹھیک ہے تم ان کو بھی ساتھ بٹھاؤ، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن گلی گلی محلہ محلہ ان کو کیوں ساتھ بٹھاتے ہو! ہر جگہ پر اپنا مذہبی اور دینی تشخص خراب کرتے ہو۔ مداہنت فی الدین حرام ہے۔

اکابر کے کلام سے توافق پر خوشی:

مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تفسیر مظہری میں یہ لکھا ہے۔ اس لیے اس کا بہت زیادہ خیال فرمایا کریں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں یہ باتیں اپنے ذوق سے کہتا ہوں لیکن جب مجھے حوالہ ملتا ہے تو اپنے دل کی خوشی پھر میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ وزنِ اعمال کا مدار کیفیت ہے کمیت نہیں لیکن میرے پاس حوالہ نہیں تھا۔ رات دورانِ مطالعہ میرے پاس یہ حوالہ آ گیا تو میں بہت خوش ہوا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "اَحۡسَنُ عَمَلًا" سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اعمال گنے نہیں جائیں گے بلکہ تولے جائیں گے تو اعمال کی بنیاد کمیت نہیں ہے کیفیت ہے۔ "اَحۡسَنُ عَمَلًا" فرمایا "اَكۡثَرُ عَمَلًا" نہیں فرمایا۔ میرا دل کتنا خوش ہوا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے کئی بار کہا کہ میں اصولِ شریعت سے شریعت کے مسائل بیان کرتا ہوں اور جزئیات میرے پاس نہیں ہوتیں لیکن دورانِ مطالعہ پھر جزئیات آتی ہیں۔ ہاں البتہ میں نظائر پیش کرتا رہتا ہوں۔

موقع پر باطل کی وضاحت ضروری ہے:

﴿وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴿١٠﴾﴾

یہ اس کے اوصاف بیان کیے ہیں کہ یہ شخص جھوٹی قسمیں کھاتا ہے، "مَّهِيْنٍ" یہ شخص ذلیل اور کمینہ ہے، "هَمَّازٍ" طعنہ بہت دینے والا ہے، "مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ" چغل خور ہے، "مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ" خیر سے روکتا ہے، "مُعْتَدٍ" حد سے تجاوز کرتا ہے، "اَثِيْمٍ" گناہ گار ہے، "عُتُلٍّ" مزاج کا سخت ہے اور پھر "بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ" بدنام بھی ہے، ولد الزنا اور حرام کی اولاد ہے، "اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ" وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے پاس بہت مال ہے اور اولاد ہے۔

دیکھو! قرآن کتنے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے ایک کافر کے بارے میں اور ہم نے کیا ڈرامہ رچار کھا ہے کہ جی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے! ارے بھائی! قرآن کریم تو کھل کھل کر اس بدمعاش کے اوصاف بیان کر رہا ہے۔

﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝١٦﴾

ہم قیامت کے دن اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔ دور سے پتا چلے گا کہ یہ بدبخت آ رہا ہے۔

باغ والوں کا انجام:

﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝١٧ۙ﴾

یہ اصحاب الجنۃ کون تھے؟ یہ یمن کے شہر صنعاء سے چھ میل باہر ایک آدمی کا باغ تھا اور کھیتی بھی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ جو پھل درختوں سے گرتا فقراء کو دیتا تھا اور جب کھیتی کاشت کرتا تو بھوسے کے ساتھ جو دانے اڑتے وہ بھی فقراء کو دیتا۔ اس کے علاوہ بھی دیتا رہتا تھا۔ وہ فوت ہو گیا تو اولاد نے چاہا کہ یہ مال غریبوں کو نہیں ملنا چاہیے، لہذا ہم صبح صبح جلدی جلدی جائیں اور غریبوں کے آنے سے پہلے ہی کھیتی توڑ

لیں۔ جب یہ لوگ گئے تو اللہ نے ان کے کھیت کو جلا کے راکھ کر دیا۔

﴿فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ ﴿۲۰﴾﴾

صریم کا معنی ہوتا ہے مقطوع، کاٹا ہوا۔ تو یہ باغ بھی ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی ہوتی ہے کہ زمین بالکل صاف ہو گئی، اور صریم؛ رات کو بھی کہتے ہیں ۔ اس صورت میں معنی ہو گا کہ یہ کھیت جل کر ایسے سیاہ ہو گیا جیسے راکھ ہوتی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم راستہ بھول گئے، ہمارا باغ ادھر تو نہیں تھا۔ پھر کہا کہ نہیں، ادھر ہی تھا۔ جو ہم نے حرکت کی کہ کوئی مسکین ہمارا مال نہ کھائے یہ اس کی سزا ملی ہے۔ اب اللہ سے معافی مانگو! انہوں نے معافی مانگی، توبہ کی۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ نے پھر ان کو یہ باغ عطا فرما دیا تھا۔

تجلی ساق کا ظہور:

﴿یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّ یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَۃً اَبۡصَارُہُمۡ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ؕ وَ قَدۡ کَانُوۡا یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ وَ ہُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب ساق کی تجلی فرمائیں گے اور ان کافروں کو سجدے کی طرف بلایا جائے گا تو کافر سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر سوار ہو گی کیوں کہ دنیا میں سجدے کی طرف بلایا جاتا تو یہ لوگ صحیح سالم ہونے کے باوجود سجدہ نہیں کرتے تھے۔ لہذا اب قیامت کے دن بھی ان کو سجدے کی توفیق نہیں ہو گی۔

"ساق" اللہ تعالی کی ایک خاص تجلی ہے جس کا اظہار قیامت کے دن ہو گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جو لوگ دنیا میں سجدہ کرتے تھے وہ تو از خود سجدے میں گر جائیں

گے اور جو دنیا میں سجدہ نہیں کرتے تھے ان کو قیامت کے دن بھی سجدے کی توفیق نہیں ہوگی۔ بہت سارے مفسرین یہاں ساق کا لغوی معنی پنڈلی کر دیتے ہیں جس سے عام بندے کو شبہ پڑ جاتا ہے کہ شاید اللہ کی پنڈلی ہے حالانکہ اللہ رب العزت جس طرح جسم سے پاک ہے اسی طرح اعضائے جسم سے بھی پاک ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں ساق کا معنی پنڈلی نہیں فرماتے بلکہ ساق کا معنی ساق ہی فرماتے ہیں۔ اس لیے اسلم اور احوط طریقہ یہی ہے کہ ساق کا معنی پنڈلی کے بجائے ساق ہی کیا جائے، ید کا معنی ہاتھ کے بجائے ید ہی کیا جائے تو اس میں عوام کو بات سمجھانی بہت آسان ہو جاتی ہے۔

﴿فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

یہ جو فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّكَذِّبُ ہے یہ محاورہ ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں: تم مجھے اور اسے چھوڑو، میں جانوں اور یہ جانیں! یہ محاورات ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے پیغمبر! جو ہماری باتوں کی تکذیب کرتا اسے مجھ پر چھوڑ دو! میں اس کو ڈھیل دے کے وہاں پہنچا دوں گا جہاں یہ سوچ بھی نہیں سکے گا، جہنم میں جائے گا سیدھا، چھوڑو ان کو، میں جانوں اور یہ جانیں۔ تو اللہ نے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا اجتہاد:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰی وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾﴾

میرے پیغمبر! آپ صبر کریں، وقت پر ان پر عذاب آئے گا، آپ ہمت سے کام لیں، اپنے کام میں لگے رہیں اور حضرت یونس علیہ السلام کی طرح آپ نہ کریں۔ یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا۔ قوم نے ان کی نہیں مانی۔ تو انہوں نے

قوم سے کہا کہ تین دن میں عذاب آنے والا ہے۔ یہ کہا اور چلے گئے۔ ابھی عذاب کے وہ آثار نہیں تھے کہ جن کے آنے پر انسان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ چنانچہ قوم جنگل میں نکلی، معافیاں مانگیں تو اللہ نے ان سے عذاب کو ٹال دیا۔ یونس علیہ السلام بستی کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا کہ عذاب آرہا ہے، آثارِ عذاب دیکھے لیکن ابھی وہ آثار نہیں تھے جن میں توبہ قبول نہیں ہوتی۔ انہوں نے سمجھا کہ عذاب آرہا ہے۔ تو ان کا اجتہاد تھا اس لیے وہ چلے گئے۔

پھر سوچا کہ واپس جاؤں گا تو قوم مجھے جھٹلا دے گی کہ یہ نبی ہے؟ اس نے کہا تھا کہ عذاب آرہا ہے اور عذاب تو آیا نہیں۔ پھر آپ دریا کی طرف گئے اور کشتی میں بیٹھے اور کسی اور شہر جانے لگے۔ آگے کشتی والا واقعہ آپ کے علم میں ہے کہ کشتی بھنور میں پھنسی اور ملاح نے کہا کہ کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ فرمایا: وہ تو میں ہوں۔ قرعہ نکالا تو ان کا نام نکلا۔ انہوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ مچھلی نے منہ میں لیا۔ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ پھر باہر آئے۔ وہاں پر کدو کی بیل لگی ہوئی تھی۔ ایک ہرنی آئی، وہ دودھ پلاتی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام صحت مند ہوئے اور واپس آگئے۔

تو فرمایا: ﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ کہ آپ یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہونا! حضرت یونس تھوڑی جلدی کر گئے تھے، آپ جلدی نہ کرنا، آپ صبر کریں، ہم وقت پر ان سے نمٹ لیں گے۔ یا تو دنیا میں انہیں عذاب دیں گے یا موت کے بعد.

یہ حضرت یونس علیہ السلام کا اجتہاد تھا۔ دیکھو! اجتہاد مجتہد امتی سے بھی ہوتا ہے اور اجتہاد مجتہد نبی سے بھی ہوتا ہے اور خطا کبھی مجتہد امتی کے اجتہاد میں ہوتی ہے اور کبھی مجتہد نبی کے اجتہاد میں ہوتی ہے۔ لیکن دونوں میں فرق ہے۔ چونکہ مجتہد امتی پر وحی نہیں آتی اس لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی خطائے اجتہادی پر موت تک قائم رہے اور اسی طرح دنیا سے چلا جائے لیکن اس پر بھی ایک اجر کا وعدہ ہے۔ لہٰذا اس کو

ثواب ملے گا، اور مجتہد نبی اجتہاد کرے اور خطا ہو جائے تو اس پر وحی آجاتی ہے اور وحی کے بعد خطائے اجتہادی ختم کر کے نص دے دی جاتی ہے اور پیغمبر کی خطائے اجتہادی کی حیثیت یہی ہوتی ہے جیسے پہلے ایک نص ہو اور اس کو منسوخ کر کے اس کے بدلے میں نئی نص کو لایا جائے۔ اس لیے پیغمبر پر اعتراض بھی نہیں ہوتا۔

حضور علیہ السلام کی حفاظت:

﴿وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں کو جب نصیحت کی جارہی ہوتی ہے تو یہ نبی کو ایسے گھور کے دیکھتے ہیں جیسے اپنی آنکھوں سے پھسلا دیں گے، راہِ حق سے ہٹا دیں گے۔ یہ بھی محاورہ ہے جیسے ہمارے ہاں محاورات میں ہوتا ہے کہ تو مجھے دیکھتا ایسے ہے جیسے کھا جائے گا۔ تو یہاں بھی محاورہ استعمال کیا گیا ہے کہ کافر لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے حق سے پھسلا دیں گے۔ البتہ بعض روایات میں ہے کہ مکہ میں ایک شخص تھا جو نظر لگانے میں معروف تھا۔ مکہ والوں نے اس کو بلایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بد لگاؤ۔ اس نے بہت تاڑ تاڑ کے دیکھا لیکن اس کی نظر بد سے بھی اللہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ فرمالیا۔

نظر بد کا علاج:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے: اگر کسی شخص کو نظر لگ جائے تو یہ آیات پڑھ کر دم کرے تو اللہ شفا دیتے ہیں۔ یہ آیات ﴿وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ﴾ سے لے کر آخر سورت تک پڑھنی ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورة الحاقة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"الحاقّۃ" قیامت کا ایک نام ہے:

﴿اَلۡحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾﴾

ثابت ہے اور تمہیں کیا خبر کہ وہ ثابت چیز کیا ہے؟

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام "اَلۡحَآقَّةُ" بھی ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے ثابت ہونے والی یا ثابت کرنے والی۔ قیامت پر دونوں معنی صادق آتے ہیں کہ قیامت برحق ہے اور ثابت ہے، یہ ضرور ہوگی اور یہ ثابت کرنے والی بھی ہے کہ قیامت کے دن مسلمانوں کے لیے جنت کو ثابت کرے گی اور کافروں کے لیے جہنم کو ثابت کرے گی۔

﴿كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَ عَادٌۢ بِالۡقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِكُوۡا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾﴾

یہاں قومِ ثمود اور عاد کا تذکرہ کیا ہے کہ جب انہوں نے قیامت کو جھٹلایا تھا۔ یہاں قیامت کا دوسرا نام ہے "اَلۡقَارِعَةِ" ذکر کیا ہے یعنی کھڑکھڑا دینے والی اور قیامت ہے بھی اسی طرح۔ تو جب انہوں نے جھٹلایا تو پھر ثمود کا انجام تو یہ ہوا کہ وہ

سرکش ہوا کے ذریعہ ہلاک کر دیے گئے۔

﴿وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝﴾

”صرصر“ کا معنی ہے ٹھنڈی ہوا اور عاتیہ کا معنی ہے سرکش ہوا۔ یعنی قوم عاد پر ہوا ایسے چلی جیسے سرکش ہو، کوئی اس کو کنٹرول کرنے والا نہ ہو۔ اس ہوا نے ان کو برباد کر کے رکھ دیا۔ یہ ہوا سات راتیں اور آٹھ دن چلی تھی یعنی بدھ کے دن صبح کو چلی اور آئندہ بدھ شام کو جا کے رکی۔ تو اس طرح راتیں سات بنی ہیں اور دن آٹھ بنے ہیں۔ ”حُسُوْمًا“ کا معنی ہوتا ہے کاٹنے والی۔ تو اس ہوا نے ان کو کاٹ کے رکھ دیا اور قد ان کے لمبے تھے اور یہ لوگ ایسے پڑے ہوئے تھے کہ جیسے کھجور کے تنے کو کاٹ کر رکھ دیں۔

دو نفخوں کا بیان:

﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝﴾

قرآن کریم میں دو نفخوں کا ذکر ہے؛

[1]: پہلے نفخہ کا ذکر ﴿وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ [49] میں ہے۔ پہلے نفخہ کو نفخہ صعق کہتے ہیں۔ صور کی شکل سینگ کی طرح ہو گی۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونکیں گے۔ شروع میں اس کی آواز کم ہو گی لیکن آہستہ آہستہ آواز بڑھتی جائے گی، پھر اتنی تیز آواز ہو جائے

49۔ الزمر 68:39

گی کہ لوگوں کے کان پھٹ جائیں گے اور سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ یہ پہلا نفخہ ہو گا۔

[2]: دوسرے نفخہ کا ذکر ﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾[50] میں ہے کہ جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سارے اٹھ کر میدان میں آ جائیں گے۔ اس نفخہ کو نفخہ بعث بھی کہا جاتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ان دو کے علاوہ ایک اور نفخہ بھی ہے، اس کو نفخۃ فزع یعنی گھبراہٹ کا نفخہ کہتے ہیں۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ تینوں ممکن ہیں، اس طرح کہ جو سب سے پہلے صور پھونکا جائے تو اس میں آدمی پر گھبراہٹ طاری ہو گی، پھر دوسرے میں بے ہوشی طاری ہو گی، پھر تیسرے میں سارے اٹھا دیے جائیں گے۔ تو یہ تین مرتبہ صور کو پھونکا جائے گا۔

﴿وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ﴿۱۷﴾﴾

اس وقت اللہ کے عرش کو چار فرشتوں نے اٹھایا ہے۔ قیامت کے دن چار اور ہوں گے اور یوں آٹھ فرشتے عرش کو اٹھائیں گے۔ اس کی حکمت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾﴾

50۔ الزمر 68:39

جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا تو وہ لوگوں کو بلائیں گے کہ دیکھو! میرے اعمال نامے کو پڑھو۔ مجھے دنیا میں یقین تھا کہ میرا حساب ہو گا۔ یہ شخص جنتی ہے۔ اس کو اونچے اونچے باغات ملیں گے جس کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے۔

﴿وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ ۬ فَیَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُوۡتَ کِتٰبِیَہۡ ﴿ۚ۲۵﴾ وَ لَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِیَہۡ ﴿ۚ۲۶﴾ یٰلَیۡتَہَا کَانَتِ الۡقَاضِیَۃَ ﴿ۚ۲۷﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَہۡ ﴿ۚ۲۸﴾ ہَلَکَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَہۡ ﴿ۚ۲۹﴾﴾

اور جس کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا تو وہ کہے گا کہ کاش! مجھے اعمال نامہ نہ ہی ملتا! اور مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ کاش مجھے اس سے پہلے موت ہی آ جاتی! میرا امال بھی میرے کچھ کام نہ آیا اور میری طاقت و سلطنت بھی خاک میں مل گئی۔

جہنمیوں کا انجام:

﴿خُذُوۡہُ فَغُلُّوۡہُ ﴿ۙ۳۰﴾ ثُمَّ الۡجَحِیۡمَ صَلُّوۡہُ ﴿ۙ۳۱﴾ ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَۃٍ ذَرۡعُہَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُکُوۡہُ ﴿ؕ۳۲﴾﴾

حکم ہو گا: اس کو پکڑو اور جہنم میں پھینکو۔ سات ہاتھ لمبی زنجیر ہو گی جس میں ڈال کر جہنم میں پھینکا جائے گا۔ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ زنجیر ایسی ہو گی جسے آدمی کے جسم میں ایک طرف ڈال کر دوسری جانب سے نکالا جائے گا جس طرح تسبیح کے دانے سے دھاگہ گزارا جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

﴿اِنَّہٗ کَانَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ ﴿ۙ۳۳﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ﴿ؕ۳۴﴾﴾

یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین نہیں رکھتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔

بڑا جرم کفر ہے یعنی اللہ رب العزت پر ایمان نہ لانا اور اس کے بعد بڑا جرم مسکین کو کھانا نہ کھلانا ہے۔ اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین کو کھانا نہ کھلانا اور مستحق کو نہ دینا یہ بہت بڑا جرم ہے۔

﴿فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

آج ان جہنمیوں کا وہاں پہ کوئی دوست نہیں ہو گا اور غسلین کے علاوہ کوئی کھانا نہیں ہو گا! اسے مجرم لوگوں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔ یہی گناہگار لوگ اسے کھائیں گے۔

"غِسْلِيْنٍ" اس پانی کو کہتے ہیں جس سے پیپ کو دھویا جائے۔ تو یہ پانی ان جہنمیوں کو پینے کے لیے دیا جائے گا۔

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾

میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ جسے تم دیکھتے ہو یعنی تمام مخلوقات جسے بندے دیکھتے ہیں مثلاً چاند، سورج، پہاڑ وغیرہ اور جو نظر نہیں آتیں جیسے عالمِ بالا کی مخلوقات ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ" سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔

قرآن شعر نہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾

یہ رسول کی بات ہے اور شاعر کی بات نہیں ہے۔ اس پر پہلے بات ہو چکی ہے کہ وہ لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میرا

رسول شاعر نہیں ہے۔

پیغمبر اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا:

﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾﴾

یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اپنی طرف سے باتیں کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ پیغمبر کوئی اپنی طرف سے کوئی بات ہماری طرف منسوب کر کے کہتے تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، پھر ہم ان کی شہ رگ کو کاٹ کے رکھ دیتے!

اصل میں "الْوَتِيْنَ" کہتے ہیں ایسی رگ کو جو دل سے نکلتی ہے اور اس کے ذریعے روح پورے بدن میں پھیلتی ہے، وہ رگ کٹے تو آدمی فوراً مر جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات کرتے تو ہم ختم کر کے رکھ دیتے۔

یہاں اچھی طرح یہ بات سمجھیں کہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے گا اس کی سزا یہ ہو گی کہ دنیا میں اللہ اس کو ہلاک کر دیں گے۔ یہاں قانون نہیں بیان کیا۔ یہاں صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بات کی ہے کہ تم کہتے ہو کہ یہ اپنی طرف سے بات کہتے ہیں، اگر یہ اپنی طرف سے کوئی بات کرتے تو ہم ایسا کرتے، جب ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پیغمبر ہماری بات کرتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرماتے۔

﴿وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾﴾

یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور کام کرنے والوں کو

طریقہ بتایاہے کہ یہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں، یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں، اس کا حل کیا ہے؟ فرمایا: ﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِیۡمِ ﴿٥٢﴾﴾

آدمی عبادات میں مشغول ہو جائے، آدمی جب اس میں مشغول ہو جائے تو پھر لوگوں کی مخالفت اس پر اثر نہیں کرتی۔ دوسرے مقام پر ہے:

﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ یَضِیۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَكُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿٩٨﴾﴾[51]

اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں کی وجہ سے آپ کا دل گھٹتا ہے، آپ کا دل تنگ ہوتا ہے۔ جب ایسا معاملہ ہو تو آپ سجدہ کریں اور تسبیح کریں۔

یہ جس طرح پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا اسی طرح پیغمبر کے ورثاء علماء کرام کے لیے بھی ہے کہ جب لوگ مخالفت کریں، لوگ تردید کریں، لوگ تکذیب کریں اور مخالف دکھ دینے پر اتر آئے تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ جواب میں گالیاں دو بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ سجدے کرو، تسبیح کرو، عبادات میں مشغول ہو جاؤ! اس سے اللہ رب العزت انسان کے دل کو تسلی عطا فرما دیتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

51۔ الحجر 15:97، 98

سورۃ المعارج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نضر بن حارث کی بے جا جرأت:

﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَہٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰہِ ذِی الۡمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾﴾

نضر بن حارث نے قرآن کو جھٹلانے میں حد درجہ جرأت سے کام لیا، اس نے کہا:

اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ.[52]

اے اللہ! اگر یہ قرآن سچا ہے اور آپ کی طرف ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسائیں۔

اللہ فرماتے ہیں کہ ایک بندے نے عذاب مانگا ہے جو کافروں پر آنے والا ہے اور اس عذاب کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے، یہ عذاب اللہ کی طرف سے آئے گا جو آسمانوں کا مالک ہے۔

یہاں اللہ کی صفت بیان کی ہے ﴿ذِی الۡمَعَارِجِ﴾، معارج: معراج کی جمع ہے بمعنی سیڑھیاں۔ مراد اس سے آسمان ہے۔ چونکہ اوپر جائیں تو پہلا آسمان، پھر

52۔ المستدرک علی الصحیحین: ج3 ص329 رقم الحدیث 3908

دوسرا آسمان، پھر تیسرا آسمان، ایسے سیڑھیوں کی طرح ہے۔

قیامت کے دن کی مقدار؛ تعارض کا حل

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾

فرشتے اور روح ایسے دن میں اللہ کی طرف جاتے ہیں جو پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

اب یہاں پر یہ ہے کہ وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے اور سورۃ السجدۃ میں ہے ﴿كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ کہ یہ دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں میں تعارض ہے کہ یہاں فرمایا کہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے اور اکیسویں پارے میں فرمایا کہ ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہو گا۔

اس کا ایک تو معروف جواب ہے کہ یہ ہر آدمی کی کیفیت اور احوال کے اعتبار سے ہے۔ جو زیادہ گناہ گار ہوں گے ان کو ایسا لگے گا کہ یہ دن پچاس ہزار سال کا ہے اور جو کم گناہ گار ہوں گے، کفر میں کم ہوں گے ان کو محسوس ہو گا کہ ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے اور ایمان والوں کے لیے اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”كَقَدْرِ مَا بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ“[53] کہ ظہر سے عصر کے درمیان کا جو وقت ہے قیامت کا پورا دن ایمان والوں کے لیے ایسا ہو گا۔

تفسیر مظہری میں اس کا جواب اس سے بھی زیادہ مناسب دیا گیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہے دنیا کا اور ایک دن ہے آخرت کا۔

53۔ کنز العمال: ج14 ص192 رقم 38337

یہ جو فرمایا کہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو گا تو یہ آخرت اور حشر کا دن ہے، ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ یہ آخرت کے لیے ہے، اور یہ جو دوسرے مقام پر فرمایا ﴿كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ کہ ایک دن ایک ہزار کے برابر ہو گا تو یہ آخرت کا نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کا ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ زمین سے آسمان کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال ہے۔ اگر کوئی بندہ اوپر جائے اور حکم لے کر آئے تو اس کو ہزار سال لگے گا، پانچ سو سال جانے میں اور پانچ سو سال واپس آنے میں اور جبرائیل امین علیہ السلام ایک ہی دن میں آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ تو تمہارا کام جو ایک ہزار سال کا تھا وہ فرشتہ ایک دن میں کر لیتا ہے۔ تو یہ دنیا والا ایک دن مراد ہے۔ اب دیکھو! اس توجیہ سے تعارض ہی ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت عزیر کے قصہ سے منکرین کا استدلال اور اس کا جواب:

اچھا یہاں وہ نکتہ ذہن میں رکھیں کہ اگر قیامت کا دن ہو پچاس ہزار سال یا ایک ہزار سال کے برابر تو اس سے انبیاء علیہم السلام کی حیات فی القبر پر جو اعتراض ہوتا ہے اس کا جواب بڑے آرام سے دیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام ایک تباہ شدہ بستی سے گزر رہے تھے تو فرمایا: ﴿اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ کہ اللہ اس بستی کو کیسے زندہ کریں گے؟ ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ اللہ نے انہیں ایک سو سال موت دی، پھر ان کو زندہ کیا۔

تو یہ لوگ اس سے دلیل بناتے ہیں کہ قبروں میں انبیاء علیہم السلام زندہ نہیں ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ دیکھو! جب ایک سو سال کے بعد اللہ نے ان کو اٹھایا تو پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ کہ آپ کتنا عرصہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہ کر آیا ہوں۔ تو اس سے معلوم ہوا

کہ نبی قبر میں مردہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کو پتا نہیں چلا کہ میں کتنا عرصہ رہا ہوں۔ تو یہ دلیل ہے کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہوتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ کہ آپ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو تو انہوں نے کہا کہ دن یا دن کا بعض حصہ، تو دنیا کا ایک ہزار سال آخرت کا ایک دن ہوتا ہے اور جب دنیا کا ایک سو سال ہو گا تو آخرت کا کچھ حصہ ہو گا، مکمل دن نہیں ہو گا۔ تو جب پوچھا کہ ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ آپ کتنا ٹھہرے ہیں؟ آپ نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ حضرت عزیر نے اُدھر کا بتایا تھا کہ جہاں رہ کر آئے تھے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ کہ آپ سو سال ٹھہرے ہیں دنیا کا۔ ہم نے یہاں کا پوچھا ہے وہاں کا نہیں پوچھا! تو انہوں نے وہاں کا بتایا جو بعض دن بنتا ہے اور اللہ نے یہاں کا بتایا جو ایک سو سال بنتا ہے۔ تو اس سے تو نبی کا علم ثابت ہوتا ہے، لاعلمی ثابت نہیں ہوتی۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت عزیر کو پتا نہیں چلا تھا۔ تو پتا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہوتا۔ دیکھو! اصحاب کہف سوئے ہوئے تھے اور قرآن کریم میں ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ﴾ کہ تم سمجھتے ہو کہ اصحابِ کہف جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ تو سونے والے بندے تو مردہ نہیں ہوتے۔ جب یہ اٹھے ہیں تو آپس میں پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ کہ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ کہا: ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔ تو یہ تو زندہ تھے، مرے ہوئے نہیں تھے۔ ثابت ہوا کہ عدمِ علم؛ عدمِ حیات پر دلیل نہیں ہے۔ اس لیے اس کو عدمِ حیات پر دلیل بنانا درست نہیں ہے۔ اللہ تعالی بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

قیامت کی ہولناکی:

﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝٨ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝٩﴾

قیامت کے دن آسمان کیسے ہوں گے؟ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ ہوں گے۔ مُہل کہتے ہیں تلچھٹ کو، یہ جو گاڑی کا آئل چینج کرتے ہیں وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر ہے: "كَالدِّهَانِ" کہ یہ آسمان سرخ ہوگا تپتی ہوئی آگ کی طرح۔ تو بظاہر تعارض لگتا ہے حالانکہ تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ شروع میں سیاہ ہو اور بعد میں سرخ ہو جائے، یا یہ ہو کہ کبھی سیاہ ہو جائے اور کبھی سرخ ہو جائے۔ دونوں چیزیں موجود ہیں، اس لیے ان میں تعارض نہیں ہے۔

﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝١٧﴾

یہ آگ کی صفت بیان کی ہے۔ "نَزَّاعَةً" ایک شعلہ ہے، "لِّلشَّوٰى" یہ شواۃ کی جمع ہے۔ یہ سر کی کھال کو بھی کہتے ہیں اور باقی جسم کی کھال کو بھی۔ تو فرمایا کہ یہ آگ ایسی ہوگی جو انسان کی کھال کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

انسان کی بے صبری:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝١٩ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝٢٠ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝٢١﴾

انسان کی فطرت بیان کی ہے کہ انسان بہت بے صبرا اور کم ہمت ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچے تو حد سے تجاوز کر کے گڑگڑاتا ہے اور جب اس کو مال ملے تو پھر حق ادا نہیں کرتا بلکہ بخل کرتا ہے۔

اب اس پر سوال یہ ہے کہ جب انسان کی فطرت میں شامل ہے گڑگڑانا اور بخل کرنا تو پھر گڑگڑانے پر اعتراض کیوں ہے؟ اور بخل کرنا جرم کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض چیزیں انسان کی فطرت میں ہوتی ہیں اور اسی پر امتحان ہوتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا! امتحان تو اسی چیز کا نام ہے کہ اللہ نے انسان کی طبیعت میں رکھا ہے کہ جب آدمی کے سامنے پانی آئے تو پینے کو جی چاہے، اب روزہ رکھا ہو گرمی کا تو فطرت ہے کہ پیاس لگتی ہے مگر انسان اس فطرت پر عمل نہیں کرتا۔ اگر اس فطری تقاضے پر عمل کرے گا تو گناہ ہو گا، عمل نہیں کرے گا تو تقویٰ ہو گا۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان اس پر عمل شروع کر دے بلکہ اس پر عمل نہ کر کے اس سے بچنا چاہیے۔

خشوع خضوع کے ساتھ نماز کی پابندی:

﴿إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾

یہاں دیکھیں! دو صفتیں بیان کی ہیں: کہ یہ لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ آگے ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ کہ یہ لوگ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں تکرار ہے کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ بات تو ایک ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے، یہ جو فرمایا: ﴿عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ نماز کے اول سے لے کر نماز کے آخر تک ہمیشہ نماز کے آداب کی رعایت کرتے ہیں اور یہ جو فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ تو اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ نماز میں ہمیشہ خشوع اختیار کرتے ہیں۔ تو پہلے سے مراد ہے اول تا آخر اور اس سے مراد ہے ہمیشہ، لہذا اس میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

﴿كَلَّا ؕ إِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾

مشرکین کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بہت اچھے طریقے سے جانتے ہیں کہ ہم نے ان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ یہ دلیل اس بات پہ دی ہے کہ مشرکین کا خیال یہ تھا کہ جب ہم مر جائیں گے، ہڈیاں ہو جائیں گے، ریزہ ریزہ بنیں گے تو دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ پانی کے ایک قطرے سے ہم نے پورا جسم بنایا۔ پانی کے قطرے سے پورا جسم بنانا یہ زیادہ مشکل ہے اور جب انسان پیدا ہو اور مر جائے تو اس انسان کو دوبارہ بنائیں تو یہ آسان ہے۔ تو جو کام مشکل تھا تم اس کو مانتے ہو، تو اس سے آسان کام کرنا کیا یہ ہمارے بس میں نہیں ہے؟

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾﴾

میرے پیغمبر! ہم تو اس بات پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکتے!

﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾

ان کو چھوڑو، ان کو گپیں لگانے دو، جھوٹ بولنے دو، ایک وقت آئے گا کہ جب یہ اس دن سے جا ملیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ مراد اس سے قیامت کا دن ہے۔ اس دن یہ لوگ قبروں سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے جیسے عبادت کے لیے کسی بت کی طرف دوڑتے ہیں، تو یوں آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ النوح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ نے ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ جا کر اپنی قوم کو دعوت دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کی عمر میں نبوت دی ہے۔ ﴿فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا﴾[54] اور ساڑھے نو سو سال ان کی عمر ہوئی ہے۔ چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی اور کل عمر ساڑھے نو سو سال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نو سو دس سال یہ مسلسل دعوت دیتے رہے اور اتنی مشکلات میں نوح علیہ السلام نے دعوت دی ہے کہ ان کی مثال انبیاء علیہم السلام میں شاید نظر نہ آئے۔

نوح علیہ السلام کی عمر اتنی زیادہ تھی لیکن آپ کی قوم کی عمر اتنی بڑی نہیں تھی۔ یہ آپ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ آپ کی عمر اتنی بڑی تھی۔ انہوں نے اپنی قوم کی

54۔ العنکبوت 14:29

کئی نسلیں دیکھی ہیں۔ بسا اوقات یہ دعوت دیتے تو ان کی قوم کے لوگ ان کو کسی کمبل میں لپیٹ کر پھینک دیتے اور اوپر سے مارتے، وہ سمجھتے کہ شاید نوح علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں، وہ چھوڑ کر چلے جاتے۔ کئی گھنٹے اس طرح گزر جاتے، پھر نوح علیہ السلام کو جب ہوش آتا تو آپ علیہ السلام اٹھتے اور اٹھ کر پھر اپنی قوم کو دعوت دیتے اور اللہ سے یہ دعا کرتے:

"رَبِّ اهۡدِ قَوۡمِیۡ فَاِنَّهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ"[55]

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما، یہ مجھے جانتے نہیں ہیں کہ میں ان کا کیسا خیر خواہ ہوں۔

اور بعضوں نے لکھا ہے کہ قوم کے لوگ آپ کا گلہ گھونٹ کر چھوڑ دیتے اور سمجھتے کہ یہ فوت ہو گئے، چھوڑ کر چلے جاتے، جب ان کو ہوش آتا تو پھر ان کو دعوت دیتے۔ ایک نسل ختم ہو گئی تو آئندہ نسل کو دعوت دی کہ شاید یہ ٹھیک ہو جائے، یہ ختم ہو گئی تو اگلی نسل کو دعوت دی کہ شاید یہ ٹھیک ہو جائے۔ یوں نوح علیہ السلام نے نو سو دس سال تک اپنی قوم کو مسلسل دعوت دی اور اپنی قوم کو سمجھایا۔

﴿اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ۝۳﴾

فرمایا: اللہ کی عبادت کرو، اس سے ڈرو اور میری بات مانو۔

﴿یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۴﴾

اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا اور ایک وقت تک تمہیں مہلت دے گا اور جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آ جائے تو پھر اس میں مزید تاخیر نہیں ہوتی۔

55۔ کتاب الزہد لاحمد بن حنبل: ج 1 ص 82 فصل تنزیہ الانبیاء

اے کاش! تم اس بات کو سمجھو۔

یہاں "یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" نہیں فرمایا بلکہ "یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ" فرمایا ہے۔ یہاں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تمہارے بعض گناہوں کو معاف کر دے گا۔ آدمی کے ذمہ کچھ حقوق اللہ ہیں اور کچھ حقوق العباد ہیں، حقوق اللہ میں کوتاہی کی ہو تو ایمان لانے سے وہ معاف ہو جائیں گے، زمانہ کفر کے سارے گناہ معاف ہوتے ہیں لیکن حقوق العباد جو زمانہ کفر میں سلب کیے ہوں، غصب کیے ہوں تو وہ معاف نہیں ہوتے، جن کو واپس کر سکتے ہوں واپس کرنا ضروری ہے اور جس سے معاف کرا سکتے ہوں تو معاف کروانا ضروری ہے۔ مال لوٹا ہے تو واپس کرو۔ اگر گالی دی ہے تو اس کو واپس کیسے کراؤ گے؟ بس اس سے معاف کروالو۔

تقدیر پر اشکال کا جواب:

﴿اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ﴾

جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجائے تو پھر اس میں مزید تاخیر نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور میری بات مانو گے تو اللہ رب العزت ایک وقت تک تمہیں زندہ رکھیں گے، عذاب نہیں دیں گے اور جب وقت آئے گا تو پھر تمہیں مہلت بھی نہیں ملے گی۔

بظاہر دونوں میں بات سمجھ نہیں آرہی کہ اگر تم اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو تو پھر ﴿یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ﴾ اللہ تمہیں معاف کریں گے، تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور ﴿یُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ اللہ تمہیں ایک متعین وقت تک ڈھیل دیں گے، جب وقت آئے گا تو پھر ﴿لَا یُؤَخَّرُ﴾ تمہیں ڈھیل نہیں ملے گی۔ تو سوال یہ ہے کہ اس میں ایمان اور تقویٰ کو کیا دخل ہوا؟ یہ تو کافر کے ساتھ بھی ایسے ہی ہے کہ

ایک وقت تک اس کو مہلت ہوتی ہے، وقت جب آ جائے تو اس کو بھی مہلت نہیں ملتی۔

میں یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ پہلے تقدیر کا معنی سمجھیں، پھر تقدیر کی قسمیں سمجھیں تو یہ آیت سمجھ میں آئے گی۔ عام بندے سمجھتے ہیں کہ تقدیر صرف امرِ الٰہی کا نام ہے حالانکہ تقدیر صرف امرِ الٰہی کا نام نہیں ہے بلکہ علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ میں بندے کو اختیار دوں گا تو بندہ اپنے اختیار سے فلاں کام کرے گا۔ یہ ''علمِ الٰہی'' ہوا، اور اللہ نے اس کو لکھ دیا کہ بندہ فلاں کام کرے گا تو یہ ''امرِ الٰہی'' ہوا۔ اب علمِ الٰہی؛ امرِ الٰہی کے خلاف ہو یا امرِ الٰہی؛ علمِ الٰہی کے خلاف ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو تقدیر صرف ''علمِ الٰہی'' کا نام نہیں بلکہ تقدیر علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اور بندہ مجبور محض ہو ایسا بھی نہیں کیونکہ ہونا بندے کے اختیار کے ساتھ تھا۔ یہ ہے تقدیر کا معنی!

پھر تقدیر کی ایک قسم ہے تقدیر مُبرَم اور ایک قسم ہے تقدیر معلق۔ مُبرَم کا معنی ہوتا ہے قطعی اور یقینی، ایسی تقدیر کہ جو ٹل نہیں سکتی اور ایک تقدیر معلق ہے جو ایک شرط کے ساتھ ہے، اگر یوں ہو گا تو یوں کر دیں گے۔ اس کو معلق کہتے ہیں۔

تو یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ اللہ کے تو علم میں ہے کہ یہ بندہ کفر اختیار کرے گا یا یہ بندہ ایمان اختیار کرے گا۔ اگر یہ کفر اختیار کرے گا تو اس پر عذاب آئے گا اور اگر کفر اختیار نہیں کرے گا تو اس پر عذاب نہیں آئے گا بلکہ اللہ اس کو ایک وقت تک مزید زندگی ایسے دیں گے کہ جس میں عذاب نہیں ہو گا۔ تو فرمایا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو مزید ایک مدت تک اللہ تمہیں ڈھیل دیں گے، تمہیں موقع دیں گے اور تمہارے اوپر عذاب نہیں آئے گا۔ پھر جب وہ آخری وقت جو تقدیر مُبرَم ہے موت کا وہ آئے گا تو پھر تو مہلت نہیں ملے گی، پھر تو موت ہر کسی پر آنی ہے،

مؤمن پر بھی اور کافر پر بھی لیکن یہ کفر کی وجہ سے جو عذاب آنا تھا جب تم ایمان اختیار کرو گے تو عذاب نہیں آئے گا بلکہ مزید ایک مدت تک اللہ تمہیں زندہ رکھیں گے اور عذاب سے محفوظ رکھیں گے۔

جس طرح حدیث پاک میں ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ." [56]

کہ تقدیر کو دعا ٹال دیتی ہے کہ انسان کے مقدر میں لکھا ہے کہ اگر یہ دعا کرے گا تو یہ تکلیف نہیں ہو گی، یہ دعا نہیں کرے گا تو پھر اس کو تکلیف ہو گی، اور والدین سے حسنِ سلوک کرنا عمر کو بڑھا دیتا ہے، والدین سے حسنِ سلوک کرے گا تو عمر بڑھ جائے گی اور نہیں کرے گا تو عمر نہیں بڑھے گی لیکن اللہ کے علم میں یہ دونوں چیزیں ہیں کہ یہ کرے گا یا نہیں کرے گا۔

استغفار کرنے پر پانچ انعامات:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝١٠ۙ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝١١ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝١٢ۭ﴾

نوح علیہ السلام فرماتے ہیں میں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو وہ معاف کرنے والا ہے، وہ آسمان سے تم پر بارش برسا دیں گے، وہ تمہیں مال دیں گے، تمہیں بیٹے دیں گے، تمہیں باغات دیں گے، تمہیں نہریں دیں گے۔

یہ پانچ انعام دیں گے اگر تم استغفار کرو گے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا میں کتنے

56۔ سنن الترمذی، رقم:2139

لوگ ہیں جو استغفار کرتے ہیں لیکن ان کی اولاد بھی نہیں ہوتی، باغات بھی نہیں ہوتے، نہریں بھی نہیں ہوتی تو یہ نعمتیں پھر بھی نہیں ہوتیں۔ اس کا جواب بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ جو بھی استغفار کرے گا تو اس کو یہ پانچ نعمتیں ملیں بلکہ یہ نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ خاص تھا کہ اگر تم استغفار کرو گے تو اللہ تعالیٰ بارش بھی دیں گے، مال بھی دیں گے، بیٹے بھی دیں گے، باغات بھی دیں گے اور نہریں بھی دیں گے۔

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کو قاعدہ کلیہ بھی مان لیا جائے تو اشکال پھر بھی نہیں ہے۔ یہ بڑا عجیب جواب دیا ہے حضرت نے۔ فرمایا کہ اگر کسی بندے سے کوئی وعدہ کیا جائے اور جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ نہ دیں بلکہ اس سے بڑھ کر دیں تو یہ تو نہیں کہتے کہ آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ مثلاً بھائی! آپ اگر دس بجے میرے پاس آؤ گے تو میں تمہیں چنے کے ساتھ ناشتہ کراؤں گا۔ وہ دس بجے آئے تو آپ نے پائے نہاری اور حلیم کھلا دی۔ تو وعدہ تو چنے کا کیا تھا اور کھلایا ہے پائے نہاری اور حلیم تو یہ ایفائے عہد ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ قاعدہ مان بھی لیا جائے کہ استغفار سے یہ تمام چیزیں ملیں گی، اگر کسی کو یہ نہ ملے اور اس سے بڑھ کر ملے تو ایفائے عہد تو پھر بھی ہے کہ اللہ اپنے بندے کو ایمان اور تقویٰ سے قلبی سکون عطا فرماتے ہیں جو اِن پانچوں چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ اگر کسی کے ہاں بارش برسے اور نقصان ہو جائے، اولاد ہو اور تکلیف کا ذریعہ بنے، مال ہو اور اس کی ڈکیتی ہو جائے، آدمی کے باغات اور کھیت ہوں لیکن ان کو نقصان ہو جائے۔ اگر اللہ ان پانچ چیزوں کے بجائے آدمی کو سکون قلبی عطا فرما دے تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر قاعدہ کلیہ بھی مانا جائے

اشکال تب بھی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ یا تو یہی پانچ چیزیں دیتے ہیں یا اس سے بھی بڑھ کر دیتے ہیں۔ آپ یقین فرمائیں بیان القرآن کی تعبیرات ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی حضرت کے علوم پر عش عش کر اٹھتا ہے۔

قومِ نوح کے دور میں پانچ بت:

﴿قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّهُمۡ عَصَوۡنِیۡ وَ اتَّبَعُوۡا مَنۡ لَّمۡ یَزِدۡهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَ مَکَرُوۡا مَکۡرًا کُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَکُمۡ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۬ۙ وَّ لَا یَغُوۡثَ وَ یَعُوۡقَ وَ نَسۡرًا ﴿۲۳﴾﴾

نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے کہ دیکھو! تم نے ان کی بات کو ماننا نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کی: اے میرے رب! ان لوگوں نے میری نافرمانی کی ہے اور بات اس کی مانتے ہیں جس کے مال اور اولاد نے ان کو نقصان میں ڈالا ہے۔ مراد اس سے قوم کے بڑے بڑے سردار ہیں۔ اور بہت بڑے بڑے مکر انہوں نے کیے۔ یہ "کُبَّارًا" اکبر کا مبالغہ ہے۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے یہ کہتے کہ اس نوح کی وجہ سے اپنے خداؤں کو چھوڑنا نہیں ہے خصوصا ﴿وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۬ۙ وَّ لَا یَغُوۡثَ وَ یَعُوۡقَ وَ نَسۡرًا﴾ ان پانچ وَد، سُواع، یَغوث، یَعوق اور نَسر کو کسی صورت میں بھی نہ چھوڑنا!

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اور حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے یہ پانچ بزرگ تھے۔ لوگ ان کو بڑی عقیدت سے دیکھتے۔ یہ دنیا سے چلے گئے تو لوگ ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں ڈالا کہ یہ نیک آدمی تھے، ان کی تصویریں بنا کر گھر میں رکھ لو، ان کے دیکھنے سے اللہ یاد آئے گا، آخرت یاد آئے گی۔ کچھ عرصہ ایسے ہی رہا۔ اگلی نسل آئی تو شیطان نے انہیں کہا کہ یہ اللہ کے بہت نیک

بندے ہیں تم ان کو سجدے کرو گے تو اس سے اللہ بہت خوش ہو گا کہ یہ میرے نیک بندوں کو پوجتے ہیں۔ لوگ ان کو پوجنا شروع ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ تم نے اپنے ان خداؤں کو نہیں چھوڑنا! اسے کہتے ہیں تخصیص بعد التعمیم کہ پہلے تمام خداؤں کے بارے میں کہا کہ اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑنا، پھر کہا کہ فلاں فلاں خاص خاص کو تو کبھی بھی نہیں چھوڑنا! یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بد دعا کی وجہ:

﴿وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے دعا مانگتے ہیں: اے اللہ! ان ظالموں کو اور گمراہ کر دے، ان کی گمراہی میں اضافہ کر دے۔

یہاں اعتراض یہ ہے کہ نبی جب بھی دعا مانگتے ہیں تو ہدایت کی مانگتے ہیں اور نوح علیہ السلام تو گمراہی کی دعا مانگ رہے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ نوح علیہ السلام پر وحی آگئی تھی کہ ان میں سے مزید آپ پر کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، جو ایمان لا چکے ہیں بس یہی ہیں، آئندہ آپ کی قوم میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ تو جب ایمان نہیں لائیں گے تو ان کو عذاب ہونا چاہیے۔

اسی لیے نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! جب انہوں نے ایمان لانا نہیں ہے تو جتنی گمراہی ان کے مقدر میں ہے وہ ساری گمراہی ان کو دے دے تا کہ عذاب آئے اور ان سے زمین پاک ہو جائے۔ تو بظاہر گمراہی کی دعا کی ہے لیکن حقیقت میں استحقاقِ عذاب کی دعا کی ہے کہ یا اللہ! آپ نے ان کو جتنا گمراہ کرنا ہے آپ کر دیں تا کہ یہ مستحقِ عذاب ہو جائیں۔

﴿مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ

اللّٰہِ اَنۡصَارًا ﴿۲۵﴾

یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے پہلے تو پانی میں غرق ہوئے اور موت کے بعد برزخ کی آگ میں چلے گئے۔ ان کو دو قسم کا متضاد عذاب ہوا۔ اب پانی اور آگ میں تضاد ہے۔ پانی اور آگ کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے، ادھر پانی کا عذاب اور پانی کے عذاب سے نکلیں تو پھر آگ کا عذاب ہو گا۔

﴿وَ قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡہُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ وَ لَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ﴿۲۷﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی: اے میرے رب! ان کافروں میں سے ایک بندہ بھی زمین پر باقی نہ رکھنا! اگر آپ نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ آپ کے بندوں کو اور گمراہ کریں گے اور ان سے جو نسل پیدا ہو گی وہ بھی کافروں کی پیدا ہو گی، اس لیے ان کو تباہ کر دیں اور ساتھ ہی پھر یہ دعا بھی کر دی:

﴿رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا وَّ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾﴾

اے میرے رب! مجھے بخش دے، میرے والدین کو بخش دے اور ہر اس بندے کو بخش دے جو میرے گھر میں ایمان کی حالت میں داخل ہوا، اسی طرح تمام ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بخش دے اور ظالموں کو تباہ و برباد فرما۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورة الجن

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿قُلۡ اُوۡحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۝١﴾

شانِ نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں بہت دعوت دی اور مکہ والوں نے آپ کو بہت تنگ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت میں مدد اور تعاون کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ طائف میں آپ نے قبیلہ بنو ثقیف کے عمیر ثقفی کے تین بیٹوں عبدیالیل، صعود اور حبیب سے ملاقات کی۔ ان کے بارے میں معروف تھا کہ یہ اچھے لوگ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی، قوم کے مظالم کا ذکر کر کے فرمایا کہ میں تم سے مدد طلب کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے آپ کا مذاق اڑایا۔ شریر لڑکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا ئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مارے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک سے خون نکلا۔ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے اچھے لوگ شمار ہوتے تھے اور انہوں نے آپ کو یہ صلہ دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے واپس تشریف لائے۔ طائف سے نکلنے کے بعد عتبہ اور شیبہ کے انگوروں کے باغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ لی۔ عتبہ اور شیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت دیکھی تو ان کو ترس آیا۔ انہوں نے اپنے

غلام عدّاس اس کا نام تھا، اس کو بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر کچھ انگور دو کھانے کے لیے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگور کھانے شروع کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی۔ وہ عدّاس غلام عیسائی تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا پڑھا؟ فرمایا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس نے کہا کہ یہ لفظ تو کھانے سے پہلے کوئی نہیں پڑھتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم کون ہو؟ کہا: میں عدّاس ہوں۔ پوچھا: علاقہ کون سا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں نینوا کا رہنے والا ہوں۔ فرمایا: اس علاقے میں یونس بن متی ہوتے تھے؟ کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ نبی تھے اور میرے بھائی تھے، میں بھی نبی ہوں۔ اس نے کہا: آپ نبی ہیں؟ فرمایا: ہاں میں نبی ہوں۔

اس وقت عدّاس نے آپ کے ہاتھوں کو چوما اور آپ کے سر کو چوما۔ اس عمل کو عتبہ اور شیبہ دونوں نے دیکھا۔ عدّاس واپس آیا تو انہوں نے کہا: یہ تو نے کیا کیا؟ لگتا ہے تو بھی اپنا دین چھوڑ گیا ہے، اس وقت سب سے افضل دین تو تمہارا ہے یعنی نصاریٰ کا۔ اس نے کہا: نہیں، سب سے افضل دین ہمارا نہیں ہے سب سے افضل دین ان کا ہے، جس نبی کے بارے میں ہم نے سنا تھا یہ وہ نبی ہے۔ یہ واقعہ راستے میں پیش آیا۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقام نخلہ پر رکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو تہجد کی نماز پڑھی۔ مُلکِ یمن کے جنات کا ایک گروہ بھی یہیں پہنچا ہوا تھا۔ چونکہ پہلے ملائکہ کو جب اللہ پاک حکم دیتے تو ملائکہ اپنے پروں کو ہلاتے اور بہت خوش ہوتے اور جو حکم آسمان سے زمین کی طرف آتا تھا ان احکام کو دیکھ کر خوش ہوتے اور آپس میں مذاکرہ کرتے۔ ملائکہ آسمان سے نیچے آتے تھے تو جنات وہاں جا کر ان باتوں کو سن لیتے اور واپس آ کر نجومیوں کو بتاتے کہ بارش ہونے والی ہے، فلاں کام

ہونے والا ہے، نجومی ان میں کچھ جھوٹ ملا کر یہ باتیں قوم کو بتا دیتے تھے، اس سے ان کا کام چلتا رہتا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو پھر اللہ رب العزت نے مستقل انگارے شہاب ثاقب کی صورت میں ان کے پیچھے لگا دیے جو جنات کو مارتے تھے اور جنات اوپر نہیں جا سکتے تھے۔ اب جنات بہت پریشان تھے کہ ایسا کیا واقعہ پیش ہوا ہے کہ ہمیں اوپر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ اس تلاش میں نکلے ہوئے مقام نخلہ پر پہنچے تو دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں تلاوت فرما رہے تھے۔

ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سنی اور چلے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ان کے آنے کا پتا چلا، نہ تلاوت سننے کا پتا چلا، نہ ان کے ایمان کا پتا چلا۔ وحی آئی تو بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا۔

جنات؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھ مرتبہ حاضر ہوئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پانچ مواقع پر جنات سے گفتگو کرنا ثابت ہے اور یہ موقع ایسا ہے کہ جس میں جنات کی آمد کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا نہیں چلا تھا، اس ملاقات میں جنات سے براہِ راست گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

جنات کا قرآن سننا:

﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱﴾

آپ فرما دیجیے کہ میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے قرآن کو بغور سنا اور کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔

”نَفَر“ کہتے ہیں تین سے لے کر دس تک کو اور یہ آنے والے جنات نو تھے

اور ملک یمن کے علاقے نصیبین کے رہنے والے تھے۔

﴿وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ۝۳ وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴﴾

یہ چونکہ ایمان لے آئے تھے اس لیے انہوں نے کہا: ہمارے رب کی شان بلند ہے، اللہ کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی اولاد۔ جو ہم میں بے وقوف لوگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غلط باتیں کرتے ہیں۔

﴿وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵﴾

اور ہمارا پہلے خیال یہ تھا کہ انسان اور جن اللہ پر کبھی جھوٹ نہیں بولتے لیکن آج پتا چلا کہ ہمیں شرک کی باتیں بتانے والے جنات جھوٹ بولتے تھے۔

مشرکین کا جنات کو شریک ٹھہرانا:

﴿وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶﴾

مشرکینِ مکہ کا ایک معمول تھا کہ جب سفر پر نکلتے اور کسی وادی میں رات کو ان کا پڑاؤ ہوتا تو وہاں یہ لوگ ایک جملہ کہا کرتے تھے:

إِنِّيْ أَعُوْذُ بِعَظِيْمِ هٰذَا الْوَادِيْ مِنْ شَرِّ سُفَهَاءِ قَوْمِهٖ.[57]

اس وادی کے سردار جن کی قوم کے بے وقوف شریر جنات کے شر سے بچنے کے لیے میں اس سردار کی پناہ میں آتا ہوں۔

یہ ان کا معمول تھا کہ ایسے کہا کرتے تھے۔ یہاں یہ ذکر فرمایا کہ لوگوں میں

57۔ نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور: ج8 ص186

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو جنات کی پناہ میں آتے ہیں ﴿فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ اور یہ بات جنات کو مزید گمراہ کرتی ہے، اکڑ میں مبتلا کرتی ہے کہ دیکھو! انسان بھی ہم سے مدد مانگتے ہیں۔

رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں ریگستان کے علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا تو وہیں اونٹنی سے اترا اور سو گیا اور یہی جملہ "أَعُوْذُ بِعَظِيْمِ هٰذَا الْوَادِيْ مِنَ الْجِنِّ" میں نے بھی کہہ کر وہاں کے جنات سے پناہ مانگی۔ جب میں سویا تو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص آیا اور میری اونٹنی کا گلا کاٹنے لگا۔ میں اٹھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں پھر سو گیا اور دیکھا کہ اونٹنی کا کوئی گلا کاٹ رہا ہے۔ میں اٹھا تو کوئی بھی نہیں تھا البتہ اونٹنی گھبراہٹ کا شکار تھی، حرکت کر رہی تھی۔ میں پھر سو گیا۔ تیسری بار خواب میں میں نے پھر یہی واقعہ دیکھا۔

پھر میں جب میں نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ میری اونٹنی تڑپ رہی ہے اور وہی شخص جس کو میں نے خواب میں اپنی اونٹنی پر حملہ کرتے دیکھا تھا کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے۔ ساتھ ہی ایک بوڑھے کو بھی دیکھا جو اس نوجوان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور اونٹنی پر حملہ کرنے سے اسے روک رہا ہے۔ اسی دوران تین وحشی گائے وہاں سے گزریں تو اس بوڑھے نے اس نوجوان سے کہا کہ اس اونٹنی کو چھوڑ دو اور ان تین میں سے کوئی ایک لے لو۔

اس نوجوان نے ایک وحشی گائے لے لی اور چلا گیا۔ وہ بوڑھا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے اس نے کہا کہ وہ دور گزر گیا جب جنات سے پناہ لی جاتی تھی، اب تم یہ نہ کہا کرو بلکہ اب تم یہ کہو "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ رَبِّ مُحَمَّدٍ مِنْ هَوْلِ هٰذَا الْوَادِيْ"

میں اس اللہ کی پناہ میں آتا ہوں جو محمد کا رب ہے اس وادی کے خوف اور شر ور سے۔ تو میں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ تو اس بوڑھے نے کہا کہ وہ نبی ہیں جو یثرب میں ہیں۔ میں اسی وقت نکلا اور سیدھا مدینہ منورہ آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتے ہی جو واقعہ میرے ساتھ پیش آیا تھا مجھے سارا بتا دیا۔ تو میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔[58]

"مساجد اللہ کی ہیں" کا معنی:

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾﴾

یا تو "الْمَسٰجِدَ" حقیقی معنی میں ہے کہ سجدہ کی جگہیں کہ مساجد ساری اللہ کے لیے ہیں، انسان کو چاہیے کہ مساجد میں جا کر اللہ کے علاوہ کسی اور کو مدد کے لیے نہ پکارے۔

یا یہ "الْمَسٰجِدَ" مَسْجَد کی جمع ہے اور مصدر میمی ہے جس کا معنی ہے سجدہ کرنا۔ اب آیت کا معنی یہ ہو گا کہ ہر قسم کے سجدے تعظیمی ہوں یا عبادت کے ہوں سارے اللہ کے لیے ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی کو سجدے میں شریک نہیں کرنا چاہیے۔

علمِ غیب کی تعریف:

﴿قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿٢٥﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾﴾

"عالم الغیب" کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر استعمال کرنا ہر گز جائز نہیں، کیونکہ غیب اسے کہتے ہیں جس پر کوئی دلیل نہ ہو اور اس تک پہنچنے کا کوئی

58۔ التفسیر المظہری: ج10 ص89

راستہ نہ ہو۔ مطلق غیب اسے کہتے ہیں:

"إِنَّ الْغَيْبَ الْمُطْلَقَ فِي الْإِطْلَاقَاتِ الشَّرْعِيَّةِ مَا لَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيلٌ وَّلَا إِلَى دَرْكِهٖ وَسِيْلَةٌ وَّسَبِيْلٌ "کہ جس تک پہنچنے کی کوئی دلیل اور راستہ نہ ہو۔[59]

اور جب اس تک آپ پہنچ گئے تو پھر غیب غیب نہیں رہتا، وہ مشاہد بن جاتا ہے، ظہور ہو جاتا ہے اس کا۔ اللہ رب العزت عالم الغیب ہیں، اللہ کے پاس وہ علوم ہیں جن تک رسائی کسی بندے کے بس میں نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے:

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾﴾

اللہ اپنے غیب پر مطلع کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو منتخب فرماتے ہیں۔ یہ جو "اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى" کا استثناء ہے یہ استثناء منقطع ہے۔ "عٰلِمُ الْغَيْبِ" سے مراد کہ اللہ تعالی کا جو علم ہے وہ ہر قسم کا ہے اور "اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ" کہ جس غیب پر اللہ کسی کو مطلع فرماتے ہیں یہ وہ غیب ہے جس کا تعلق رسالت کے علوم سے ہے، یہ عام غیب نہیں ہے۔ تو یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔

حفظ الایمان کی عبارت کی وضاحت:

اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے لیے عالم الغیب کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب "حفظ الایمان" میں جو عبارت ہے اس پر اہلِ بدعت اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے

59۔ المہند علی المفند: ص88

ہیں: جتنا غیب اللہ کے نبی کے پاس ہے العیاذ باللہ اتنا غیب تو عام آدمی کے پاس بھی ہے، مجنون کے پاس بھی ہے اور حتی کہ جانوروں کے پاس بھی ہے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔

حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر "عالم الغیب" کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ جب تم اللہ کے علاوہ اللہ کے رسول کو "عالم الغیب" کہتے ہو تو تمہاری مراد کیا ہے؟ اگر تم کہتے ہو کہ اس علمِ غیب سے تمام علوم یعنی "جمیع ما کان وما یکون" مراد ہے تو اس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، اور اگر آپ کہتے ہو کہ اس سے مراد تمام نہیں بلکہ بعض ہیں تو بعض ہونا یہ پیغمبر کا کمال نہیں ہے۔ کمال وہ ہوتا ہے جو صاحبِ کمال میں ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔

تو بعض ہونا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال نہیں ہے کیوں کہ بعض وہ باتیں جو ایک بندے کو معلوم ہوں اور دوسرے کو نہ ہوں تو یہ مجنون کے پاس بھی ہوتا ہے۔ ایک مجنون ہے وہ اپنی جیب میں کوئی مٹی کا ڈھیلا ڈال لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری جیب میں کیا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کی جیب میں کیا ہے لیکن اس کو پتا ہے کہ جیب میں مٹی کا ڈھیلا ہے، اور ایسی باتیں تو بعض صبی اور بچوں کو بھی معلوم ہوتی ہیں جو بڑے کو معلوم نہیں ہوتیں اور اسی طرح بعض چیزیں جانوروں کو معلوم ہوتی ہیں جو انسانوں کو معلوم نہیں ہوتیں۔ مثلاً کسی جگہ گھی پڑا ہوا ہے تو چیونٹی سونگھ لیتی ہے لیکن ہمیں نہیں پتا چلتا، اسی طرح پانی نیچے ہوتا ہے اور ہدہد پرندہ معلوم کرلیتا ہے لیکن ہمیں نہیں پتا چلتا۔

تو نبی کے لیے "عالم الغیب" لفظ کا کیسے استعمال کریں گے؟ جب آپ نبی کے لیے "عالم الغیب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اگر آپ کی مراد تمام علوم ہیں تو اس پر

دلیل نہیں ہے اور اگر بعض علوم ہیں تو بعض ایسی باتیں ایک کو معلوم ہوں اور دوسرے کو معلوم نہ ہوں تو یہ عام انسان بھی جانتا ہے، جانور بھی جانتا ہے، صبی بھی جانتا ہے، مجنون بھی جانتا ہے تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختصاص کیسے ہوا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ نے کون سا کمال ثابت کیا؟

دوسری بات سمجھیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہم جو عالم الغیب کہتے ہیں تو یہ ہماری خاص اصطلاح ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ حضور عالم الغیب ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض باتیں ایسی معلوم ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہیں۔ فرمایا کہ اگر تمہاری یہ اصطلاح مان لی جائے کہ عالم الغیب کا لفظ جس طرح اللہ پر بولا جاتا ہے تو نبی پر بھی بولا جائے تو پھر اس تاویل سے تو خالق، مالک، رازق اور معبود کا لفظ بھی اللہ کے علاوہ مخلوق پر استعمال کرنا ہو گا۔ کوئی بندہ کہتا ہے میں اپنے مالک کو رازق کہتا ہوں اور میرے ہاں رازق کا معنی یہ ہے کہ جو تنخواہ دے، یہ میری اصطلاح ہے۔ کوئی بندہ اپنے والد کو خالق کہے کہ میرے ہاں خالق کا معنی ہے کہ جس کی وجہ سے بچہ پیدا ہو۔ تو اگر اس طرح تاویلات کرتے جائیں تو پھر اللہ کی کون سی صفت بچے گی؟

آگے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس سے بھی باریک بات فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں: اگر یوں تاویل کر لی جائے تو اس طرح تو تاویل کر کے اللہ پر عالم الغیب کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہو گا کیوں کہ ایک بندہ کہتا ہے کہ میرے ہاں عالم الغیب کا معنی یہ ہے کہ ایسا بندہ جو سب نہ جانتا ہو بلکہ کچھ جانتا ہو اور چونکہ اللہ سب کچھ جانتے ہیں لہذا اللہ کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتے۔ بات سمجھ آ رہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اگر آپ عالم الغیب کا لفظ اللہ کے علاوہ نبی پر تاویل کر کے بولتے ہیں تو کوئی بندہ یہی تاویل کرے گا تو اللہ پر یہ لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہو گا۔ کوئی کہے گا کہ اللہ

عالم الغیب نہیں ہے کیوں کہ میرے ہاں عالم الغیب کا معنی یہ ہے کہ جس کو کچھ معلوم ہو اور کچھ معلوم نہ ہو، لہذا یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ تو ایسی تاویلات نہ کرو جس سے شریعت کا چہرہ مسخ ہو جائے۔

یہ ہے حفظ الایمان کی پوری عبارت کا خلاصہ۔ اب آپ بتائیں اس میں توہین کا پہلو کون سا بنتا ہے ؟(کوئی نہیں۔ سامعین)

اللہ تعالیٰ ہمیں بات سمجھنے کی اور آگے سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ المزمل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ‏ ﴿۱﴾ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ‏ ﴿۲﴾ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انْقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۙ‏ ﴿۳﴾﴾

شانِ نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت گھبراہٹ کا شکار ہوئے اور یہ طبعی خوف تھا۔ ایسے جبرائیل امین کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ سارا واقعہ سنایا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تسلی دی۔ تقریباً چھ ماہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا اور ان چھ ماہ کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبارک خواب آتے رہے۔ اسی وجہ سے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کہتے ہیں کہ اعلانِ نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بنتی ہے 23 سال اور اگر 23 سال کی ششماہیاں دیکھیں تو وہ بنتی ہیں چھیالیس۔ تو ان میں سے جو پہلے چھ ماہ تھے ان میں وحی نہیں آئی بلکہ خواب آتے رہے۔ تو کہتے ہیں کہ رؤیائے صادقہ یہ وحی کا چھیالیسواں حصہ ہیں کہ چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب آتے رہے اور نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ تو جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ وحی نہیں آئی بلکہ خواب کے ذریعہ وحی آتی رہی۔

تو چھ ماہ کے بعد ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہی شخص

آسمان کے کنارے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء میں دیکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک گھبراہٹ کی کیفیت سی طاری ہو گئی اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زَمِّلُوْنِیْ ! زَمِّلُوْنِیْ !" میرے اوپر چادر ڈال دو۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ پر چادر ڈال دی۔

مزمل اور مدثر کا معنیٰ:

اللہ رب العزت نے ﴿يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ اور ﴿يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ انہی لفظوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے۔ ان میں کوئی بہت گہرا فرق نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدثر؛ دثار سے ہے جسے لحاف کہتے ہیں اور مزمل؛ زمیل سے ہے جسے چادر کہتے ہیں، بس چادر اوڑھ لی یا تھوڑا سا بڑا کپڑا اوڑھ لیا تو ﴿يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ فرمایا اور ﴿يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ فرمایا۔

فترت وحی کے بعد نازل ہونے والی پہلی سورت:

فترت وحی کے بعد پہلی کون سی سورت نازل ہوئی؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورت مزمل نازل ہوئی لیکن اس کا ابتدائی حصہ نازل ہوا اور اس کا آخری حصہ ایک سال بعد نازل ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ سورت مدثر نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ دونوں اکٹھی نازل ہوئیں، الگ الگ نہیں۔

قیام اللیل کا حکم:

﴿يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴﴾

اس میں اللہ پاک نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی محبت کے ساتھ

"يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ" کہہ کر خطاب فرمایا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب پر رات کے چوتھائی حصہ سے کچھ زیادہ رات کا قیام کرنا فرض تھا۔

فرمایا: اے چادر اوڑھنے والے! آپ رات کا کچھ حصہ چھوڑ کر باقی رات قیام کیا کریں۔ یہ قیام آدھی رات کر لیں، یا اس سے تھوڑا کم کر لیں، یا پھر اس سے تھوڑا زیادہ کر لیں۔

اب بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ میں "قَلِيْلًا" کی جو تشریح "نِصْفَهٗ" سے کی جارہی ہے بظاہر یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ نصف تو قلیل نہیں کہلاتا!

اس کا جواب یہ ہے کہ رات تو شروع ہوتی ہے مغرب سے، جب مغرب سے لے کر آپ صبح صادق تک چلیں گے پھر آپ دیکھیں کہ نصف کیا بنتا ہے! مثلاً آج کل ہمارے ہاں مغرب ہو رہی ہے پونے چھ بجے اور صبح صادق ہو رہی ہے پونے چھ بجے تو یہ بارہ گھنٹے بن گئے۔ تو یہ ہے پوری رات۔ اس کا نصف چھ گھنٹے ہے اور جب آپ عشاء کی نماز پڑھیں گے، سنتیں پڑھیں گے اور پھر سوئیں گے تو اس کے بعد آپ دیکھیں کہ اب نصف کیا بنے گا؟ آپ نے عشاء کی نماز پڑھی ساڑھے سات بجے، اب آپ کو سوتے سوتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ اب آپ ساڑھے آٹھ سے شروع کریں اور پونے چھے تک چلیں تو اب کتنے گھنٹے بنیں گے؟ اب اس کا نصف ساڑھے چار بنے گا۔

اب دیکھیں، مغرب سے لے کر صبح صادق تک اس کا نصف کیا بنتا ہے؟ اور ساڑھے آٹھ بجے کے بعد اس کا نصف کیا بنتا ہے؟ اب اگر رات کو دیکھیں تو وہ شروع ہوتی ہے پونے چھ سے لے کر صبح صادق تک لیکن جو تہجد کا معاملہ ہے اس کی رات شروع ہوتی ہے سونے کے بعد۔ کہ جب آپ کا سونے کا وقت شروع ہوتا ہے تو آپ کی

رات شروع ہو گئی۔ تو جب آپ اس کا نصف دیکھیں گے تو یہ کچھ کم پوری رات بن جائے گی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے جو رات کو تہجد پڑھنی ہیں تو یہ جو تہجد والی رات ہے یہ سورج کے غروب ہونے سے شروع ہو گی یا عشاء کے بعد شروع ہو گی؟ عشاء کے بعد شروع ہو گی! اور جو پوری رات ہے وہ غروب ہونے سے لے کر صبح صادق تک ہے۔ اس رات کا جو نصف ہے وہ 12 بجے ہے اور جو تہجد آپ نے پوری رات پڑھنی ہیں وہ عشاء کے فرض کے بعد ہیں، کوئی عشاء کے فرض 9 بجے پڑھتا ہے اور ہم جو عشاء پڑھتے ہیں تو وہ ساڑھے سات بجے پڑھتے ہیں ورنہ اگر مستحب وقت کے مطابق عشاء تاخیر سے پڑھیں گے تو کم از کم ساڑھے آٹھ، نو بجے ہو گی۔ اس کے بعد جو نصف ہو گا وہ کچھ کم پوری رات بن جائے گی۔ اب سمجھ میں آئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

تہجد کی منسوخیت کی وجوہات:

پہلے تہجد ایک سال تک فرض رہی۔ اس کے بعد معراج کی رات آپ تشریف لے گئے عرش پہ، اللہ نے پانچ نمازیں دے دیں، وہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں اور تہجد کی فرضیت منسوخ ہو گئی۔ منسوخی کی تین وجوہات اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں بیان فرمائی ہیں:

[1]: پہلی وجہ

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ﴾

اللہ کے علم میں ہے کہ تم دو تہائی کے قریب یا نصف کے قریب یا ایک تہائی کے قریب رات کو کھڑے ہوتے لیکن اس کو شمار کرنا تمہارے لیے ذرا مشکل ہے۔

جب آدمی تہجد پڑھنا شروع کر دے تو اس کو اندازے کے ساتھ شمار کرنا مشکل ہے کہ اب نصف رات ہو گئی ہے اب دو تہائی رات گذر گئی ہے۔ گھڑیاں تو اس وقت نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے اللہ نے حکم کو منسوخ کر کے آسانی پیدا فرما دی کہ اب تم چاہو تو پڑھ لو، نہ چاہو تو نہ پڑھو، لیکن پڑھ لو تو بہتر ہے۔ "تُحْصُوْهُ" کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا تمہارے لیے کافی مشکل تھا، یہ عملِ احصاء مشکل تھا، گنتی مشکل نہیں تھی، اس لیے اللہ نے آسانی پیدا فرما دی ہے۔

[2]: دوسری وجہ

﴿عَلِمَ اَنْ سَیَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ﴾

تم میں سے بعض مریض ہیں تو فرض ادا کرنا مشکل ہو گا، بعض دن بھر روزی کمانے میں مصروف رہتے ہیں تو رات کو فرض ادا کرنا مشکل ہو گا، بعض اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں تو فرض ادا کرنا مشکل ہو گا اس لیے اللہ پاک نے اس کی فرضیت کو منسوخ فرما دیا۔

[3]: تیسری وجہ

پیچھے گزر چکا ہے کہ ﴿اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ۝۷﴾ کہ آپ کی دن میں مشغولیت بھی بہت زیادہ تھی، ذاتی کام بھی اور دینی کام بھی، پھر رات کو کھڑا ہونا مشکل تھا۔ ان تین عذروں کے پیشِ نظر اللہ نے فرضیتِ تہجد کو ختم کر دیا اور یہ فرمایا کہ اب فرض نہیں ہے، اب نفل ہے، پڑھ لو تو بہتر ہے اور نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔

لیکن تہجد کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہتمام فرماتے تھے، کسی وجہ سے رات کو رہ جاتے تو سورج نکلنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ لیتے تھے۔ ہمارے اوپر قضا تو نہیں لیکن پڑھنا ضرور چاہیے اور عالم کو تو اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔

قیامِ لیل کی حکمت:

یہاں جو رات میں اٹھنے کا فرمایا ہے اس کی وجہ ﴿اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا﴾ ہے کہ یہ وحی کی ابتدا ہے اور آئندہ پورا قرآن نازل ہونا ہے جو بہت وزنی اور بوجھ والا ہے تو اٹھانا مشکل ہو گا۔ اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ تم ابھی سے ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھو۔ رات کو اٹھنے کی عادت ڈالو۔ جب مشقت برداشت کرنا شروع کریں گے تو آپ کے لیے مشقت والا کام کرنا آسان ہو جائے گا۔

رات کو قیام کی وجہ:

اور یہ حکم رات کا کیوں دیا ہے؟ اس کی تین وجہیں بیان فرمائی ہیں:

[1]: "اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ہِیَ اَشَدُّ وَطۡاً" رات کو جب آدمی اٹھتا ہے تو اس سے نفس کی اصلاح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی رات کو سوئے اور پھر اٹھے تو گرمی میں رات چھوٹی ہے اور سردی میں سردی بہت زیادہ ہے۔ تو رات کا اٹھنا یہ نفس کے لیے بہت زیادہ اصلاح کا سبب ہے اور یہ نفس کو روندتا ہے۔

[2]: "وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا" اور اس میں آدمی چونکہ اکیلا ہوتا ہے تو اکیلا آدمی بات دل سے کرتا ہے، اَقۡوَمُ قِیۡلًا کا معنی یہ نہیں کہ بات سچی کرتا ہے بلکہ آدمی بات بڑی دل جمعی سے کرتا ہے، قرآن دل جمعی سے پڑھتا ہے، مناجات دل جمعی سے کرتا ہے، خلوت ہوتی ہے، ساتھ بندہ کوئی نہیں ہوتا۔

[3]: "اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا" رات کو کوئی اور تمہاری مشغولیت نہیں ہے جبکہ دن کو مشغولیات بہت زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے ہم نے کہا کہ رات کو اٹھا کرو! بہتر تو یہی ہے کہ آدمی سوئے اور پھر اٹھے لیکن نہ سوئے اور پھر بھی تہجد پڑھے تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "اَللَّيْلُ كُلُّهَا نَاشِئَةٌ" یہ پوری رات ہی اٹھنا ہے، جب بھی تہجد پڑھے وہ تہجد ہی شمار ہو گی۔ [60]

اس کا ہم سب کو بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ مجھے بھی توفیق عطا فرمائے، اللہ آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ذکرِ اسمِ ذات کا ثبوت:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۞﴾

آج کل ایک بات دنیا میں چل رہی ہے کہ اللہ... اللہ... اللہ... یہ جو ذکرِ اسمِ ذات اکیلا کرتے ہیں تو بعض لوگ اس پر کہتے ہیں کہ اسمِ ذات کا اکیلا ذکر کرنا یہ بدعت ہے، کیونکہ یہ کہیں سے ثابت نہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ اس آیت سے اسم ذات کا اکیلا ذکر کرنا ثابت ہو رہا ہے، کیوں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا "وَاذْكُرْ رَبَّكَ" کہ اپنے رب کو یاد کرو بلکہ یہ فرمایا "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ" کہ اپنے رب کا نام لو، اور رب کا نام کیا ہے؟ اللہ! اس لیے اللہ... اللہ... کہنا یہ قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے۔ اس لیے اسے بدعت نہیں کہہ سکتے۔ [61]

اور حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

60۔ التفسیر المظہری: ج10 ص108

61۔ التفسیر المظہری: ج10 ص111

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ اَللّٰه اَللّٰه.[62]

جب تک اللہ اللہ کہنے والے لوگ ہوں گے تب تک زمین میں قیامت نہیں آئے گی۔

میں اگلی بات اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ سلسلہ چشتیہ کے حضرات اسم ذات دوضربی اَللّٰہُ اَللّٰہْ [پہلے لفظ اللہ کی ھا پر پیش اور دوسرے لفظ اللہ کی ھا پر سکون کے ساتھ] الگ کراتے ہیں اور اسم ذات یک ضربی اللہ الگ کراتے ہیں۔ اسم ذات یک ضربی تو قرآن سے ثابت ہوگیا ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ سے کہ اپنے رب کا نام لو اور اسم ذات دوضربی اس حدیث میں آگیا "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ اَللّٰه اَللّٰه" اور یہاں لفظ اللہ ایک بار نہیں بلکہ دوبار فرمایا ہے، اس لیے اسمِ ذات دوضربی بھی ثابت ہے۔ جب یہ بات صاف صاف ہے تو اس کو بدعت کہنے کی ضرورت کیا ہے ؟!

اللہ ہم سب کی اصلاح فرمائے۔ آمین

سات مقاماتِ سلوک کا تذکرہ:

یہاں سلوک کے سات مقامات کو بیان فرمایا ہے:

[1]: "قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا" رات کو عبادت کرنا۔ اس سے سلوک کس سے طے ہوتا ہے؟ ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

مَنْ لَّا يَقُوْمُ اللَّيْلَ لَيْسَ مِنَ الصَّالِحِيْنَ الْكَامِلِيْنَ.[63]

وہ شخص صالح کامل ہو ہی نہیں سکتا جو رات کو قیام نہیں کرتا۔

[2]: "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا" قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھو! ترتیل کا معنی ہوتا ہے مخارج بھی صحیح ہوں اور حسن صوت بھی ہو، جس حد تک اللہ نے آواز دی

62۔ جامع الترمذی، رقم: 2207

63۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح: ج3 ص275 باب التحریض علی قیام اللیل

ہو اس حد تک اپنی آواز کو خوبصورت بنا کے قرآن کریم کو پڑھے۔

[3]: ”وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ“ اللہ اللہ بھی کرے۔

[4]: ”وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا“ لوگوں سے الگ تھلگ بھی رہے یعنی کچھ وقت خلوت میں بھی گزارے۔ مستقل نہیں لیکن کچھ وقت خلوت میں بھی گزارے۔

[5]: ”فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا“ کہ اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرے۔

[6]: ”وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ“ لوگوں کی باتوں پر صبر کرے۔

[7]: ”وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا“ اور اگر لوگ تنگ کریں، تکلیف دیں اور آپ کے خلاف باتیں شروع کریں اور ان سے الگ ہونا پڑے تو خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جائیں۔ ”هَجْرًا جَمِيْلًا“ معنی یہ ہے کہ جب آپ کسی سے علیحدگی اختیار کریں تو اس کا برے لفظوں میں تذکرہ نہ کیا کریں۔ بس اس کا خیال فرمایا کریں۔ آپ کسی ادارے کے ساتھ چل رہے تھے اور اب نہیں چل سکتے اور الگ ہو گئے تو اب ان کا برا تذکرہ نہ کریں، غیبت نہ کریں، ان کے عیوب نہ بیان کریں، بس چھوڑ دیا تو چھوڑ دیا۔ آپ کسی جماعت میں تھے اور الگ ہو گئے تو بس اب ان کے خلاف کچھ نہ کہیں۔ گھر والی تھی اس کو طلاق دے دی تو اب اس کے غلط تذکرے نہ کریں، اس کے عیوب بیان نہ کریں۔ ان چیزوں میں انسان کو بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے، اس کا بہت زیادہ خیال کرنا چاہیے۔

امام، مقتدی اور منفرد کے لیے الگ الگ آیات:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾

ایک نمازی منفرد ہے، ایک نمازی مقتدی ہے اور ایک نمازی امام ہے۔ تینوں کے لیے الگ الگ آیات اللہ نے قرآن کریم میں نازل فرمائی ہیں۔ یہ جو آیت

ہے "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" یہ منفرد کے لیے ہے، مقتدی اور امام کے لیے نہیں کیونکہ تہجد کی جماعت نہیں ہوتی بلکہ تہجد انفرادی ہوتی ہے، اس لیے منفرد کو حکم ہے "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" کہ جہاں سے قرآن آسان لگے تم وہاں سے قرآن کریم کو پڑھو۔

اور امام کے لیے سورۃ بنی اسرائیل میں آیت ہے ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا﴾[64] کہ نہ تو امام اتنا اونچا قرآن پڑھے کہ مقتدی تھوڑے ہیں اور اس کی آواز زیادہ ہو اور نہ اتنی آہستہ پڑھے کہ مقتدی زیادہ ہوں اور آواز کم پڑ جائے، بلکہ درمیانہ راستہ اختیار کرے۔ اور مقتدی کے متعلق سورۃ الاعراف میں ہے: ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو پھر سنو اور توجہ دو اور خاموشی اختیار کرو۔

توبہ کا معنی و مفہوم:

﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾

اس آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ تم نے گناہ کیا اور تم نے توبہ کی تو اللہ تعالی نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ توبہ کا معنی ہوتا ہے "رجوع کرنا" یہاں ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پہلے والے حکم سے رجوع کر لیا۔ پہلے حکم یہ تھا کہ تہجد فرض ہے اور اب حکم یہ دیا کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ تو رجوع ہو گیا۔ جب بندہ گناہ کو چھوڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس نے توبہ کی یعنی وہ بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چلا جاتا ہے۔ تو یہاں ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ کا معنی یہ نہیں ہے

64۔ بنی سرائیل 110:17

کہ اللہ نے ان کے گناہ کو معاف کر دیا تھا، گناہ تو تھا ہی نہیں تو معاف کیا کیا! اس لیے معنی یہ ہے کہ پہلے والے حکم کو واپس لے لیا۔

﴿وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾

یہ آیت چونکہ مکی ہے تو یہاں زکوۃ ادا کرو کا معنی کیا ہے؟ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ پوری سورت مکی ہے لیکن یہ آیت مدنی ہے، اور بعض کی رائے یہ ہے کہ نہیں، جس طرح نماز فرض مکہ میں تھی اور بہت ساری تفصیلات مدینہ منورہ میں آئیں اسی طرح نفسِ زکوۃ تو مکہ مکرمہ میں فرض ہو گئی تھی البتہ اس کی تفصیلات مدینہ منورہ میں آئیں۔

﴿وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّ اَعۡظَمَ اَجۡرًا ؕ﴾

تم جو بھی مال آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں ضرور پاؤ گے۔ اللہ کے پاس پہنچ کر یہ مال پہلے سے کہیں بہتر ہو جائے گا اور اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہو جائے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ایک بار پوچھا: ایک مال تمہارے پاس ہے اور ایک مال تمہارے ورثاء کے پاس ہے، تمہیں کون سا مال اچھا لگتا ہے؟ جو تمہارے پاس ہے وہ یا جو تمہارے ورثاء کے پاس ہے؟ عرض کیا گیا کہ حضور! ہمیں تو وہ مال پسند ہے جو ہمارے پاس ہے! فرمایا: سوچ کر جواب دو! عرض کیا حضور! یہی جواب ذہن میں آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا مال وہ ہے جو تم نے اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا اور جو مال رہ گیا وہ تمہارا نہیں بلکہ تمہارے وارثوں کا ہے۔

اللہ ہمیں دین کے احکامات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورۃ المدثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صفتِ انذار:

﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾﴾

لحاف لپیٹنے والے! یا بڑی چادر لینے والے! آپ مستعد ہو جائیں! تیار ہو جائیں! اور لوگوں کو ڈرائیں! اپنے رب کی تکبیر بیان کریں!

قرآن کریم میں جہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات آئی ہیں انذار اور تبشیر دونوں اکٹھی آئی ہیں لیکن یہاں انذار تو ہے، تبشیر کا لفظ نہیں ہے۔ چونکہ یہ ابتدائی سورت ہے اور اس وقت مسلمان دو چار ہی تھے، باقی سارے کافر تھے تو کفار کو تو تبشیر نہیں بلکہ ان کو انذار ہوتا ہے، ڈرایا جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تم ان کو ڈراؤ۔

عقیدہ توحید پر کاربند رہنے کا حکم:

﴿وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ ۪ۙ﴿۴﴾ وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ۪ۙ﴿۵﴾﴾

اپنے کپڑوں کو صاف رکھیں! یہاں چونکہ نماز ابھی فرض نہیں تھی اس لیے نماز کی بات نہیں کی صرف اتنا فرمایا کہ اپنے کپڑے صاف رکھیں! اور گناہ اور بتوں سے دور رہیں۔

اب دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں اور نبی ہونے کے باوجود

عقیدہ توحید کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ بتوں سے دور رہیں اور عقیدہ توحید پر مستحکم رہیں۔ تو جو معصوم نہیں ہے اس کو عقیدہ توحید پر کار بند رہنے کے لیے کس قدر تاکید کی ضرورت ہو گی؟! کس قدر اہمیت ہو گی اس کے لیے؟!

بدلے کا سوچ کر احسان نہ کریں!

﴿وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۝٦﴾

اور یوں خرچ نہ کرو کہ امید رکھو کہ بعد میں مجھے زیادہ ملے گا۔ میں اس کو ہدیہ دیتا ہوں تو کل یہ بھی ہدیہ دے گا۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر اس کو ”نیوتا“ کہتے ہیں کہ جب شادی ہوتی ہے تو لوگ پیسے لکھتے ہیں اور پھر جب دوسرے کی باری آتی ہے تو پھر اپنی کاپی کو دیکھتے ہیں کہ اس نے پانچ سو دیا تھا تو ہم کتنے دیں؟! تو شادی کے موقع پر بعض لوگ دوسروں کو پیسے دیتے ہیں تاکہ جب ہمارے بچے کی شادی ہو تو ہمیں پیسے اس سے زیادہ ملیں۔ ایسی حرکتیں نہ کرو، یہ قرآن کریم کے مزاج کے خلاف ہے۔

اسی طرح یہ سوچ کر کہ کسی کو ہدیہ دیں کہ آج وہ ہمارے پاس آئے ہیں تو ہم ان کو ہدیہ دیں اور جب ہم ان کے علاقے میں جائیں گے تو وہ بھی ہمیں ہدیہ دیں گے۔ یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔

﴿وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ۝٧﴾

اللہ کی ذات کے لیے برداشت کرو۔

ولید بن مغیرہ کی اسلام دشمنی:

﴿ذَرۡنِيۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِيۡدًا ۝١١ وَّ جَعَلۡتُ لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ۝١٢ وَّ

بَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾

کئی روایات سے ثابت ہے کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ یہ مکہ کا سب سے مالدار آدمی تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ دینار تھی۔ اس دور میں مکہ سے طائف تک اس کے باغات تھے۔ جب سورت المؤمن کی آیت ﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾﴾ نازل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کر رہے تھے تو ولید بن مغیرہ نے سنا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا کہ یہ کلام نہ تو کسی انسان کا ہے اور نہ کسی جن کا، اس کی خاص حلاوت ہے اور اس کی خاص رونق ہے، اس کا اعلیٰ؛ ثمر بار ہے اور اسفل؛ میٹھا پانی ہے، یہ بلند و بالا کلام ہے، اس کو کوئی مغلوب نہیں کر سکتا اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

چونکہ یہ بڑا مالدار آدمی تھا تو جب یہ بات مکہ میں پھیلی تو قریب تھا کہ لوگ اسلام کی طرف آئیں۔ ابوجہل نے سوچا کہ میں اس کو میں کیسے سمجھاؤں؟ ابوجہل اس کے پاس گیا اور کہا: ولید بن مغیرہ! اگر تم نے ابو بکر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اچھی بات کہنی ہے کچھ لینے کے لیے تو ہمیں بتاؤ ہم مکہ والے پیسے جمع کر کے تمہیں دے دیتے ہیں۔ یوں اس کو عار دلائی۔ ولید بن مغیرہ نے کہا: کیسی بات کرتے ہو؟ میری دولت کا تمہیں پتا نہیں؟ تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ تم مجھے پیسے جمع کر کے دو گے؟

ابوجہل نے کہا کہ پھر تم ان کی تعریفیں کیوں کرتے ہو؟ اگر پیسا نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے؟ ولید بن مغیرہ نے کہا: تم ان کے بارے میں کہتے ہو کہ وہ مجنون ہیں، سچ بتاؤ کہ تم نے ان کو کوئی مجنونانہ کام کرتے دیکھا ہے؟ ابوجہل نے کہا نہیں۔ اس نے کہا: تم کہتے ہو کہ وہ شاعر ہیں، کیا تم نے ان کو شعر کہتے ہوئے سنا ہے؟ ابوجہل نے کہا

نہیں۔ ولید بن پھر کہا: تم انہیں کذاب کہتے ہو، کیا تم نے کبھی انہیں جھوٹ بولتے سنا ہے؟ کہا نہیں۔ اس نے پھر پوچھا: تم لوگ انہیں کاہن کہتے ہو، کیا تم نے ان کا کلام کبھی کاہنوں والا سنا ہے؟ کبھی ایسی باتیں سنی ہوں جو کاہنوں کی ہوتی ہیں؟ ابو جہل نے کہا کبھی نہیں سنا۔

ابو جہل پریشان ہو گیا۔ پھر ابو جہل نے کہا اچھا! تم بتاؤ کہ ان کو کیا کہیں؟ ولید نے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ ان کو "ساحر" کہو کیونکہ انہوں نے بھائی کو بھائی سے، بیٹے کو باپ سے اور خاوند کو بیوی سے الگ کر دیا ہے، جادو کے بغیر یہ نہیں ہو سکتا۔ بس جادو گر کہہ دو! ولید بن مغیرہ کے کہنے پر سب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ساحر کہنا شروع کر دیا۔ اس پر ابو جہل بہت خوش ہوا کہ میرا وار چل گیا ہے۔

اللہ فرماتے ہیں:

﴿ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾ وَّ جَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿۱۲﴾ وَّ بَنِیۡنَ شُہُوۡدًا ﴿۱۳﴾﴾

جس کو میں نے پیدا کیا ہے اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو!

یہ ولید بن مغیرہ خود بھی اکیلا تھا اور اس کا باپ بھی اکلوتا تھا۔ تو یہ کہتا تھا کہ وحید ابن الوحید ہوں اور بیٹے بہت تھے۔ اللہ نے فرمایا: چھوڑو اس کو، اس کا حساب میں لوں گا، ہم نے اس کو مال دیا ہے، بچے اس کے سامنے ہیں۔

اولاد کا سامنا ہونا نعمت ہے:

﴿وَّ بَنِیۡنَ شُہُوۡدًا﴾ اس کی اولاد اس کے سامنے ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولاد کا سامنے ہونا خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ تعجب ہے ان پر جو پیسہ کمانے کے لیے اولاد کو

دوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں اور کئی کئی سال تک ان کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

﴿ثُمَّ يَطۡمَعُ اَنۡ اَزِيۡدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيۡدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا ﴿۱۷﴾﴾

پھر اس کی خواہش ہے کہ میرا مال اور بڑھے۔ کہتے ہیں کہ جب ابو جہل کا اس ولید بن مغیرہ سے یہ مکالمہ ہوا تو اس کے بعد پھر اس کی دولت کبھی نہیں بڑھی۔ بس اس دولت پہ سٹاپ لگ گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ یہ سرکش ہے۔ اس کی سزا یہ بتائی کہ ہم اس کو صعود پر چڑھائیں گے۔ "صعود" جہنم میں ایک پہاڑ ہے جس پر چڑھتے ہوئے ستر ہزار سال لگ جائیں گے، جب وہاں چڑھے گا تو پھر وہاں سے گرا دیا جائے گا، پھر چڑھے گا، پھر گرا دیا جائے گا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

جہنم کے انیس فرشتے کیوں؟ (حضرت تھانوی کی توجیہہ):

﴿لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾﴾

جہنم پر انیس فرشتے متعین ہیں جو جہنم کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ انیس کیوں ہیں؟ مختلف مفسرین کی مختلف رائے ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو میرے دل کو لگتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں بنیادی عقائد نو ہیں۔ اللہ پر ایمان لانا، یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ عالَم حادِث ہے، فرشتوں پر ایمان لانا، آسمانی کتابوں پر ایمان لانا، تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا، تقدیر پر ایمان لانا، قیامت کے دن پر ایمان لانا، جنت کے برحق ہونے پر ایمان لانا، جہنم کے برحق ہونے پر ایمان لانا۔ عقائد میں یہ نو چیزیں ایسی ہیں جو بنیادی ہیں اور پھر ہمارے جو اعمال ہیں ان میں سے جو کرنے والے ہیں اس میں پانچ بنیادی ہیں اور نہ کرنے والے بھی پانچ بنیادی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ کرنے والے کون سے ہیں؟ کلمہ پڑھنا، نماز

پڑھنا، زکوۃ دینا، روزہ رکھنا، اور حج کرنا.... اور منہیات کہ جن سے بچنا ضروری ہے: چوری سے بچنا، قتل سے خصوصاً قتل اولاد سے بچنا، زنا سے بچنا، بہتان اور عصیان فی المعروف کہ جس میں ظلم، غیبت، اکل مالِ یتامیٰ وغیرہ سب آ جاتا ہے۔ تو حضرت فرماتے ہیں اعتقادی اعتبار سے یہ کل 19 چیزیں بنیادی بنتی ہیں، اس لیے 19 کا عدد ذکر فرمایا۔ اور ان عقائد میں سب سے بڑا عقیدہ توحید کا ہے تو ان 19 میں بڑا ایک فرشتہ متعین ہے جس کا نام مالک ہے واللہ اعلم۔

﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً﴾

یہ جہنم پر جو نگران ہیں وہ فرشتے ہیں۔

ایک کافر بے ایمان نے کہا تھا کہ جہنم کے 19 فرشتے ہیں ان کو تو میں اکیلا ہی کافی ہوں، 10 دائیں ہاتھ میں لوں گا اور 9 بائیں ہاتھ میں پکڑوں گا۔

انیس فرشتے: امتحانِ کفار اور ایقانِ مومنین

﴿وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّ لَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴾

تو اللہ فرماتے ہیں: ہم نے یہ تعداد ان کی آزمائش و امتحان کے لیے بنائی ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں؟ ورنہ حدیث پاک میں ہے کہ جہنم کو جب دھکیل کر لایا جائے گا تو اس کو لانے کے لیے ستر ہزار لگامیں ہوں گی اور ایک ایک لگام پر ستر ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ یہ 19 تو بڑے فرشتے ہیں۔ باقی ان کے ماتحت کتنے ہوں گے؟ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

تو یہ عدد ہم نے اس لیے بنایا تاکہ کفار کا امتحان ہو اور تاکہ اہل کتاب کا یقین

بڑھ جائے۔ چونکہ ان کی کتابوں میں یہ بات درج تھی تو ان کو یقین آجائے کہ جو ہماری کتابوں میں تھا وہی بات قرآن کریم میں ہے، اور ایمان والوں کا ایمان بڑھ جائے۔

یہ جو فرمایا: ﴿لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ کہ اہلِ کتاب کو یقین ہو۔ یہ یقین شرعی نہیں بلکہ یقین لغوی ہے۔ یقین شرعی ہو تو پھر مسلمان ہو جائیں، مراد یقین لغوی ہے کہ ان کو یقین آجائے کہ جیسے وہاں پر تھا ایسے ہی یہاں پر ہے۔

﴿وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا﴾ اور اس سے ایمان والوں کا ایمان بڑھتا ہے۔ ایمان والوں کا ایمان کماً بھی بڑھتا ہے اور کیفاً بھی بڑھتا ہے۔ ایمان کی کیفیت بڑھتی ہے اور کمیت بھی۔ کمیت کیوں بڑھتی ہے؟ ایک اور چیز ایسی آئی جس پر ایمان لانا ضروری ہے تو ایمان کی مقدار بڑھ گئی ہے اور کیفیت کیوں بڑھتی ہے؟ کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے قرآن کی یہ بات ایسی ہے کہ جس کو یہودی بھی مانتے ہیں، اس سے بندے کی ایمانی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ تو کماً اور کیفاً دونوں طرح ان کا ایمان بڑھتا ہے۔

﴿وَّ لَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

یہ تاکید ہے کہ اہلِ کتاب اور مؤمن اس میں ذرہ بھی شک نہ کریں۔ اسی وجہ سے دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ "اُوْتُوا الْكِتٰبَ" الگ لائے اور مؤمنین کے لیے "وَ الْمُؤْمِنُوْنَ" کا لفظ الگ لائے۔ کیوں کہ مؤمن کا تو ایمان شرعی ہے، یقین شرعی ہے، اس میں شک نہیں کریں گے اور اہلِ کتاب کا یقین شرعی نہیں ہے بلکہ یقین لغوی ہے۔

﴿وَ لِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾

اور جن کے دلوں میں مرض ہے یعنی منافق لوگ اور کافر لوگ یہ سارے

مل کر کہیں گے کہ اللہ کیا چاہتے ہیں ایسی مثالیں بیان کر کے؟ ایسی مثالیں کیوں دیتے ہیں؟ تو فرمایا: اس لیے مثالیں بیان کرتے ہیں تا کہ تم اس کے ذریعہ گمراہ ہو جاؤ اور ایمان والوں کو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔

یہ جواب ان کو تہدیداً ہے، یہ ڈانٹنے والا جواب ہے۔ یہ ڈانٹ کر ان کو سمجھایا جارہا ہے۔

﴿اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ ۝٣٥﴾

یہ جو فرمایا ہے کہ جہنم اتنی سخت ہو گی تو یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ کُبَر یہ کُبریٰ کی جمع ہے۔

کفار احکام کے مکلف ہیں یا نہیں؟

﴿مَا سَلَكَكُمۡ فِىۡ سَقَرَ ۝٤٢ قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ ۝٤٣ وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَ ۝٤٤ وَ كُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِيۡنَ ۝٤٥ وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝٤٦﴾

اصحاب الیمین جب جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ تم جہنم میں کیوں آئے ہو؟ وہ اپنے جرم یہ بتائیں گے:

[1]: "لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ" ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

[2]: "وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَ" ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، یعنی یہ جو حق واجب تھا ہم ادا نہیں کرتے تھے۔

[3]: "وَ كُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِيۡنَ" اسلام کے خلاف ہم گپیں ہانکتے تھے۔

[4]: "وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ" اور ہم قیامت کا انکار کرتے تھے۔

یہ چار جرم بیان کیے۔ پھر ﴿حَتّٰٓى اَتٰٮنَا الۡيَقِيۡنُ ۝٤٧ فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ

شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيۡنَ ﴿٤٨﴾ موت آگئی اب کسی سفارش کرنے والے کی سفارش ان کفار کے حق میں معتبر نہیں ہو گی۔ اب دیکھیں یہاں جرم بتائے: نماز نہ پڑھنا، مسکین کو کھانا نہ کھلانا، اسلام کا مذاق اڑانا اور قیامت کو جھٹلانا۔

سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن جہنم میں کافر کو جو عذاب ہو گا وہ تو احکام کا مکلف ہی نہیں ہے، نماز کا مکلف نہیں ہے، صدقات کا مکلف نہیں ہے۔ جب ان چیزوں کا مکلف ہی نہیں ہے تو یہ چیزیں وجہِ عذاب کیسے ہو سکتی ہیں؟ جس چیز کا بندہ مکلف ہو اگر اس پر عمل نہ کرے تو پھر عذاب ہو گا جیسے ایمان کے مکلف ہیں، ایمان نہ لائے تو پھر عذاب ہو گا لیکن نماز کے مکلف نہیں ہیں، مسکین کو کھانا کھلانے کے مکلف نہیں ہیں تو ان دو کاموں کے نہ کرنے پر عذاب کیوں ہو رہا ہے؟

نفسِ عذاب اور اشتدادِ عذاب:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا بہت پیارا جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک ہوتا ہے نفسِ عذاب اور ایک ہوتا ہے اشتدادِ عذاب۔ نفسِ عذاب کی بنیاد تو کفر ہے اور اشتدادِ عذاب کی بنیاد نماز نہ پڑھنا اور صدقہ نہ دینا ہے۔ تو کفر کی وجہ سے عذاب ہو گا اور نماز نہ پڑھنے اور صدقہ نہ دینے کی وجہ سے عذاب میں اضافہ ہو گا۔

پھر بھی بندے کے ذہن میں کسی درجے میں سوال رہ جاتا ہے کہ جب نماز کا مکلف نہیں تو نماز نہ پڑھنے پر عذاب کا اضافہ کیوں ہو گا؟ حضرت رحمہ اللہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی ایمان لائے گا تو نماز بھی پڑھے گا، ایمان لائے گا تو روزہ بھی رکھے گا۔ تو جس طرح ایمان کے بعد نماز ہے، ایمان کے بعد روزہ ہے۔ تو اگر ایمان نہیں لایا تو عذاب ہو گا اور اگر ایمان لاتا تو جنت ملتی اور ایمان کے بعد نماز بھی تھی تو جس طرح ایمان کی فرع نماز ہے اسی طرح عذاب کی فرع اشتدادِ عذاب ہے۔ تو نفسِ عذاب؛ نفسِ کفر یعنی ایمان نہ لانے پر ہے اور اشتداد عذاب جو عذاب کی فرع ہے یہ

فرع نماز نہ پڑھنے پر ہے۔

یہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی بہت پیاری توجیہ ہے جو انہوں نے بیان القرآن میں ذکر فرمائی ہے۔ میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ بیان القرآن پڑھنے کا اہتمام کیا کریں۔

کفار گدھوں کی مانند ہیں:

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾﴾

ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے اعراض کرتے ہیں! یہ ایسے ہیں جیسے گدھے ہوں اور گدھے بھی جنگلی جو شیر کو دیکھ کر دوڑتے ہیں۔

پہلی بات تو فرمائی کہ یہ گدھے ہیں۔ یہ تشبیہ اس لیے دی کہ جس طرح گدھا بیوقوف ہے یہ بھی بیوقوف لوگ ہیں کہ اپنی آخرت اور دین کو سمجھتے نہیں ہیں اور جنگلی گدھا کیوں کہا؟ اس لیے کہ جو گدھا گھر میں پالتو ہوتا ہے وہ ہر چیز سے نہیں دوڑتا، کسی کسی چیز سے دوڑتا ہے اور جنگلی گدھا؛ جن سے نہیں دوڑنا چاہیے ان سے بھی دوڑتا ہے۔ فرمایا: یہ گدھے جنگلی ہیں اور شیر کو دیکھ کر تو سپیڈ لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ کفار بھی ایمان اور توحید کا نام سن کر ایسے دوڑتے ہیں جیسے جنگلی گدھا شیر سے دوڑتا ہے۔

﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿٥٥﴾﴾

اور پھر یہ کافر کہتے ہیں کہ اگر تم برحق ہو تو پھر تم جو قرآن لاتے ہو تو ہمارے نام پر صحیفے ہمارے ہاتھ پر لاؤ! اللہ فرماتے ہیں: ہرگز ایسی باتیں نہیں ہیں، بس ان کو آخرت کا خوف نہیں ہے۔ یہ قرآن ہم نے رسول صلی اللہ علیہ سلم پر نازل کیا ہے، اس

سے جو چاہے نصیحت حاصل کرے۔

﴿وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾﴾

لیکن اصل تو وہی نصیحت حاصل کرے گا جس کے بارے میں اللہ چاہے۔

اللہ ہی سے ڈرنا چاہیے اور اللہ ہی معاف فرمانے والے ہیں۔

اللہ ہم سب کو تقویٰ کی نعمت عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورة القيامة

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾﴾

قسم کے شروع میں لَا زائدہ کا فائدہ:

"لَاۤ اُقۡسِمُ" کے شروع میں لَا زائدہ ہے۔ لَا زائدہ کا معنی یہ ہے کہ یہ عملاً اُقۡسِمُ فعل پر رفع، نصب اور جزم نہیں دیتا۔ اسے اُقۡسِمُ فعل کے شروع میں اس لیے لاتے ہیں کہ پہلے مخاطب اور مخالف کے عقیدے کی نفی کرتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ قیامت کو نہیں اٹھیں گے تو یہ بات نہیں ہے۔

﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ﴾

میں قیامت کے دن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم ضرور اٹھو گے۔

تو اُقۡسِمُ کے شروع میں جو لَا لاتے ہیں اس سے مخاطب اور مخالف کے نظریہ کی نفی کرتے ہیں۔ اب لَا نہ لائیں تو یہ نفی کیسے سمجھ میں آئے گی؟! اس لیے لَا لایا جاتا ہے اور جب ہم زائدہ کہیں گے تو پھر اشکال ہوتا ہے کہ جب لَا زائدہ ہے تو لانے کا فائدہ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ زائدہ کا معنی محض یہ ہے کہ مابعد فعل میں یہ عمل نہیں کرتا، باقی فائدہ ہے کہ مخاطب کے غلط نظریے کی اس سے تردید ہوتی ہے۔ تو اللہ رب

العزت نے قسم کھائی ہے قیامت کے دن کی اور قسم کھائی ہے ایسے نفس کی جو ملامت کرنے والا ہے اور جوابِ قسم محذوف ہے یعنی "لَتُبْعَثُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کہ تم قیامت کے دن ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

نفس کی تین اقسام:

نفس سے مراد ہوتی ہے روح یا جان۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

1: نفس امارۃ 2: نفس لوامۃ 3: نفس مطمئنہ

سورت یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ﴾[65]

اے اللہ! جو میں بچا ہوں اس گناہ سے تو اس پر میں اپنی کوئی تعریف نہیں کرتا کہ میری خوبی ہے۔ نفس کا تو کام ہی ہے گناہ کی دعوت دینا لیکن جب اللہ بچانا چاہے تو اللہ بچا لیتے ہیں۔

تو فطرتاً ہر نفس "امارہ" ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالی نے گناہ کا تقاضا رکھا ہے۔ گیارہ قسمیں کھا کر اللہ تعالی نے یہ بات سمجھائی ہے: ﴿فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ۪ۙ﴾[66] کہ ہر انسان کی فطرت میں گناہ کا تقاضا ہے۔ لہذا نفس فطرتاً انسان کو گناہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں "نفس امارہ"

اور جب انسان گناہ نہیں کرتا اور اپنے نفس کو کنٹرول کرتا ہے تو اس کے بعد نفس "لوامۃ" بنتا ہے یعنی ملامت کرتا ہے کہ تجھے گناہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے توبہ کی تو نفس لوامہ بن جاتا ہے۔ تو ابتداءً اور طبعاً ہر نفس امارہ ہے اور جب گناہ کر کے توبہ

65۔ یوسف 53:12

66۔ الشمس 8:91

کرتا ہے تو نفس لوامہ بنتا ہے اور جب گناہ چھوڑ کر نیکی اس کی طبیعت بن جاتی ہے تو پھر نفس ''مطمئنہ'' بن جاتا ہے۔ یہاں نفسِ لوامہ کی قسم کھائی ہے۔

بعث بعد الموت کا اثبات:

﴿اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾﴾

انسان کا خیال ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔

اصل تو مقصود ہے کہ پورے انسان کو اٹھائیں گے لیکن پورے انسان کے بجائے ہڈیوں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اس لیے کہ اس جسم میں مدار ہڈیوں پر ہوتا ہے۔ جسم سے ہڈی نکال دو تو گوشت کیا کر سکتا ہے لیکن کسی کی پنڈلی پر گوشت نہ ہو صرف ہڈی ہو انسان پھر بھی چل سکتا ہے۔ زندہ پھر بھی رہتا ہے لیکن اگر ہڈیوں کو نکال دو تو صرف گوشت سے کام نہیں ہوتا۔ چونکہ بنیاد ہڈی ہے اس لیے ہڈیوں کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا: تم پورے انسان کی بات کرتے ہو ہم تو اس کی انگلیوں کے پور تک ٹھیک بنا سکتے ہیں۔

یہاں پوروں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اصل میں یہ محاورہ ہے۔ محاورات میں پورے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جب آدمی نے پورے جسم کی راحت یا تکلیف بتانی ہو تو محاورات میں پورے بتاتے ہیں کہ میرے انگ انگ میں درد ہے، میرا پور پور دُکھتا ہے، لیکن مراد پورا جسم ہوتا ہے۔ تو یہاں محاورہ استعمال کیا ہے۔

اور یہاں ''بَنَان'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ ایک ہیں انسان کے بڑے اعضاء اور ایک ہیں چھوٹے چھوٹے اعضاء۔ عام طور پر بڑے اعضاء کو بنانا آسان ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے اعضاء کو بنانا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بس لے لیں، گاڑی لے لیں، عمارت لے لیں تو بڑی بڑی چیزیں بنانا تو آسان ہوتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی چیزیں

بنانا مشکل ہوتا ہے۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ جو تمہارے چھوٹے چھوٹے پورے ہیں ہم ان کو بھی بنا سکتے ہیں تو باقی بڑا جسم ہمارے لیے بنانا کیا مشکل ہے؟ یا اس لیے پورے کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے کہ انسان کے پورے میں خطوط ہیں، لائنیں ہیں، یہ دنیا میں کسی انسان کی انگلی کے نشان دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ تم پورے جسم کی بات کرتے ہو ہم تو تمہارے پور بھی بنائیں گے۔ پوروں کی جو لائنیں ہیں جیسی اب ہیں ایسی ہو تب بھی گی، ان میں بھی فرق نہیں ہو گا اور تم پورے جسم کی بات کرتے ہو کہ کیسے بنائیں گے؟

﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝٥ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝٦﴾

انسان چاہتا ہے کہ بس آئندہ بھی گناہ کرتا رہے، گناہ پر گناہ کرتا رہے اور پھر پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟

﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝٧ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝٨ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝٩﴾

فرمایا: جب ایسا وقت آئے گا تو آنکھیں حیرت زدہ رہ جائیں گی، دیکھیں گی لیکن کچھ نظر نہیں آئے گا، سورج اور چاند دونوں بے نور ہو جائیں گے، دونوں ایک حالت پر ہوں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب قیامت آجائے گی تو سورج اور چاند دونوں ایک طرف سے طلوع ہوں گے۔

﴿يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝١٠ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝١١ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ ۝١٢﴾

اس وقت انسان کہے گا کہ میں دوڑ کر کہاں جاؤں؟ اب کہیں بھی نہیں جا سکے گا۔ اب تو اللہ تک ہی پہنچے گا۔

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝۱۴﴾

قیامت کے دن انسان کے خلاف گواہ ملائکہ بھی ہوں گے، اعمال والے رجسٹر بھی ہوں گے، زمین بھی ہو گی لیکن خود انسان اپنی ذات کے خلاف گواہ بنے گا یعنی جب انسان جھوٹ بولنا چاہے گا تو اس کے اپنے اعضاء اس کے خلاف بولیں گے۔ باہر سے گواہ لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

﴿وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ۝۱۵﴾

مَعَاذِیر.... مِعْذَار کی جمع ہے جو معذرت سے ہے۔ تو انسان قیامت کے دن عذر بنائے گا لیکن اس کا عذر کام نہیں دے گا۔ کہے گا کہ ہم تو مشرک نہیں تھے لیکن اس کا یہ جھوٹ چل نہیں سکے گا۔ اعضاء خود بول پڑیں گے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، وہ کہیں گے کہ ہم تو شرک کرتے تھے۔

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک تو یہ کوشش فرماتے کہ جبرائیل علیہ السلام جب پڑھیں تو ساتھ ساتھ آپ بھی پڑھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ساتھ ساتھ یاد کرتے تاکہ آئندہ مشکل نہ ہو۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ آپ جبرائیل کے ساتھ جلدی جلدی نہ پڑھیں، آپ کے دل میں قرآن مجید کو جمع کرنا ہماری ذمہ داری ہے، "وَقُرْاٰنَهٗ" اور آپ کی زبان سے پڑھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ۝۱۹﴾

اور جب ہماری طرف سے فرشتہ پڑھے تو آپ اس کی اتباع فرمائیں، سنتے رہیں، پھر ہم آپ کی زبان پر اس کا بیان بھی جاری کرا دیں گے۔

تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ اتنی مشقت برداشت نہ کریں، بس آپ خاموشی سے سنیں، ہم یاد بھی کرادیں گے اور آپ کی زبان پر جاری بھی کرادیں گے۔

ترک قرأت خلف الامام کی دلیل:

﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ۚ۱۸﴾

یہ دلیل ہے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے اور امام کے پیچھے قرأت میں فاتحہ بھی شامل ہے کہ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ دلیل ذرا سمجھیں کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ کہ جب فرشتہ قرآن پڑھے تو آپ فرشتے کی اتباع کریں اور اتباع کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے پڑھیں، بس اتباع کا معنی یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ تو قرأتِ قرآن کی اتباع کو اللہ تعالیٰ نے خاموش ہونے سے تعبیر فرمایا ہے اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں روایت موجود ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا، وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِيْنَ.[67]

کہ امام اس لیے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اتباع کی جائے۔ پھر اس کی تفصیل بتائی کہ "فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا" کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، "وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا" جب وہ پڑھے تو تم خاموش ہو جاؤ، "وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِيْنَ" اور جب امام "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ" پڑھے تو تم آمین کہو!

67۔ سنن ابن ماجۃ، رقم:846

اب دیکھو! یہاں "وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا" ہے کہ جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو اور قرآن کریم میں بھی ہے کہ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ کہ جب فرشتہ قرآن پڑھے تو آپ اس کی اتباع کریں، اتباع کا معنی کہ خاموش رہیں اور اس کی دلیل ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ہے۔ آیت میں اتباعِ قرآن کو خاموشی فرمایا اور حدیث پاک میں اتباعِ امام کو خاموشی فرمایا۔ جب قرآن اور حدیث دونوں فرما رہے ہیں کہ اتباع امام کا معنی خاموشی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب امام پڑھے تو مقتدی کو خاموش رہنا چاہیے۔

یہ امام صاحب کی قوی اور مضبوط دلیل ہے قرآن سے ترک قرأت خلف الامام پر۔

ترکِ قرأت خلف الامام پر گفتگو کا طریقہ:

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اگر کسی شخص سے اس موضوع پر گفتگو کرنا پڑے تو اس کا طریقہ سمجھ لیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہیے! تو آپ دلائل اس پر نہ دیں کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے بلکہ پہلی بات یہ طے کر لیں کہ فاتحہ پڑھنا قرأت کہلاتا ہے یا نہیں؟ فاتحہ کا پڑھنا؛ اس کو قرآن کا پڑھنا کہتے ہیں یا نہیں؟ پہلے یہ طے کر لیں۔ اگر قرأتِ فاتحہ کو قرأتِ قرآن آپ ثابت کر لیں گے تو اگلی بات بہت آسان ہے۔ کیونکہ ہمارا مؤقف یہ نہیں ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے بلکہ ہمارا مؤقف ہے کہ امام کے پیچھے قرآن کی کوئی سورت بھی نہیں پڑھنی چاہیے جبکہ غیر مقلدین کے ہاں فرق ہے کہ امام کے پیچھے 113 سورتیں نہ پڑھے، بلکہ ایک سورت فاتحہ پڑھے اور ہمارا مؤقف ہے کہ 114 سورتوں میں سے کوئی ایک بھی نہ پڑھے۔

اب سوال یہ ہے کہ 113 سورتوں کو تم قرأتِ قرآن کہتے ہو تو کیا فاتحہ کو

بھی قرأتِ قرآن کہتے ہو یا نہیں؟ آپ یہ ثابت کریں اور یہ ثابت کرنا بہت آسان ہے کہ فاتحہ کا پڑھنا بھی قرآن کا پڑھنا ہے۔ اس پر دلیل خود صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا كَانُوا يَفْتَتِحُونَ الصَّلَاةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.[68]

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ اس کا معنی ہے کہ قرأت الحمد للہ رب العالمین سے شروع ہوتی ہے اور الحمد للہ رب العالمین سورت الفاتحہ ہے۔

"فاتحہ قرآن ہے" پر دلیل:

فاتحہ قرآن ہے اس پر ایک اور دلیل سمجھ لیں۔ کسی غیر مقلد سے پوچھو کہ جب تم نماز شروع کرتے ہو تو کہتے ہو: "اَللّٰهُ اَكْبَرُ".... پھر "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ".... آگے "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ".... آگے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾ " آمِيْن .... آگے " بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" اب بات سمجھنا کہ اگر قرآن مجید الٓمّٓ سے شروع ہو رہا ہے تو اعوذ باللہ یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے

68۔ صحیح البخاری، رقم: 743

شروع میں نہ ہوتا بلکہ الٓمّٓ کے شروع میں ہوتا۔ اور اللہ کا فرمان ہے: ﴿فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۹۸﴾﴾[69] کہ جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو اعوذ باللہ پڑھ لیا کریں! تو اس تعوذ کا الحمد للہ رب العالمین سے پہلے ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ الحمد للہ رب العالمین قرآن ہے۔

یہ ہمارے دلائل ہیں۔ تو پہلے یہ بات طے کر لو کہ فاتحہ کا پڑھنا قرآن کا پڑھنا ہے یا نہیں؟ مناظرہ ہوتا ہے تو ہو؛ نہیں ہوتا تو نہ ہو لیکن جب تک بنیاد نہ ہو گفتگو نہ کریں۔ دس گھنٹے لگ جائیں یا تین گھنٹے لگ جائیں یا تین دن گزر جائیں، گفتگو نہیں ہوتی تو نہ ہو لیکن بنیاد ضرور بنائیں۔ میدان اپنی پسند کا سجائیں، پھر میدان میں اتریں۔ مخالف کی پسند کے میدان میں کبھی نہ اتریں۔

قیامت کے دن دیدارِ باری تعالیٰ:

﴿وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ﴿۲۳﴾﴾

قیامت کے دن بعض چہرے تر وتازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھنے والے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار بندے کو ہو گا۔

اور اھل السنۃ والجماعۃ کے تمام مذاہب اور افراد قیامت کے دن رؤیتِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں سوائے معتزلہ اور خوارج کے، یہ دو فرقے قیامت کے دن بھی رؤیت باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے پاس نقلی دلیل تو کوئی نہیں ہے البتہ ان کے پاس صرف عقلی دلائل ہیں کہ رؤیت تب ہوتی ہے کہ جب رائی اور مرئی کے درمیان فاصلہ ہو اور اللہ اور بندے کے درمیان تو فاصلہ نہیں ہے تو رؤیت کیسے ہو گی؟ مثلاً آپ آنکھ سے اس چیز کو دیکھیں گے کہ آنکھ اور اس چیز کے درمیان فاصلہ ہو۔ تو

69۔ النحل 98:16

رؤیت تب ہو گی جب رائی اور مرئی کے درمیان فاصلہ ہو۔ اگر فاصلہ نہیں تو اللہ کو دیکھیں گے کیسے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ صرف عقلی دلیل ہے ان کے پاس۔

ہم نے کہا کہ جب اللہ کی رؤیت پر نص قطعی آجائے تو پھر رؤیت کَمَا یَلِیْقُ بِشَاْنِهٖ (جیسی اللہ کی شان ہے، اسی کے مطابق) ہو گی، اس پر عقلی دلائل پھر ختم ہو جاتے ہیں۔

مجرمین کی رسوائی:

﴿وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ﴿۲۶﴾ وَ قِیْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾﴾

اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ بعض چہرے قیامت کے دن بے رونق ہوں گے، ان کو خدشہ ہو گا کہ ابھی مرے اور جب ان کی روح گلے تک آئے گی تو اس وقت کہا جائے گا کہ بلاؤ کسی علاج کرنے والے کو۔ رَاقٍ سے مراد صرف دم کرنے والا نہیں ہے، اس وقت عرب میں چونکہ رواج اس بات کا تھا کہ لوگ جھاڑ پھونک اور دم کرتے تھے، اس لیے یہاں رَاقٍ فرمایا ورنہ مراد دوا دارو ہے کہ جب انسان کی روح نکلنے لگتی ہے تو پھر کہتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ!

﴿وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ یَوْمَىٕذِ ﹰالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾﴾

پنڈلی پنڈلی پر چڑھ جاتی ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ آدمی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے ٹانگ کو ٹانگ پر رکھ دیتا ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ انسان کمزور اتنا ہو تا ہے کہ پنڈلی دوسری پنڈلی پر چڑھ جائے تو اس کو اتارنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی، اتنا لاغر اور بے بس ہو جاتا ہے۔

﴿فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ۝۳۱ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ۝۳۲ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝۳۳﴾

نہ اس نے توحید کی تصدیق کی ہے اور نہ نماز پڑھی ہے بلکہ اس نے توحید کی تکذیب کی ہے اور پھر واپس چلا گیا ہے اور واپس بھی کیسے جاتا ہے "یَتَمَطّٰى" فخر کرتے ہوئے کہ میں نے بہت بڑا کام کیا کہ میں نے اہل حق کو نہیں مانا۔

﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝۳۴ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝۳۵﴾

یہ جو لفظ ہے "اَوْلٰى" یہ اصل میں وَيْلٌ کا مقلوب ہے۔ لفظ "اَوْلٰى" یہاں چار مرتبہ فرمایا۔ تباہی ہے تباہی ہے تباہی ہے تباہی ہے۔ یہ چار مرتبہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بربادی ہے جب اس پر موت آئے، پھر بربادی ہے جب یہ قبر میں ہو گا، پھر بربادی ہے جب یہ حشر میں اٹھے گا، پھر بربادی ہے جب یہ جہنم میں ہو گا۔ تو چونکہ بربادی کے مقامات چار تھے اس لیے چار مرتبہ یہ لفظ فرمایا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ چار بار تکرار ہوا، تکرار نہیں ہوا بلکہ ہر مقام کی تباہی الگ بتائی ہے۔

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝۳۶ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝۳۷ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝۳۸﴾

کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی فضول چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا یہ نطفہ نہیں تھا جسے رحمِ مادر میں ٹپکایا جاتا ہے، پھر بعد میں وہ گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، اللہ اسے پیدا کرتے ہیں، پھر اس کو برابر کرتے ہیں۔

﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ۝۳۹ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝۴۰﴾

پھر اس سے کسی کو مرد بناتے ہیں اور کسی کو عورت بناتے ہیں۔ کیا اللہ اس

بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے؟!

حدیث پاک میں ہے کہ جب یہ آیت پڑھیں "اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰى" تو یہاں یہ پڑھا کریں: "بَلٰى وَأَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ"[70]

لیکن یہ شرط ہے کہ فرض نماز نہ ہو، نفل نماز ہو تب بھی گنجائش ہے اور نماز کے علاوہ ہو تب بھی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

70۔ شرح السنۃ: ج1 ص157 باب النہی عن القراۃ فی الرکوع

سورۃ الدھر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿هَلۡ اَتٰى عَلَى الۡاِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـئًا مَّذۡكُوۡرًا ۝۱﴾

انسان پر ایک ایسا وقت گزرا ہے کہ یہ بے نام ونشان تھا۔

"هَلۡ" برائے تحقیق:

یہاں یہ بات سمجھنا کہ "هَلۡ" اصل میں تو استفہام کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسی چیز جو بالکل واضح اور کھلی ہو تو اس کو بھی "هَلۡ" سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ مقصد تاکید ہوتا ہے، مقصد استفہام نہیں ہوتا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ دیکھ سورج نکلا ہوا نہیں ہے؟ اس کا معنیٰ کہ ضرور نکلا ہوا ہے۔ میں نے کل تجھے یہ بات نہیں کہی تھی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرور کہی تھی۔ اس لیے بعض مفسرین نے اس مقام پر فرمایا ہے کہ یہاں "هَلۡ" بمعنی قد کے ہے یعنی تحقیق انسان پر ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ بے نام ونشان تھا۔

انسانی تخلیق کا مادہ:

﴿اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ۝۳﴾

ہم نے انسان کو ایسے نطفے سے پیدا کیا ہے جو ملا جلا ہوتا ہے۔ پھر ہم اس کو آزماتے ہیں، اسے آنکھیں دیتے ہیں، کان دیتے ہیں، پھر ہم اس کو دو راستے دکھاتے ہیں کہ یہ شکر کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔

"اَمْشَاجٍ" کا معنی ہے مخلوط۔ یا تو اس سے مراد ہیں اخلاط اربعہ جن سے نطفہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاطِ اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا اور صفراء۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا نطفہ ملتا ہے تو اس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔

﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا ۝۴ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝۵ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝۶﴾

اور کفار کے لیے ہم نے زنجیریں بنائی ہیں، طوق بنائے ہیں اور آگ بنائی ہے۔ جو نیک لوگ ہیں وہ ایسی شراب پییں گے جس میں کافور ملی ہوئی ہو گی اور ایسے چشمے سے پییں گے جس سے نیک لوگ پیتے ہیں اور جہاں چاہیں گے اس کو جاری کر کے لے جا سکیں گے۔

حدیث پاک میں ہے کہ اہلِ جنت کے ہاتھ میں سونے کی چھڑی ہو گی، چشمے کو جہاں حکم دیں گے وہاں سے ابلے گا اور نہر کو جدھر کا حکم کریں گے ادھر کو جاری ہو جائے گی۔ ایک جنتی کہے گا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھ کر پیوں تو اپنی جگہ ہی سے اشارہ کرے گا تو نہر بالکل قریب آ جائے گی۔

نذر کا حکم اور بنیادی شرائط:

﴿يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝۷﴾

اور یہ واجبات کو ادا کرتے ہیں یعنی جو چیزیں ان کے ذمہ لازم ہیں ان کو ادا

کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی۔

لازم کو "النَّذْرِ" سے کیوں ذکر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نذر کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن نذر کی شرائط میں سے دو شرطیں بنیادی ہیں:

1: آدمی نذر اور منت گناہ کی نہ مانے۔

2: نذر ایسی چیز کی نہ مانے جو اس کے ذمہ پہلے سے فرض ہو، مثلاً یہ کہے کہ یا اللہ! اگر میرے پرچے میں 100 نمبر آ جائیں تو میں ظہر کی نماز پڑھوں گا۔ ایسی نذر نہ مانے، اس لیے کہ اگر وہ فیل ہو جائے؛ ظہر تو پڑھنی پھر بھی ہے۔

حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ اس میں تیسری شرط یہ بھی ہے کہ اس کی جنس میں سے کوئی چیز فرض ہو۔ مثلاً نماز کی منت مانے تو نماز فرض ہے، اس لیے نفل کی منت مان سکتا ہے۔ نفلی روزے کی منت مانے تو بھی درست ہے کیوں کہ روزے کی جنس رمضان کے روزے اس پر فرض ہیں لیکن جس عبادت کی جنس میں سے کوئی فرض نہ ہو وہ منت مانے گا تو فرض نہیں ہو گی۔ مثلاً میں نماز جنازہ پڑھوں گا تو جنازے کی کوئی ایسی جنس نہیں جو بندے پر فرض ہو اس لیے یہ منت اس پر لازم نہیں ہو گی۔ میں صدقہ کروں گا تو صدقے کی جنس زکوٰۃ بندے پر لازم ہے اس لیے ایسی منت ماننا اس کے لیے ٹھیک ہے۔

مسکین کو کھانا کھلانے کا اجر:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸﴾

یہ "عَلٰى حُبِّهٖ" میں عَلٰى بمعنی مَعَ کے ہے اور "ہٗ" ضمیر کا مرجع کھانا ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ کھانے سے خود بھی پیار کرتا ہے لیکن پھر بھی غریب، قیدی اور مسکین کو دیتا ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ "ہٗ" ضمیر کا مرجع اللہ ہے کہ اللہ کی محبت میں

خرچ کرتا ہے۔

قیدی اگر مظلوم ہو تو اس کو دینا صدقہ ہے اور اگر ظالم ہو اور قید میں ہو پھر بھی اس پر خرچ کرنا صدقہ ہے۔ قیدی مسلمان ہو تب بھی اس پر خرچ کرنا چاہیے اور قیدی کافر ہو تب بھی اس پر خرچ کرنا اجر کا کام ہے۔

﴿إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾﴾

"عبوس" کہتے ہیں جو چہروں کو بے رونق اور اداس کر دے اور "قمطریر" کہتے ہیں سخت کو۔ فرمایا: یہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں تو اس دن کا خوف ہے جو چہروں کو اداس کر دے گا اور بہت سخت ہو گا۔ اللہ پاک ان کو اس دن سے کے شر سے بچائیں گے اور ان کو اللہ تازگیاں دیں گے اور خوشیاں دیں گے۔

﴿وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴿١٢﴾ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴿١٣﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت دیں گے اور ریشم کا لباس دیں گے اور وہاں پر آدمی مسہریوں پر بیٹھے ہوں گے اور جنت میں نہ تو سخت دھوپ ہو گی اور نہ سخت ٹھنڈ ہو گی۔

﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿١٤﴾﴾

اور درختوں کے سائے بالکل قریب ہوں گے اور ان کے جو پھل ہیں وہ انسان کے اختیار میں ہوں گے کہ جب چاہے کھالے، جب چاہے نہ کھائے۔

جنت کے پیالوں کی بناوٹ:

﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾

قَوَارِيْرَاْ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾

اور ان کے برتن چاندی کے ہوں گے اور پیالے ہوں گے شیشے کے اور شیشہ ہو گا چاندی کا اور بڑے مناسب انداز میں اس کو بھر بھر کر استعمال کرے گا۔

یہ جو فرمایا کہ شیشہ ہو گا چاندی کا، تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ برتن سفیدی میں چاندی کی طرح ہو گا اور صفائی میں شیشے کی طرح ہو گا۔ شیشہ بہت صاف ہوتا ہے لیکن چاندی کی طرح سفید نہیں ہوتا اور چاندی بہت سفید ہوتی ہے لیکن ایسی صاف نہیں ہوتی کہ اس میں سے کوئی چیز نظر آ جائے لیکن وہاں کا برتن ایسا ہو گا کہ دیکھنے میں یوں لگے گا جیسے چاندی ہے اور جب اس کی ستھرائی کو دیکھیں گے تو یوں لگے گا جیسے شیشہ ہے؛ دونوں خوبیاں اس برتن میں ہوں گی۔

جنت کے خادم بچوں کی صفات:

﴿وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾

اور وہاں ان کو پلانے کے لیے ایسے بچے ہوں گے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔

آپ کسی بھی گھر میں جائیں اور کوئی چیز بڑا آدمی لائے تو خوشی ہوتی ہے لیکن چھوٹا سا بچہ لے کر آئے تو کتنا پیارا لگتا ہے۔ اللہ رب العزت وہاں خدمت کے لیے ایسے چھوٹے بچے دیں گے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔

﴿إِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَإِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾﴾

اور جب تم بچوں کو دیکھو گے تو ایسے دیکھو گے جیسے کہ موتی ہوتے ہیں بکھرے ہوئے۔ اور تم دیکھو گے نعمت اور بہت بڑی بادشاہت۔

﴿عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ إِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ

فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

"سندس" کہتے ہیں باریک کو اور "استبرق" کہتے ہیں موٹی کو۔ وہاں ریشم ایسی ہو گی جو موٹی بھی ہو گی اور باریک بھی ہو گی۔ انسان کبھی باریک کپڑا پہنتا ہے تو بہت مزہ آتا ہے، کبھی موٹا کپڑا پہنے تو اس کی لذت اپنی ہوتی ہے۔ دونوں قسم کی ریشم اللہ عطا فرمائیں گے۔

قدر اور اجر میں فرق:

﴿اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾﴾

یہاں دونوں قسم کی ریشم عطا فرمادی ہے۔ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ بھی ہے اور تمہاری محنت کی قدر بھی ہے۔ قدر اور اجر میں فرق ہوتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم اعمال کا اجر بھی دیں گے اور قدر بھی کریں گے، یعنی پرٹوکول بھی دیں گے۔

تنخواہ کو اجر کہتے ہیں اور اس پر پرٹوکول کو قدر کہتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کی تنخواہ دو تین لاکھ ہو گی لیکن وزیر اعلیٰ کا پرٹوکول کیا ہے کہ وہ لاہور سے چلے تو سرگودھا تک روڈ بلاک ہوتے ہیں کہ وزیر اعلیٰ صاحب آرہے ہیں۔ جس آدمی کی تنخواہ دس لاکھ کیا دس کروڑ بھی ہو، تو وزیر اعلیٰ کی طرح اس کے آنے پر کوئی روڈ بلاک نہیں ہو گا۔ تو اجر اور قدر میں فرق ہوتا ہے۔

امام کی تنخواہ مقتدیوں کی بنسبت بہت کم ہوتی ہے۔ مقتدی ایسا جس کی تنخواہ دس لاکھ ہے اور امام جس کی تنخواہ دس ہزار ہے۔ تو اجر دیکھیں تو امام کا کم ہے اور مقتدی کا زیادہ ہے لیکن قدر امام کی زیادہ ہے اور مقتدی کی کم ہے۔ تو اجر اور قدر میں فرق ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ.[71]

جو شخص میری ایک سنت کو زندہ کرے گا جس کو لوگ چھوڑ دیں گے تو اللہ اس کو سو شہید کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ سو شہید کی قدر دیں گے، اس لیے کہ اللہ کے راستے میں نکل کر کٹنے سے جو شہادت ملتی ہے اس پر اللہ جو مقام دیتے ہیں وہ قدر ہے اور سنت کے زندہ کرنے پر اللہ جو نعمتیں دیتے ہیں وہ اجر ہے۔ تو سنت کے زندہ کرنے پر اجر تو مل سکتا ہے لیکن ایک شہید کی قدر نہیں مل سکتی۔ قیامت کے دن جب جنت میں جائیں گے تو واحد شہید ہو گا جس کا اپنے پروٹوکول کو دیکھ کر یہ تقاضا ہو گا کہ مجھے دنیا میں بھیجا جائے، میں پھر جاؤں لیکن سنت کو زندہ کرنے والا کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مجھے دنیا میں بھیج دو تاکہ میں پھر سنت کو زندہ کر کے آتا ہوں۔ چونکہ اس کا وہ پروٹوکول نہیں ہے جو شہید کا ہے۔ تو قدر الگ ہے اور اجر الگ ہے۔

اس حدیث کی وجہ سے بعض لوگ جہاد سے دور ہو جاتے ہیں کہ جب ایک سنت کے زندہ کرنے پر سو شہید کا اجر ملتا ہے تو پھر اللہ کے راستے میں جا کر کٹنے اور شہادت حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میدانِ جہاد میں کٹنے سے اللہ رب العزت انسان کو پروٹوکول دیتے ہیں جو قدر ہے کہ قیامت کے دن شہید ستر آدمیوں کی شفاعت کرے گا جن پر جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہو گا۔ یہ اجر نہیں ہے بلکہ یہ قدر ہے، یہ پروٹوکول ہے۔

﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ ۚ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِیْلًا ﴿۲۸﴾﴾

71۔ الزہد الکبیر للبیہقی: ج1 ص221 من تمسک بسنتي عند فساد اُمتی

ہم نے ہی ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ مضبوط بنائے۔ جوڑ مضبوط بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جوڑ بظاہر بہت کمزور ہوتے ہیں لیکن اللہ نے ان کو ایسے عمدہ طریقے سے بنایا ہے کہ سو سال بھی استعمال ہوتے ہیں تو گھستے نہیں ہیں، پرانے نہیں ہوتے، اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔

مشیتِ الٰہی اور رضائے الٰہی میں فرق:

﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾﴾

یہ بات بڑی توجہ سے سمجھنا! فرمایا: یہ نصیحت ہے، بس جو چاہے اللہ کی طرف چلے، صحیح راستہ اختیار کرے اور اگر تم چاہو کہ ہم اللہ کی طرف چلیں تو تم نہیں جا سکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔

تو اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بندے کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہوتی ہے، جب اللہ چاہے گا تو بندہ نیک اعمال کرے گا، بندہ چاہے بھی تو نیک اعمال نہیں کر سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ بندہ تو مجبورِ محض ہو گیا۔ تو پھر ہمارے عمل کرنے پر ثواب اور نہ کرنے پر عذاب کیوں ہے؟

یہ بات اچھی طرح سمجھنا! ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کوشش تم کرو گے، محنت تم کرو گے، مانگو گے تم، ارادہ تمہارا ہو گا لیکن کر تم تب ہی سکتے ہو جب اللہ چاہے، اللہ کے چاہنے کے بغیر تو تم کر ہی نہیں سکتے لیکن محنت تو تم نے کی ہے، پھر اللہ نے بھی چاہا ہے۔ تم نے گناہ کا ارادہ کیا ہے، گناہ کی کوشش کی ہے، گناہ کے اسباب جمع کیے۔ اللہ کا نظام ہے کہ اسباب پر مسبب؛ دنیا میں ہوتا ہے۔ کوئی بندہ کسی کو تلوار مارے تو اللہ نے تلوار میں قتل کی تاثیر رکھی ہے لیکن قتل کون کرے

گا؟ بندہ۔ اب قتل بندے نے اپنے اختیار سے کیا ہے، اپنے ارادے سے کیا ہے، از خود مارا ہے لیکن اللہ اس تلوار میں قتل کی تاثیر نہ رکھیں تو قتل نہیں ہو سکتا لیکن تاثیر قتل کی تو اللہ نے رکھی ہے اور یہی تمہارا امتحان تھا کہ میں چاہوں گا، تلوار کاٹے گی، نہیں چاہوں گا تو تلوار نہیں کاٹے گی لیکن ہم نے تلوار میں کاٹنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ لہٰذا تم کسی کو ناحق مت مارو۔

ایک بندہ کہتا ہے کہ میں نے خودکشی کی ہے، اللہ نے چاہا تو میں مرا ہوں، اگر اللہ نہ چاہتا تو میں نہ مرتا۔ ہم نے کہا کہ اس کا معنی ہے کہ زہر میں اللہ نے قتل کی صلاحیت رکھی ہے اور تمہیں بتایا ہے کہ زہر نہ کھانا! اگر کھاؤ گے تو مر جاؤ گے، ناحق مرو گے، خودکشی ہو گی اور ہم نے زہر میں مارنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ یہ معنی ہے کہ اللہ چاہتا ہے تو بندہ زہر سے مرتا ہے اور نہ چاہے تو نہیں مرتا، اللہ نے چاہا ہے تو زہر میں تاثیر رکھی ہے، تم نے زہر کو استعمال کیا ہے، لہٰذا تم مجرم ہو۔ تو یہ معنی نہیں ہے کہ بندہ مجبور محض ہے اور اس کو اعمال میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ المرسلٰت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾﴾

یہاں اللہ رب العزت نے پانچ قسمیں کھائی ہیں، پہلے تین قسمیں ہواؤں کی کھائی ہیں اور پھر دو قسمیں فرشتوں کی کھائی ہیں۔

ہواؤں اور فرشتوں کی قَسمیں:

فرمایا: قسم ہے ان ہواؤں کی جو مسلسل چلائی جاتی ہیں، قسم ہے ان ہواؤں کی جو آندھیوں کی طرح چلتی ہیں، قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو اڑا کر منتشر کر دیتی ہیں اور بعد میں بادل ختم ہو جاتے ہیں۔

﴿فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُلۡقِيٰتِ ذِكۡرًا ۙ﴿۵﴾ عُذۡرًا اَوۡ نُذۡرًا ۙ﴿۶﴾﴾

قسم ہے ان فرشتوں کی جو وحی لا کر حق اور باطل کو الگ کر دیتے ہیں، قسم ہے ان فرشتوں کی جو وحی کے ذریعے ذکر لاتے ہیں۔ یا تو اس وجہ سے کہ بندہ معذرت کرے اور توبہ کرلے اور یا اس وجہ سے کہ نہیں کرتا تو اس کو ڈرائیں کہ تم جہنم میں جاؤ گے۔

﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوۡمُ طُمِسَتۡ ۙ﴿۸﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ

﴿فُرِجَتۡ ۝٩ وَإِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ۝١٠ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتۡ ۝١١﴾

جو تمہارے ساتھ وعدہ ہے قیامت کا وہ ہو کر رہے گا، اور یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ جب ستارے بے نور ہو جائیں گے، آسمانوں میں دراڑیں آ جائیں گی، جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا، جب انبیاء علیہم السلام کو جمع کیا جائے گا۔

﴿لِأَيِّ يَوۡمٍ أُجِّلَتۡ ۝١٢ لِيَوۡمِ الۡفَصۡلِ ۝١٣ وَمَآ أَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ ۝١٤﴾

اگر کوئی کہے کہ اس معاملے میں پھر تاخیر کس دن کی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ فیصلہ کے دن کی اور تمہیں اندازہ ہے کہ فیصلے کا دن کون سا ہے؟

جھٹلانے والوں کو انجام:

﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِينَ ۝١٥ أَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡأَوَّلِينَ ۝١٦ ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِينَ ۝١٧ كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِينَ ۝١٨ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِينَ ۝١٩﴾

کیا ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک نہیں کیا اور ان کے پیچھے دوسرے لوگوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔ جھٹلانے والوں کے لیے سخت ہلاکت ہے۔ ویل؛ جہنم کی ایک وادی ہے جس میں جہنمیوں کی پیپ جمع ہوتی ہے۔

﴿اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی ظِلٍّ ذِیۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝٣٠ لَّا ظَلِيۡلٍ وَّلَا يُغۡنِیۡ مِنَ اللَّهَبِ ۝٣١﴾

قیامت کے دن اعلان ہو گا کہ تم آؤ اس بادل کی طرف اور سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے دن جہنم سے اٹھے گا، جو دیکھنے میں سائبان کی طرح ہو گا لیکن چونکہ دھواں ہو گا اس لیے نہ اس کا سایہ ہو گا اور نہ وہ گرمی سے بچائے گا۔

﴿اِنَّهَا تَرۡمِیۡ بِشَرَرٍ کَالۡقَصۡرِ ﴿۳۲﴾ کَاَنَّہٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴿۳۳﴾﴾

پھر اس دھویں سے شعلے نکلیں گے۔ انگارے نکلیں گے جو بڑے بڑے محل کی طرح ہوں گے۔ پھر جب محل ٹوٹے گا تو اس سے چھوٹے چھوٹے انگارے نکلیں گے جو زرد اونٹوں کی طرح ہوں گے۔

متقین کی کامیابی:

﴿اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ ظِلٰلٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۴۱﴾ وَّ فَوَاکِہَ مِمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۴۲﴾ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا ہَنِیۡٓـًٔۢا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۴۴﴾﴾

قیامت کے دن نیک لوگ درختوں کے سائے میں ہوں گے اور پانی کے چشموں میں ہوں گے اور انہیں ایسے پھل ملیں گے جیسے یہ چاہیں گے۔ حکم ہو گا کہ رغبت کے ساتھ جو چاہو کھاؤ۔ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے اور ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

﴿وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۵﴾ کُلُوۡا وَ تَمَتَّعُوۡا قَلِیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ ارۡکَعُوۡا لَا یَرۡکَعُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۹﴾﴾

ہلاکت اور تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ کافروں کو حکم ہے کہ تم چند روز کھا پی لو اور عیش کی زندگی گزار لو۔ حقیقت میں تم ہی مجرم ہو! ہلاکت اور تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے آگے جھکو تو جھکتے نہیں ہیں۔ ہلاکت اور تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہاں رکوع سے مراد یا تو اس کا لغوی معنی ہے جھکنا۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ

اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکا دو اور انہیں تسلیم کر لو لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔ یا اس سے مراد نماز والا رکوع ہے۔ تو رکوع بول کر پوری نماز مراد ہے کہ جب ان کو نماز کے لیے بلایا جاتا ہے تو نماز کے لیے نہیں آتے۔

لفظ "حدیث" سے غیر مقلدین کے استدلال کا جواب:

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰﴾

قرآن کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ اس کے بعد کوئی اور چیز بھی ہے جس کو یہ مانیں گے؟

حدیث پاک میں ہے کہ جب تلاوت کرتے ہوئے یہاں پر پہنچیں ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ تو یہ پڑھا کریں: "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔

یہاں پر بعض غیر مقلد کہتے ہیں کہ دیکھو! ہم اہل حدیث ہیں، قرآن میں ہے ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾۔ میں نے کہا کہ یہ بات کتنی بے ہودہ ہے، یہ تو لغوی بات ہے اور "ہٗ" ضمیر کا مرجع قرآن ہے کہ قرآن کریم کے بعد وہ کون سی بات ہے کہ جس کو یہ مانیں گے؟ تو یہاں تو جو چیز قرآن کے خلاف ہے اس کو حدیث کہا جا رہا ہے۔ اگر اس استدلال سے تم اہل حدیث بنو گے تو اس حدیث سے مراد قرآن کے خلاف باتیں ہیں۔

اور کبھی کہتے ہیں کہ جی دیکھو! قرآن کریم کو اللہ نے "حدیث" کہا ہے ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾[72] تو اللہ نے احسن حدیث قرآن کو کہا ہے۔

میں نے کہا: قرآن کریم میں جس طرح اللہ نے اپنی باتوں کو "حدیث" فرمایا

72۔ الزمر 23:39

ہے اسی طرح اللہ نے غیر کی باتوں کو بھی "حدیث" فرمایا ہے۔ فرمایا: ﴿فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ﴾ تو یہ لغوی بات ہے۔ جب یہ چیزیں ذہن میں رکھو گے تو الجھن کبھی نہیں ہوتی۔

میں نے کہا: لغت میں تو ہر بات کو "حدیث" کہتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ صحیح البخاری حدیث کی کتاب ہے، صحیح مسلم حدیث کی کتاب ہے تو یہاں حدیث سے مراد اصطلاحی معنی ہے۔ تو لغتاً اس کا معنی الگ ہوتا ہے اور اصطلاحاً اس کا معنی الگ ہوتا ہے۔ ہم لغات کے پابند نہیں ہیں بلکہ ہم اصطلاح کے پابند ہیں۔

اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورۃ النبأ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيۡ هُمۡ فِيۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ﴿۳﴾﴾

بڑی خبر کیا ہے؟

عَمَّ یہ "عَنۡ" کے آگے "مَا" استفہامیہ ہے اور اس کا الف گرا ہوا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کے بعد قیامت کا ذکر فرمایا تو مشرکین ازروئے استہزاء اور مذاق یہ بات کہتے کہ قیامت کب آئے گی؟ تو یہاں اللہ رب العزت نے کتنے پیارے انداز میں بات کی ہے کہ یہ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ یہ پوچھتے ہیں اس خبر کے بارے میں اور وہ بھی بہت بڑی خبر کے بارے میں اور اس میں اہلِ حق سے اختلاف کرتے ہیں! یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی کہے کس کے بارے میں پوچھتے ہو؟ استاد جی کے بارے میں؟ جن کو ساری دنیا جانتی ہے! اب دیکھو سوال ہو رہا ہے۔

تو اسی طرح یہاں "عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ" ہے کہ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ اس خبر کے بارے میں جس میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

﴿كَلَّا سَيَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵﴾﴾

ان کا جو خیال ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، تو فرمایا: ہرگز ایسا نہیں! قیامت آئے گی اور یہ لوگ دیکھ بھی لیں گے۔ ”ثُمَّ كَلَّا“ پھر سنو! یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی، ہرگز ایسا نہیں! قیامت آئے گی اور یہ لوگ دیکھ بھی لیں گے۔ ان کا خیال غلط ہے کہ قیامت نہیں آئے گی۔

یہ میں صرف اس لیے کہتا ہوں کہ ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥﴾ کے ترجمے کو سمجھو! یہ اللہ نے کیوں فرمایا ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ کہ ایک بڑی خبر کے بارے میں پوچھتے ہیں اور ان کے خیال میں ہے وہ نہیں آئے گی، فرمایا: ہرگز ایسی بات نہیں! وہ ضرور آئے گی اور یہ لوگ دیکھ لیں گے اور پھر سنو! ایسا نہیں ہو سکتا جیسے یہ کہتے ہیں، قیامت آئے گی، ﴿سَيَعْلَمُوْنَ﴾ اور تمہیں پتا چل جائے گا جب وہ آئے گی۔

الفاظ کے ساتھ لہجے کی اہمیت:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ استفہام کو استفہام کے لہجے میں کہو تو پھر بات سمجھ آتی ہے۔ ہم استفہام کو استفہام کے انداز میں نہیں کہتے تو پھر سمجھ نہیں آتی کہ قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کو سب سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی دیکھے ہیں اور ادائیں بھی دیکھی ہیں، ہم تک الفاظ پہنچتے ہیں اور ادائیں نہیں پہنچتیں، اس لیے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اور جب ہم قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہیں پھر یونہی گزر جاتے ہیں اور ترجمہ کرتے ہیں کہ ”کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ پوچھتے ہیں ایک خبر کے بارے میں!“ تو طالب علم نہیں سمجھ پاتا کہ قرآن کیسے سمجھایا جارہا ہے۔ اس لیے میں باربار عرض کررہا ہوں کہ اس کا طرز سمجھو! جیسے دو طالب علم ہوں اور تبصرہ کررہے

ہوں کسی امتحان کے بارے میں تو استاد جی سن لیں اور پوچھیں: ”کس چیز کے بارے میں تبصرہ کر رہے ہو؟ امتحان کے بارے میں؟ وہ تو ضرور ہو گا، کچھ فائدہ نہیں تبصرہ کرنے کا۔“ اور اگر لہجہ سمجھائے بغیر ویسے ذکر کرو کہ ”طالب علم کس چیز کے بارے میں تبصرہ کرتے ہیں؟ تبصرہ کرتے ہیں امتحان کے بارے میں“ تو وہ کیسے سمجھ آئے گا؟

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن کریم سمجھیں اور پھر جب درسِ قرآن دیں تو پھر لوگوں کو سمجھائیں، جھجک سے کام نہ لیں! قرآن کریم محاورات پر بات کرتا ہے اور محاورات؛ کو محاورات کے انداز میں کہہ کر بات کی جاتی ہے اور قرآن جس لہجے میں بات کرتا ہے اس لہجے میں سمجھاؤ تو پھر مخاطب کو بات سمجھ آتی ہے وگرنہ سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ نبا کہتے ہیں بڑی خبر کو، عظیم کہہ کر مزید اس کی عظمت بیان کی، یہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ بڑی خبر کے بارے میں جس میں اہلِ حق سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، کَلَّا . . ہرگز نہیں! وہ آئے گی، ”سَيَعْلَمُوْنَ“ ان کو پتا چل جائے گا، ”ثُمَّ“ پھر سنو! تم کہتے ہو کہ قیامت نہیں آئے گی، فرمایا: آئے گی اور ان کو پتا چل جائے گا جب آئے گی۔ اب اگر یوں بیان کریں تو ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ میں آتا ہے وگرنہ ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً میں کہتا ہوں: دیکھو! کل تم نے دس بجے پہنچنا ہے، پھر سنو! میں کہہ رہا ہوں کہ دس بجے پہنچنا ہے! اب دیکھو! ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ آ رہا ہے یا نہیں؟ (آ رہا ہے۔ سامعین) اگر اس طرز سے نہ سمجھائیں تو قرآن کی فصاحت وبلاغت سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ صرف کتابوں کے مطالعہ سے نہیں سمجھ آتے، یہ درس گاہوں میں سمجھ آتے ہیں۔

انعامات باری تعالیٰ:

﴿اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۪ۙ﴿۷﴾ وَّ خَلَقۡنٰکُمۡ اَزۡوَاجًا ۙ﴿۸﴾﴾

یہ لوگ توحید اور قیامت میں شک کرتے ہیں، یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے زمین کو کیسے نرم بچھونا بنادیا اور زمین میں پہاڑوں کو میخوں کے طور پر ایسے لگادیا ہے کہ زمین ہل نہیں سکتی اور ہم نے تم سب کو جوڑا جوڑا پیدا کیا؛ مرد اور عورت۔

نیند؛ تھکاوٹ اتارنے کا مؤثر ذریعہ

﴿وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾﴾

"سُبَاتًا" یہ سَبۡت سے ہے، سَبۡت کا معنی ہوتا ہے کاٹ کے رکھ دینا۔ نیند بھی بے آرامی کو ختم کر دیتی ہے۔ تو فرمایا: ہم نے نیند بنائی ہے تمہارے لیے راحت کی چیز، جس قدر راحت نیند سے آتی ہے کسی اور چیز سے نہیں آتی۔ میں مشاہدات نہیں بتاتا میں تجربات بتارہا ہوں۔ آدمی بہت تھکا ہو اور لوگ دبانا شروع کر دیں تو تھکاوٹ نہیں اترتی، سو جائیں تو تھکاوٹ اتر جاتی ہے۔ تیل لگواؤ تھکاوٹ نہیں اترے گی، سو جاؤ گے تھکاوٹ اتر جائے گی۔ تو نیند سب سے زیادہ راحت کی چیز ہے تھکاوٹ کو ختم کرنے میں، اور اس کا آپ معمول بنائیں خصوصاً قیلولہ کا، قیلولہ دس منٹ کا ملے پھر بھی سنت سمجھ کر کریں، اس لیے کہ اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ میرا ابھی کراچی کا سفر تھا تو چونکہ پورا دن سفر رہا، عشاء کے بعد پھر میرا بیان تھا تو میں وہاں پہنچا ہوں تقریباً 7:40 پر، 8:00 بجے اذان تھی، میں پونے آٹھ سو گیا اور 8:10 پر اٹھا، نیند پوری ہو گئی، یہ اتنی سی نیند نہ ہوتی تو بہت تھکاوٹ ہوتی۔

﴿وَّ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِبَاسًا ﴿ۙ۱۰﴾﴾

اور نیند کے لیے بہترین ہوتا ہے کہ روشنی کم ہو، شور نہ ہو، آرام دہ ماحول ہو اور اس کے لیے اللہ نے رات کو بنایا ہے، خود بخود روشنی ختم ہو جاتی ہے، خود بخود لوگوں پر ایسے آثار آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ ہر بندہ سونے کے لیے متوجہ ہو جاتا ہے، اس لیے رات کا انتخاب کیا۔

﴿وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾﴾

اور کام کرنے کے لیے روشنی چاہیے تو اس کے لیے انسان کے نکالے بغیر خود بخود سورج نکلتا ہے، اس لیے فرمایا کہ دن کو ہم نے بنایا ہے کام کرنے کے لیے، اندھیرے میں آدمی سوتا ہے اور روشنی میں کام کرتا ہے۔ تو رات میں اندھیرا کر دیا کہ سو جاؤ اور دن کو روشنی کر دی کہ اب اپنا کام کر لو۔

آسمانوں کی تخلیق وتزیین:

﴿وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾﴾

اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور سورج کو روشن چراغ بنایا اور پانی سے بھرے ہوئے بادلوں سے ہم مسلسل پانی اتارتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے غلہ، سبزیاں اور باغات اگائیں۔ باغات بھی کیسے؟ فرمایا "اَلْفَافًا" ایک دوسرے سے ملے ہوئے جنہیں گھنے باغات کہتے ہیں۔

وقوعِ قیامت کا بیان:

﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾﴾

قیامت کا دن مقرر ہے جس دن صور میں پھونک دیا جائے گا تو تم فوج در فوج

آؤ گے۔ بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ سوار ہو کر آئیں گے اور کچھ لوگ پیدل آئیں گے اور کچھ کو بیڑیوں میں جکڑ کر لایا جائے گا۔ جیسے جیسے لوگوں کے اعمال ہوں گے ان کے مطابق ان سے معاملہ ہو گا، اور یہ بھی ہے کہ کافر الگ ہوں گے اور مؤمن الگ ہوں گے، پھر مؤمنین میں بھی فساق الگ ہوں گے، صالحین الگ ہوں گے تو قیامت کا بہت ہولناک منظر ہو گا۔ اللہ اس ہولناکی سے بچائیں۔

جو انسان دنیا میں دین کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے اللہ آخرت کی ہولناکی سے اس کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اللہ کریم ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ بندہ دنیا میں بھی دین کے لیے مصیبتیں اٹھائے اور قیامت کو پھر مصیبت زدہ ہو ایسا نہیں ہوتا! یہ اللہ کی شان کریمی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالی سے ہمیشہ عافیت مانگیں لیکن کبھی دنیا کی تکلیف آجائے تو برداشت کرنی ہے اور آخرت کی مشقت سے بچنا ہے۔

﴿وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝١٩ وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝٢٠﴾

اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس کے دروازے ہی دروازے بن جائیں گے،

اور پہاڑوں کو چلایا جائے گا تو وہ سراب بن جائیں گے۔ جنگل میں جو ریت ہوتا ہے وہ دور سے پانی نظر آتا ہے لیکن قریب جائیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا سوائے ریت کے، اس کو بھی سراب کہتے ہیں۔ تو قیامت کے دن یہ پہاڑ بھی اسی ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر نظر آئیں گے۔

”حَقَب“ کی مقدار:

﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝٢١ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ۝٢٢ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝٢٣﴾

جہنم گھات میں ہے جیسے کوئی چھپ کر بیٹھا ہوتا ہے کہ اچانک حملہ کرے گا

اسی طرح جہنم گھات میں لگی ہوئی ہے، یہ جائیں گے تو فرشتے پکڑ کے جہنم میں ڈال دیں گے۔ "لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا"۔۔ یہ جہنم سرکش لوگوں کے لیے ٹھکانا ہے۔ طاغین سے مراد کافر ہیں یا طاغین سے مراد وہ مسلمان ہیں جو فاسق اور گناہگار ہیں۔ "لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا"۔۔ اور اس جہنم میں وہ زمانہ دراز۔۔ در زمانہ در زمانہ در زمانہ رہیں گے۔ اَحْقاب یہ حَقَب کی جمع ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق ایک حقب اَسی سال کا ہوتا ہے۔ ایک سال بارہ مہینے کا، ایک مہینا تیس دن کا اور ایک دن ایک ہزار سال کا تو اس اعتبار سے حقب بنتا ہے دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا۔

اس پر سوال یہ ہے کہ کفار کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور یہاں فرمایا کہ احقاب یعنی کئی زمانوں تک رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرکار وہ جہنم سے نکل جائیں گے، تو یہ دوام تو نہ ہوا؟

اس کے دو جواب ہیں؛ ایک یہ کہ یہ عذاب کفار کے لیے نہیں ہے، یہ فساق مسلمانوں کے لیے ہے اور طاغین سے مراد فساق ہیں، یہ ایک مدت دراز تک جہنم مین رہیں گے اور پھر نکل جائیں گے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں نکلنے کا ذکر نہیں ہے، یہ نہیں فرمایا کہ چند حقب رہیں گے پھر نکل جائیں بلکہ فرمایا کہ کئی احقاب جہنم میں پڑے رہیں گے یعنی ایک حقب ختم ہو گا تو دوسرا شروع، وہ ختم ہو گا تو تیسرا شروع، وہ ختم ہو گا تو چوتھا شروع، تو احقاب ختم نہیں ہوں گے، ایک ختم ہو گا تو دوسرا شروع ہو جائے گا۔

جہنم کا ہولناک عذاب:

﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿٢٦﴾﴾

نہ اس میں کوئی ٹھنڈی چیز ان کو ملے گی اور نہ ہی کوئی اچھی چیز پینے کی ملے گی، ملے گا تو کیا؟ ﴿حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾ گرم پانی اور پیپ، اور یہ پورا پورا بدلہ ہے۔

اس پر بھی سوال ہے کہ یہاں ہے ﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا﴾ کہ ان کو ٹھنڈ نہیں ملے گی اور بعض روایات میں ہے کہ جہنم میں زمہریر یعنی ٹھنڈک کا عذاب بھی ہو گا۔ جواب یہ ہے کہ اس زمہریر سے مراد ہے ایسی ٹھنڈ جو بندے کو جما کر رکھ دے اور "بَرْدًا" کہتے ہیں ایسی ٹھنڈ کو جو معتدل ہو۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿٢٩﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾﴾

یہ لوگ قیامت کے حساب کی امید نہیں رکھتے تھے اور ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ ہم نے ہر چیز کو لکھ کر رکھا ہوا ہے اور قیامت کے دن ارشاد ہو گا کہ چکھو! آج ہم تمہیں صرف عذاب ہی چکھائیں گے۔

متقین کے لیے انعامات:

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿٣٣﴾﴾

یہاں سے متقین کا ذکر ہے۔ فرمایا: متقین کے لیے کامیابی ہے، ان کو باغات ملیں گے اور بطورِ خاص انگور کے باغات ملیں گے۔ یہ تخصیص بعد تعمیم ہے۔ اور ان کو ایسی عورتیں ملیں گی جن کی ابھرتی جوانی ہو گی۔ "اَتْرَابًا" ہم عمر، "كَوَاعِبَ" یہ کاعبہ کی جمع ہے اور کاعبہ کہتے ہیں کہ جس کا کچھ حصہ ابھرا ہو، اس لیے ٹخنے کو کعب کہتے ہیں کیونکہ ٹخنہ ابھرا ہوتا ہے باقی جسم سے۔ ابھرتی جوانی کا معنی ہوتا ہے کہ ان کے پستان اٹھے ہوتے ہیں، یہ عورت میں حسن ہے جس کے بغیر انسان کو لطف نہیں آتا اور اللہ نے جنت کی حوروں کی اٹھارہ صفتیں بیان فرمائیں اور یہ اس لیے بیان کیں کہ ان کو

بیان کیا کرو، انہیں سنا کرو کیونکہ اس سے بندے کی رغبت بڑھتی ہے۔ تا کہ ناپاک حسن سے جان چھوٹے اور پاک حسن کی طرف رغبت ہو۔ اللہ ہم سب کو حوریں عطا فرمائے۔(آمین)

﴿وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ﴿٣٥﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾﴾

اور صاف بھرے ہوئے پیالے ہوں گے، جنت میں نہ بے ہودگی ہو گی نہ جھوٹ ہو گا۔ یہ بدلہ ہے تمہارے رب کی طرف سے اور عطا ہے بغیر حساب کے۔

اس پر سوال یہ ہے کہ جزا کہتے ہیں کہ جو اعمال کے بدلے میں ہو اور عطا کہتے ہیں جو بغیر بدلے کے ہو۔ تو جزا اور عطا دو چیزیں اکٹھی کیسے ہوں گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تو انسان نے نیک اعمال کیے ہیں اور ان نیک اعمال کی وجہ سے جنت میں بھیجا جا رہا ہے لیکن بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے نیک اعمال اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے بدلے میں جنت ہو، یہ اللہ کی طرف سے عطیہ ہے جو تمہیں عطا کر رہے ہیں۔

﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ﴾

قیامت کے دن کوئی پوچھ نہیں سکے گا کہ اس کو چھوٹی جنت دی ہے اس کو بڑی کیوں؟ اس کو سزا کیوں دی؟ اس کو معاف کیوں کیا؟ جبرائیل امین بھی ہوں گے اور دوسرے فرشتے بھی ہوں گے، سارے اب صف در صف کھڑے ہوں گے۔

﴿لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾﴾

اللہ کی اجازت کے بغیر قیامت کے دن کوئی بات بھی نہیں کر سکے گا اور جو

کوئی بات کریں گے تو وہ درست بات ہی کریں گے۔ یہ حق ہے، سچا دن ہے، جو اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنانا چاہتے ہیں تو بنالیں۔

کافر کی حسرت؛ کاش میں مٹی بن جاتا

﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝٤٠﴾

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن پہاڑ وغیرہ ختم کر کے پوری زمین کو برابر کیا جائے گا تاکہ درمیان میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی وجہ سے ایک کو دوسرا نظر نہ آسکے۔ پھر قیامت کے دن اللہ ایسی بکریاں کھڑی کریں گے کہ ایک بکری نے دنیا میں اس بکری کو مارا تھا جس کے سینگ نہیں تھے، اللہ سینگ والی بکری کے سینگ ختم کر دیں گے اور جس کے دنیا میں سینگ نہیں تھے اس کو دیں گے اور فرمائیں گے کہ اس کو ٹکر مار کر بدلہ لو! وہ بدلہ لے گی۔ پھر حکم ہو گا کہ دونوں مٹی بن جاؤ! اس وقت کافر کہے گا: ”يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا“ اے کاش! آج میں بھی مٹی بن جاتا... لیکن نہیں بن سکے گا۔

یہاں ایک نکتہ سمجھیں کہ جنت اوپر ہے اور جہنم نیچے ہے۔ نیچے مٹی ہے اور جہنمی آدمی نیچے کیوں جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گیارہ قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے انسان کی جبلت میں فجور اور تقویٰ دونوں رکھے ہیں۔ فجور کا معنی ہے من مانی کرنا اور تقویٰ کا معنی ہے مان کے چلنا۔ مان کے چلنے والی مخلوق ہے ملائکہ جو اوپر ہیں اور من مانی کرنے والی مخلوق جانور ہے جو زمین سے بنتی ہے اور نیچے رہتی ہے۔ تو جو انسان من مانی کرتا ہے اللہ اس کو وہ ٹھکانا دیتا ہے جو جانوروں کا ہے جو نیچے ہے اور جو مان کے چلتا ہے اس کو وہ ٹھکانا دیتا ہے جو ملائکہ کا ہے اور وہ اوپر ہے، اس لیے جنت کو اوپر بنایا اور جہنم کو نیچے بنایا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ النّٰزعٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾
فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ﴿۵﴾﴾

فرشتوں کی پانچ اقسام:

[1]: "وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا".. قسم ہے ان فرشتوں کی جو کافروں کی روح کو کھینچ کر نکالتے ہیں۔

[2]: "وَّ النّٰشِطٰتِ نَشۡطًا".. اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو مسلمانوں کی روح اتنی آسانی سے نکالتے ہیں کہ جیسے گرہ کھول دی گئی ہو، چمڑے کی مشک میں پانی ہے اس کو کھول دو، غبارے میں ہوا ہے اس کا منہ کھول دو۔ جس طرح ہوا نکلتی ہے اسی طرح تیزی سے مسلمان کی روح نکل جاتی ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں۔ کافر کی روح مشکل سے نکلتی ہے، بظاہر اگر نظر آئے بھی کہ کافر جلدی مر گیا تو بظاہر کا حکم اور ہوتا ہے، اندر کی تکلیف اور ہوتی ہے۔ مسلمان کو بظاہر تکلیف محسوس ہو بھی تو پھر بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ اللہ کافر کے لیے موت کے بعد برزخ کا عذاب مستحضر کرتے ہیں اس کو دیکھ کر کافر کی روح کا جسم سے

نکلنے کو دل ہی نہیں کرتا، فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں پھر اس کو تکلیف ہوتی ہے، اور مؤمن کے لیے اللہ برزخ کے انعامات سامنے کر دیتے ہیں تو روح دوڑ کر وہاں جاتی ہے۔ اس لیے جو شہید ہے اس کی روح عام انسان کی بنسبت بہت آسانی سے نکلتی ہے، اللہ ہم سب کو شہادت کی موت عطا فرمائے۔(آمین)

[3]: ”وَّ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا“.. اور قسم ہے ان ملائکہ کی جو تیرتے ہیں۔ تیرنے کا معنی کہ جس طرح زمین ہے اس میں درخت ہیں پہاڑ ہیں رکاوٹیں ہیں اور پانی میں رکاوٹیں نہیں ہیں، کشتیاں بغیر رکاوٹ کے بھاگتی رہتی ہیں، اس لیے فرمایا کہ ملائکہ اللہ کے حکموں کو لے کر تیرتے ہیں یعنی ان کو بھی درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

[4]: ”فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا“.. جو حکم ملتا ہے اس کو لے کر دوڑتے ہیں۔

[5]: ”فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا“.. پھر جو حکم خدا ان کو دیتے ہیں ان کے لیے تدبیر اختیار کرتے ہیں۔

قیامت کا منظر:

﴿یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ ۙ﴿۶﴾ تَتۡبَعُہَا الرَّادِفَۃُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۙ﴿۸﴾ اَبۡصَارُہَا خَاشِعَۃٌ ۘ﴿۹﴾﴾

جس دن ہلانے والی ہلا کر رکھ دے گی۔ اس سے مراد پہلا صور ہے۔ اس کے پیچھے دوسری آئے گی۔ اس سے مراد دوسرا صور ہے۔ اس دن آدمیوں کے دل لرزتے ہوں گے اور ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔

﴿یَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَۃِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً ؕ﴿۱۱﴾ قَالُوۡا تِلۡکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ ۘ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا ہِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۙ﴿۱۳﴾ فَاِذَا ہُمۡ بِالسَّاہِرَۃِ ؕ﴿۱۴﴾﴾

کہتے ہیں کہ کیا ہم دوبارہ پہلی حالت پر لوٹا دیے جائیں گے؟ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں بن جائیں پھر بھی؟ مزید یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہاری بات سچی ہے پھر تو ہمارا بہت نقصان ہو گا! ہم نے تو قیامت کے لیے کوئی عمل کیا ہی نہیں ہے۔

اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ وہاں تو ایک کڑک ہو گی اور سارے لوگ نکل کر میدان میں آ کھڑے ہوں گے، پھر ان کو سمجھ آئے گی۔

موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝١٥ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٦﴾

جس طرح آج یہ لوگ باتیں کر رہے ہیں کہ کیا ہو گا؟ اگر حشر بپا ہوا تو بہت نقصان ہو گا وغیرہ وغیرہ... تو موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ نے سنا؟ انہیں فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا اور فرعون بھی سرکشی کرتا تھا، وہ بھی جھٹلاتا تھا! وہ بھی ایسی باتیں کرتا تھا، بالآخر فرعون کا کیا حشر ہوا؟ یہ لوگ بھی آج بک بک کرتے ہیں ان کا حشر بھی ان سے بدتر ہو گا۔

وادی مقدس جس کا نام طویٰ تھا وہاں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی۔

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝١٧ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝١٨ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝١٩﴾

کہ فرعون کے پاس جاؤ! اس نے سرکشی کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جا کر فرعون سے کہا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تو ٹھیک ہو جائے؟ تو اپنی اصلاح چاہتا ہے؟ میں تیرے رب کے راستے کی رہنمائی کروں تاکہ تجھ میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے!

﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝٢٠ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝٢١ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝٢٢﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو معجزات دکھائے، اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی، پھر وہ پیٹھ پھیر کر دوڑا یعنی تخت کی طرف گیا، وہاں سب کو جمع کیا اور پکار کر کہنے لگا: "اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی" میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔

﴿فَاَخَذَہُ اللّٰہُ نَکَالَ الۡاٰخِرَۃِ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾﴾

اللہ نے اسے دنیا اور آخرت کا ایسا عذاب دیا کہ بعد والوں کے لیے عبرت بن گیا۔ "نکال" ایسے عذاب کو کہتے ہیں کہ جو دوسروں کے لیے عبرت کا باعث بنے۔

بعث بعد الموت پر دلیل:

﴿ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰہَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمۡکَہَا فَسَوّٰىہَا ﴿۲۸﴾﴾

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں کیسے اٹھائیں گے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ تمہیں اٹھانا کیا مشکل ہے؟ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ ہم نے آسمان کو پیدا کیا ہے تو تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کو؟ آسمان کی چھت کو اونچا کیا اور پھر اسے برابر کر دیا ہے۔

﴿وَ اَغۡطَشَ لَیۡلَہَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰىہَا ﴿۲۹﴾﴾

فرمایا: اور اللہ نے اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کی دھوپ نکالی۔ اصل میں چونکہ سورج جاتا ہے تو رات آتی ہے، سورج آتا ہے تو روشنی آتی ہے اور سورج کا تعلق آسمان سے ہے اس لیے ان سب چیزوں کی نسبت آسمان کی طرف ہو رہی ہے۔

﴿وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰىہَا ﴿۳۰﴾ اَخۡرَجَ مِنۡہَا مَآءَہَا وَ مَرۡعٰىہَا ﴿۳۱﴾ وَ الۡجِبَالَ اَرۡسٰىہَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّکُمۡ وَ لِاَنۡعَامِکُمۡ ﴿۳۳﴾﴾

فرمایا: پھر ہم نے زمین کو پھیلایا ہے، اس سے اس کا پانی نکالا، اس کا گھاس اور نباتات نکالیں اور پہاڑ اس میں قائم کیے تاکہ تم اور تمہارے جانور نفع اٹھائیں۔

وقوعِ قیامت کا بیان:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝٣٤ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝٣٥﴾

جب اچانک بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو جائے گا تو اس وقت انسان کو اپنے سارے کرتوت یاد آجائیں گے۔

﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝٣٦﴾

اس دن دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے لائی جائے گی۔

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝٣٧ وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝٣٨ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝٣٩ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝٤٠ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝٤١﴾

جس شخص نے نافرمانی کی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی تو جہنم اس کا ٹھکانا ہو گا اور جو شخص اللہ کے حضور پیش ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت اس کا ٹھکانا ہو گا۔

خواہشِ نفس کو روکنے کے تین درجات:

پہلا درجہ: یہ ہے کہ آدمی اچھے عقائد اختیار کرے اور برے عقائد سے بچے، نیک اعمال کرے اور کبھی کبھی گناہ ہو جائے۔

دوسرا درجہ: یہ ہے کہ عقائد بھی اچھے ہوں، اعمال بھی اچھے ہوں، گناہوں سے بچے اور ساتھ مشتبہات سے بھی بچے۔ مشتبہات کا معنی کہ ایسی چیز جس میں شک ہو کہ شاید یہ گناہ ہے یا شاید نیکی ہے تو اس کو چھوڑ دے۔

تیسرا درجہ: کہ آدمی کے عقائد بھی ٹھیک ہوں، اعمال بھی ٹھیک ہوں،

گناہوں سے بھی بچے، ذکر اللہ بھی کرے، مراقبہ بھی کرے اور اس کثرت کے ساتھ نفس کی اصلاح کرے کہ نفس گناہوں کا نام بھی نہ لے۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿٤٥﴾﴾

یہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ میرے پیغمبر! قیامت کا حتمی علم تو اللہ کو ہے نا! تو اس کو بیان کرنے سے آپ کو کیا فائدہ؟ اس کا حقیقی علم تو ہم نے نہ آپ کو دیا ہے نہ کسی اور کو دیا تو اس کے تذکرے کا کیا فائدہ؟! اس کا حقیقی علم اللہ کو ہے؟ آپ صرف اس کو ڈرائیں جو ڈرنا چاہتا ہے۔

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿٤٦﴾﴾

جب یہ قیامت کے دن اٹھیں گے تو ان کو محسوس ہو گا کہ ایک شام یا ایک صبح ہم دنیا میں رہے تھے، اور اس کو دنیا میں رہ کر سمجھنا بہت آسان ہے۔ جیسے آج دیکھو! کسی آدمی کی عمر پینتیس سال ہے، کسی کی چالیس سال ہے، پچاس سال ہے، آپ میں سے ہر بندہ اپنی عمر دیکھ لے تو یوں لگتا ہے کہ کل آئے تھے۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی اتنی عمر گزار کر یوں لگے گا کہ جیسے کل آئے تھے، اتنی تھوڑی سی زندگی ہے۔

اپنے علم پر عمل کیجیے!

اس لیے ہمیں بھرپور خیال کر کے اپنی آخرت کی فکر اور تیاری کرنی چاہیے۔ یہ بات میں بارہا کہتا ہوں کہ قرآن کریم اس لیے نہیں ہوتا کہ ہم پڑھ رہے ہیں، سیکھ کر ہم درس دیں گے بلکہ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم پڑھ رہے ہیں اور اس پر عمل کریں گے، درس کا موقع ملے نہ ملے.. پڑھانے کا موقع ملے نہ ملے.. اصل تو قرآن کریم پڑھا جاتا ہے عمل کرنے کے لیے۔

ہم سب اپنی کوتاہیاں دیکھ لیں۔ اگر کوتاہی ہے تو اصلاح کریں، اچھی حالت ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ جتنا پڑھیں اس پر عمل کریں اور انسان کو قرآن کا فائدہ تب ہوتا ہے جب انسان قرآن کریم کا مخاطب خود کو سمجھے۔ اگر میں درس دے رہا ہوں کیوں کہ میں نے آپ کو سمجھانا ہے، آپ مطالعہ کریں گے کیوں کہ آپ نے آگے پڑھانا ہے، اپنی اصلاح کے لیے نہ میں مطالعہ کروں نہ آپ مطالعہ کریں تو ہمیں کیا فائدہ ہو گا؟

بس جو پڑھو اس پر عمل کرو! ہم نے پڑھا کہ مسکین اور یتیم پر خرچ کرو، خدا کی راہ میں خرچ کرو تو کسی کو ایک کپ چائے پلا دو، دو روپے گلہ میں ڈال دو تو یہ عمل ہو گیا، اگر ہم نے نہیں کیا تو سوچو ہم نے کیوں نہیں کیا؟ اب دیکھنا! اس محاسبے سے آئندہ عمل کی توفیق کیسے ہوتی ہے۔

اگر ہم تہجد نہیں پڑھتے قرآن کی آیت پڑھی ہے تو اب تہجد شروع کرو کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ اللہ کا ذکر نہیں کرتے قرآن کی آیت پڑھی ہے تو اب ذکر اللہ شروع کر دو! دیکھنا آئندہ رغبت کتنی ہوتی ہے۔ بس میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم پڑھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ! پڑھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ! پڑھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ! پھر دیکھنا اس کا کتنا فائدہ ہوتا ہے؟! قرآن کریم عمل کی کتاب ہے یہ صرف مطالعہ کی کتاب نہیں ہے۔

اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ عَبَسَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾﴾

سورت کا شان نزول:

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مشرکین کے بڑے بڑے رؤساء کو دعوت دے کر توحید کا عقیدہ سمجھا رہے تھے جن میں ابو جہل، عتبہ بن ربیعہ، ابی بن خلف، امیہ بن خلف، شیبہ یہ بڑے بڑے لوگ تھے اور بعض روایات میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی نام ہے جنہوں نے ابھی تک کلمہ پڑھ کر اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

گفتگو کے دوران حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی کوئی آیت سمجھنا چاہی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ نہ دی۔ تو انہوں نے اصرار کیا، بار بار کہا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یوں بار بار کہنا ناگوار گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توجہ ہٹالی اور مشرکینِ مکہ کی طرف متوجہ رہے۔ جب مجلس سے اٹھ کر آپ تشریف لے گئے تو اٹھتے ہی آثارِ وحی نمودار ہوئے اور یہ سورت مبارکہ آپ پر نازل ہوئی۔

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾﴾ ... نا گوار گزرا ان کو اور انہوں نے توجہ نہ دی اس لیے کہ آنے والا ان کے پاس ایک نابینا شخص تھا۔ ﴿وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾﴾ ... اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ اچھی طرح مکمل سنور جاتا یا کسی خاص معاملے میں نصیحت حاصل کرتا ﴿اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾﴾ ... یا یہ نصیحت اس کو نفع دیتی۔

تو یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بات سمجھائی ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ آپ کو عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

عام فہم ترجمہ کی ضرورت و اہمیت:

ایک تو ان الفاظ کے معانی اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہمارے ہاں عموماً تفاسیر میں اس کا ترجمہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ "چیں بجبیں ہوا" اب یہ ترجمہ آج کی اردو کے موافق نہیں ہے، اس لیے ہم معنی اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تو آگے سمجھانا مشکل ہوتا ہے۔ تو "عَبَسَ" کا معنی یہ کریں کہ آپ کو نا گوار گزرا۔

﴿وَ تَوَلّٰۤی﴾ .. اور آپ نے توجہ نہ دی۔ ایک تعبیر یہ ہے کہ "اعراض کیا" اور ایک ہے "توجہ نہ دی" دونوں میں فرق ہے۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے الفاظ استعمال کریں جو آپ کی شان کے موافق ہوں اور محاورہ اس مفہوم کا ساتھ دیتا ہو۔

طالبِ دین کو مقدم رکھیں!

﴿اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾﴾

وہ شخص جو دین کے معاملے میں لاپرواہی سے کام لیتا ہے آپ اس کی بہت فکر کرتے ہیں حالانکہ آپ کے ذمہ نہیں ہے کہ آپ اس کو سنواریں۔

﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ۝۸ وَھُوَ یَخْشٰی ۝۹ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۝۱۰﴾
ہاں البتہ جو شخص آپ کے پاس طالب بن کر آتا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے آپ اس پر مکمل توجہ نہیں دیتے۔

اب "یَسْعٰی" کا معنی ہمیشہ "دوڑنا" نہیں ہوتا کہ آپ یہ ترجمہ کریں کہ "آپ کے پاس آتا ہے دوڑتا ہوا" عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تو دوڑتے ہوئے نہیں آئے تھے۔ اصل میں یہاں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ جو بہت توجہ دیتا ہے، طالب بن کر آتا ہے اور ڈرتا بھی ہے تو آپ اس کی فکر کم کرتے ہیں۔

﴿كَلَّآ﴾ آئندہ ایسے نہ کیجیے، ﴿اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲﴾ یہ قرآن کریم نصیحت ہے لیکن اس شخص کے لیے جو اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہے۔

اب دیکھیں! ترجمہ سے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کتنا فصیح و بلیغ ہے۔ اس لیے میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہوئے محاورات کا بہت خیال رکھا کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد:

یہاں یہ بات سمجھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اجتہاد فرمایا تھا۔ آپ کا اجتہاد یہ تھا کہ کفر ایک بہت بڑا جرم اور بیماری ہے اور اگر صحابی نے کوئی مسئلہ دریافت کرنا تھا تو یہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ پہلے بڑے جرم کا علاج کرنا چاہیے، کفر سے بندے کو بچانا چاہیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر کی اشدیت کا خیال کرتے ہوئے کفار پر توجہ دی ہے اور صحابی پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا اور اس اجتہاد میں خطا کیا ہوئی؟ یہ قرآن کریم کے لفظ بتا رہے ہیں:

﴿وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰٓ ۝٣ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰٓ ۝٤﴾

آنے والا شخص ایسا تھا کہ یا تو تزکیہ کر کے کامل سنور جاتا یا آنے والا شخص ایسا تھا کہ کسی خاص معاملے میں نصیحت حاصل کر لیتا، تو ﴿أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ۝٥ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝٦﴾ جو بے پرواہی کرتے ہوں ان کی آپ کو فکر ہے تو صحابی کا طالب بن کر مسئلہ پوچھنا اس بات کی دلیل تھی کہ اس کو یقیناً فائدہ ہوتا اور جو بات سننا نہیں چاہتے تھے آپ ان کو سناتے ہیں، تو وہاں یقین نہیں تھا، ہو سکتا ہے کہ فائدہ ہو، درجۂ ظن ہے، موہوم چیز ہے۔ تو خطا کیا ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر متیقن کو چھوڑ دیا امرِ موہوم کی وجہ سے، یہ خطا ہوئی۔ اللہ رب العزت نے اس اجتہاد پر تنبیہ فرما دی کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں، اجتہاد تو پیغمبر کا ہو اس میں بھی خطا ہو جاتی ہے، فرق یہ ہے کہ غیر نبی کے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ بسا اوقات اس پر قائم رہتا ہے چونکہ اس پر وحی نہیں آتی اور نبی کے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو نبی اس پر قائم نہیں رہتے چونکہ بعد میں وحی آ جاتی ہے۔ تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا اور اجتہاد میں خطا تھی۔ اللہ رب العزت کی طرف سے وحی آ گئی کہ آپ کا یہ اجتہاد ٹھیک نہیں تھا، لہذا آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

"يَزَّكَّىٰ" اور "يَذَّكَّرُ" دونوں میں فرق یہ ہے کہ تزکیہ یہ کامل اور آخری درجہ ہے یعنی نفعِ اکمل اور "يَذَّكَّرُ" یہ ابتدائی درجہ ہے کہ جب آدمی شروع میں آتا ہے تو قرآن کریم پڑھتا ہے، ذکر کرتا ہے، نصیحت حاصل کرتا ہے، گناہوں کو چھوڑتا ہے اور "يَزَّكَّىٰ" یہ کامل درجہ ہوتا ہے۔ تو دونوں درجے قرآن کریم نے بیان کیے ہیں بڑے اہتمام کے ساتھ۔

اپنوں کا خیال پہلے رکھیں:

یہاں جو بات میں سنانا چاہتا ہوں تو اس کے لیے میں معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب کی ساتھ لایا ہوں تا کہ حضرت کے لفظ نقل کروں اور اس سے آپ کو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ جو کام ہم نے دنیا میں شروع کیا ہے یہ کس حد تک ٹھیک ہے؟ میں نے آپ سے کئی بار کہا کہ میں کئی باتوں کو اصولِ شریعت کی روشنی میں لے کر چلتا ہوں اور میرے سامنے اس کی کوئی تحریر نہیں ہوتی اور جب ہمارے اس طرز اور اسلوب پر اکابر کی کوئی تحریر ملتی ہے تو پھر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس آیت کے تحت یہ لکھا ہے، میں لفظ پڑھ کے سناتا ہوں:

اس موقع میں یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک وقت آ گئے؛ ایک مسلمان کو تعلیم اور اس کی تکمیل اور دلجوئی، دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے ان کی طرف توجہ۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے، دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔[73]

ہم پوری دنیا میں یہی کام کر رہے ہیں اور ہمارے اوپر یہی الزام ہوتا ہے کہ تمہیں کفر کی فکر نہیں ہے، تمہیں مسلمانوں کی فکر پڑی ہوئی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ بات کرو ختمِ نبوت پر کہ قادیانی کافر ہیں، اس پر کہ فلاں کافر ہے اور آپ لوگ کام کرتے ہو فقہ پر، حنفیت پر، اکابر پر، علماء پر... داخلی مسائل کو آپ نے اپنے

73۔ معارف القرآن: ج 8 ص 674

کام کی محنت کا میدان بنایا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی! ہم کسی پر بھی تنقید نہیں کرتے ان موضوعات پر جو کام کرتے ہیں وہ ہم سے بڑے ہیں، ہم ان کو اپنے آپ سے بڑا سمجھتے ہیں لیکن جو کام ہم کرتے ہیں، اکابر کی تحریرات پڑھو وہ کیا کہتے ہیں کہ مقدم کون لوگ ہیں؟ تبلیغی جماعت پوری دنیا میں کام کرتی ہے اور تبلیغ کے اصولوں میں سے ہے کہ کسی کافر کو اسلام کی دعوت نہیں دینی، آپ کو دیکھ کر کلمہ پڑھے اور مسلمان ہو جائے تو الگ بات ہے، دعوت آپ نے اپنوں کو دینی ہے، اپنے ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر کافر بھی مسلمان ہو جائیں گے، فرق کیا ہے کہ تبلیغ کی دعوت کا اصول تھوڑا سا مختلف ہے اور ہمارا تھوڑا سا مختلف ہے اور کوئی وجہ نہیں! اور اس پر لوگوں کو اشکالات پیدا ہوتے ہیں لیکن جب آپ غور کریں گے تو یہ دونوں کام مختلف بھی نہیں ہیں، وہ فضائل کے ذریعے اعمال پھیلاتے ہیں اور ہم دلائل کے ذریعے اعمال کو پختہ کرتے ہیں، اب اس میں اشکال والی کون سی بات ہے؟

اس سے اگلی بات سمجھیں، حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں:

”اس میں ان علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کے شبہات کے ازالے اور ان کو اسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جس سے عام مسلمانوں کے دلوں میں شکوک شبہات یا شکایات پیدا ہو جاتی ہیں، ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت اور اصلاحِ حال کو مقدم رکھنا چاہیے، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا:

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو
دَیر والے کج ادا کہہ دیں، یہ بدنامی بھلی[74]

74۔ معارف القرآن: ج 8 ص 674

غیر کہہ دیں کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں یہ بدنامی لے لو، اس کی پروانہ کرو اور ہم اس سے پریشان ہوتے ہیں کہ غیر ہمیں اچھا نہیں سمجھتا، غیر ہمیں کیا کہے گا! چھوڑو غیر کو اپنوں کی فکر کرو!

اب مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ.. مفتی دار العلوم دیوبند.. حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے دستِ راست کتنی کھل کے بات فرمارہے ہیں کہ "اس میں ان علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے..." اور یہی رونا میں روتا ہوں آپ کفار کو دین کی طرف لاتے ہوئے ایسے کام نہ کرو کہ مسلمانوں کے لیے آئندہ مصیبت پیدا ہو جائے، مسلمان پھر یہ کہیں گے کہ یہ کام ٹھیک تھا، اگر ٹھیک نہ ہوتا تو فلاں حضرت کیوں کرتے! اس لیے یہ مسائل پیدا نہ کرو!

اپنے کام پر شرح صدر:

یہ میں نے اس لیے دو دلیلیں پڑھی ہیں تاکہ آپ کو اپنے کام پر شرح صدر ہو جائے۔ مجھے تو الحمد للہ شرح صدر ہے لیکن بسا اوقات عام بندے کا مزاج ہوتا ہے کہ یہ کس نے لکھا ہے؟ میں نے کہا: جو ہم کام کرتے ہیں آئندہ یہ الجھن نہیں ہوگی کہ یہ کس نے لکھا ہے؟! لوگ خود بتائیں گے کہ جی فلاں نے لکھا ہے! اس کی ہرگز پروانہ کریں کہ آپ کے ساتھ دو ہیں یا دس ہیں، مسلسل کام کریں، اعتدال کے ساتھ کام کریں، اللہ رب العزت آئندہ نسلوں میں اس آواز کو عام فرمادیں گے۔

رہِ اعتدال پر گامزن رہیں!

میں بارہا کہہ رہا ہوں کہ دیکھو! ہم توڑ نہیں رہے اور اس موقع پر پھر اعتدال کا پہلو ذہن میں رکھیں! ہمارے ہاں الجھنیں یہ ہیں کہ بعض فتنے ہیں چھوٹے یا بڑے، ہمارے اکابر ان فتنوں کو کسی کام کے لیے ساتھ ملا لیتے ہیں تو دوسرے لوگ جو چھوٹے ہیں ان میں دو طبقے بن جاتے ہیں؛ ایک طبقہ کہتا ہے کہ یہ فتنے ٹھیک ہیں، کیوں کہ اگر یہ

غلط ہوتے تو ہمارے اکابر ان کو ساتھ کیوں ملاتے؟! دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ اکابر غلط ہیں کیوں کہ انہوں نے فتنوں کو ساتھ ملا کر مضبوط کیا ہے۔

کوئی فتنوں کو ٹھیک کہہ دیتا ہے اور کوئی اکابر کو غلط کہہ دیتا ہے اور آپ دیکھیں کہ ہم کتنے راہِ اعتدال پر ہیں کہ فتنوں کو فتنہ سمجھتے ہیں اور بڑوں کو بڑا سمجھتے ہیں، اپنوں کو اپنا سمجھتے ہیں اور غیر کو غیر سمجھتے ہیں۔ پھر لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ آپ پھر ان کو ساتھ کیوں نہیں ملاتے؟ میں نے کہا کہ بھائی! ہم چھوٹے ہیں، ان فتنوں سے کام نہیں لے سکتے، ہمارے بڑے وہ بڑے ہیں ان فتنوں سے کام لے سکتے ہیں۔

اس کی مثال ایسے سمجھو کہ جیسے مدرسہ کے مہتمم صاحب کسی طالب علم کو بھیجیں کہ فلاں بھنگی عیسائی کو بلا کر لاؤ، میں ذرا سبق پڑھا رہا ہوں، اس کو دفتر میں بٹھا کر چائے پلاؤ! اب باقی طلبہ کو الجھن ہوتی ہے کہ استاذ جی عیسائی کی کتنی قدر کرتے ہیں، ہمیں آج تک چائے کا کپ نہیں پلایا لیکن بھنگی کو دفتر میں بٹھا کر چائے پلا رہے ہیں! جب تھوڑی دیر میں استاد سبق سے فارغ ہوتے ہیں تو بھنگی سے کہتے ہیں کہ یہاں طلبہ بہت ہیں، ہمارا نکاسی کا نظام ذرا کمزور ہے، ذرا گٹر صاف کر دو! پھر طالب علموں کو بات سمجھ آتی ہے کہ اس کو چائے کیوں پلائی ہے۔

مہتمم صاحب آپ کو چائے پلاتے اور کہتے کہ گٹر کو صاف کر دو! تو آپ نے کہنا تھا کہ کسی بھنگی کو بلا لیں۔ اب بھنگی کو بلائیں اور پہلے چائے پلائیں ابھی گٹر صاف کرنے کا کہا نہیں تو آپ کو اشکالات شروع ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم بھنگی کو بھنگی سمجھتے ہیں اور مہتمم صاحب کو مہتمم صاحب سمجھتے ہیں، اس بھنگی کو چائے پلانے کی وجہ سے مہتمم صاحب کو بھنگی کے ساتھ نہیں ملاتے اور چائے پینے کی وجہ سے ہم بھنگی کو مہتمم صاحب کے ساتھ نہیں ملاتے۔ بھنگی؛ بھنگی رہے گا اور مہتمم صاحب؛ مہتمم صاحب رہیں گے۔

اسی طرح ہمارے بڑے حضرات اگر کسی بڑے کام کے لیے کسی فتنے کو ساتھ ملائیں گے تو نہ ہم فتنوں کو صحیح کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اکابر کو فتنہ کہہ سکتے ہیں، میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم بتاؤ اس سے زیادہ اعتدال کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے اور پھر بھی بدنام ہم ہوتے ہیں کہ مولانا گھمن صاحب بہت سخت ہیں! عجیب بات ہے۔

بتاؤ اس سے زیادہ اعتدال کیا ہو سکتا ہے! میں اس لیے کہتا ہوں کہ جو ہمارے قریب نہیں بلکہ دور ہیں ان کو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہمارے ساتھ رہتے ہیں تو یہ شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

موت؛ مؤمن کا تحفہ

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾﴾

پھر انسان کو موت دی اور اسے قبر میں پہنچا دیا۔

یہاں پر اللہ رب العزت نے موت کو مقامِ نعمت میں بیان کیا ہے کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ حدیث پاک میں ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ؛ اَلْمَوْتُ.[75]

کہ مؤمن کا تحفہ موت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ایک جنازہ گزرا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ" یہ مستریح ہے یا مستراح منہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! مستریح یا مستراح منہ کا

75۔ المستدرک علی الصحیحین: ج5 ص455 رقم الحدیث 7970

کیا معنی ہے؟ فرمایا کہ یہ مرنے والا یا تو لوگوں کے شر سے بچ گیا ہے یا لوگ اس کے شر سے بچ گئے ہیں۔ [76]

موت مؤمن کے لیے تحفہ ہے۔ مؤمن جیسا بھی ہو وقتی طور پر طبعی تقاضے کی وجہ سے موت سے گھبراتا ہے لیکن درحقیقت ہر مؤمن موت سے پیار کرتا ہے کیوں کہ دنیا میں محبوب ترین چیز مؤمن کی اللہ ہے اور اللہ ملے گا موت کے بعد، دنیا میں ملتا ہے لیکن پتا نہیں چلتا اور وہاں ملے گا ایسے کہ محسوس بھی ہو گا۔

اس لیے حیان بن اسود کہتے ہیں:

اَلْمَوْتُ جِسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ إِلَى الْحَبِيْبِ. [77]

موت وہ پل ہے جو یار کو یار سے ملاتا ہے۔

کون شخص ہے جو موت سے پیار نہ کرتا ہو، موت سے ہر مؤمن پیار کرتا ہے۔ موت سے ڈریں بھی مت اور مانگیں بھی مت، موت کی تیاری کریں۔ بس اللہ برکت والی عمر عطا فرمائے، تھوڑی عمر میں اللہ زیادہ کام لے لے۔ آمین

اللہ نے موت کو مقامِ نعمت میں بیان کیا ہے۔ یہ موت ایسی چیز ہے جو انسان کی تمام مصیبتوں سے جان چھڑا دیتی ہے، انسان راحت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

﴿فَاَقْبَرَهٗ﴾ ... قبر کو بھی اللہ نے مقامِ نعمت کے طور پر بیان کیا ہے کہ ہم تمہیں قبر دیتے ہیں۔

ایک بندہ فوت ہوتا ہے۔ اس کو غسل دو، خوشبو لگاؤ، پھر اس کو سفید رنگ کا کفن دو، پھر اکٹھے ہو کر نمازِ جنازہ کی صورت میں اس کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگو،

76۔ شعب الایمان للبیہقی: ج7 ص8 رقم الحدیث 9264

77۔ التذکرۃ للقرطبی: ص13 باب النہی عن تمنی الموت

پھر عزت واحترام کے ساتھ اس کو قبر میں دفن کرو۔ موت کے بعد بھی اللہ نے انسان کو کتنی شرافت اور کتنی عزت دی ہے۔ قبر بھی مقامِ نعمت پر ہے اور موت بھی مقام نعمت پر ہے۔

ثواب وعذاب قبر برحق ہے:

ہم اھل السنۃ والجماعۃ قبر کے ثواب اور عذاب کے قائل ہیں۔ ثواب کا معنی کہ جو نیک اعمال کیے تھے ان کا اچھابدلہ ملے اور عذاب کا معنی کہ جو برے کام کیے تھے ان کا برابدلہ ملے، اور ہم قائل ہیں کہ قبر میں ثواب یاعذاب اَصالتاً بلاواسطہ براہِ راست روح کو ہوتا ہے، طبعاً وضمناً بالواسطہ جسم کو ہوتا ہے، موت کے بعد احوال براہ راست روح پر آتے ہیں، روح کے واسطہ سے جسم پر آتے ہیں جیسے دنیامیں احوال براہِ راست جسم پر اور جسم کے واسطہ سے روح پر آتے ہیں۔

قبر کے متعلق بعض اشکالات کے جوابات:

اور یہ جو لوگ اس پر اشکال کرتے ہیں کہ جسم تو ہوتا نہیں ہے تو احوال آتے کیسے ہیں؟ جانور نے جسم کو کھالیا اور پاخانے کے راستہ سے باہر نکال دیا، اب کس کو عذاب وثواب ہو گا؟ کسی میت کو جلایا اور راکھ کو ہوا میں اڑایا، پانی میں بہایا تو عذاب وثواب کس کو ہو گا؟ اگر کوئی شخص پانی میں گر گیا اور مر گیا اس کے جسم کے اعضا پانی میں تحلیل ہو گئے تو اب ثواب وعذاب کس کو ہو گا؟

لوگوں نے یہ سارے شبہات پیدا کیے یہ بتانے کے لیے کہ جسم کو قبر میں ثواب اور عذاب نہیں ہوتا اور قبر یہ نہیں ہے جو زمین والی ہے، قبر وہ ہے جو علیین یا سجین ہے کیوں کہ اس کو تو قبر ملی نہیں ہے، دفن ہوا نہیں تو پھر اس کو ثواب وعذاب کیسے ہو گا؟

جواب یہ ہے کہ ہمارا مخالف قبر کا معنی نہیں سمجھتا اس لیے اشکال کرتا ہے

اور ہمیں قبر کا معنی نہیں آتا تو ہم جواب نہیں دے سکتے، وہ بھی سمجھ جاتا اور ہم بھی سمجھ جاتے تو کم از کم دیانت والی لڑائی ختم ہو جاتی اور ضد والی لڑائی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ قبر کی تعریف سمجھیں کہ میت اور میت کے اجزاء کے مَقَر کا نام قبر ہے، تو دنیا میں کون سا ایسا شخص ہے کہ جس کو قبر نصیب نہیں ہوتی؟

اگر اس کو جانور نے کھایا اور پھر پاخانے کے راستے سے باہر نکال دیا گیا تو اس کے اجزاء کسی جگہ تو ہوں گے، وہی اس کی قبر ہے۔ اگر جلایا اور اس کی راکھ کو ہوا میں بکھیر دیا یا پانی میں بہا دیا تو وہ ذرے پانی کے ساتھ مل کر کہیں تو جائیں گے نا؟ جہاں جائیں گے وہی قبر ہے۔ ایک آدمی پانی میں گر کر مر گیا، اجزاء پانی میں تحلیل ہو گئے تو تحلیل ہو کر کہیں تو گئے ہیں نا؟ جہاں جائیں گے وہی قبر ہے۔

اب میت صحیح سالم ہو اس کے ساتھ روح کا تعلق قائم اللہ نے کرنا ہے اور اگر میت ایک جگہ سالم نہ ہو بلکہ منتشر ہو تو اس کے ساتھ بھی روح کا تعلق قائم اللہ نے کرنا ہے، تو اللہ کی قدرت پر تمہیں کیا اشکال ہے؟ یہ صرف ان لوگوں کی ڈھکوسلہ بازی ہے وگرنہ وہ شخص جو قبر میں ہے تین دن کے بعد اس کی لاش پھٹتی ہے اور چند دن کے بعد سارا جسم مٹی میں ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو پھر یہ تین سوال کرنے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ پھر تو سب ایک جیسے ہیں، پھر ثواب و عذاب کس کو ہو گا؟

اس لیے ہم نے کہا کہ روح کو ہو گا لیکن روح اور جسم کا تعلق کتنا ہونا چاہیے قَدْرَ مَا يَتَلَذَّذُ وَيَتَأَلَّمُ.. اتنا تعلق کافی ہے کہ جس سے جسم ثواب اور عذاب کو محسوس کرے، اتنا تعلق نہیں ہے کہ جیسے دنیا میں ہے کہ دوڑتا پھرے۔

برزخ کی تعریف اور اعتراضات کے جوابات:

اسی قبر کو برزخ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ برزخ میں ثواب اور عذاب ہوتا ہے۔ تو لوگ کہتے ہیں کہ برزخ تو اور جہان ہے یہ جہان ہی نہیں ہے تو فرعون تو اس دنیا میں

ہے، وہ پھر برزخ میں کیسے ہوا؟ پھر اس کو تو برزخ کا عذاب نہیں ہو رہا۔ میں یہاں پر بھی وہی بات کہتا ہوں کہ معترض کو برزخ کا معنی نہیں آیا تو وہ اعتراض کرتا ہے اور ہمیں برزخ کا معنی نہیں آیا تو جواب نہیں دے سکتے۔

برزخ کسے کہتے ہیں؟ سجین ایک مقام ہے جو سات زمینوں سے نیچے ہے، علیین ایک مکان ہے جو آسمان سے اوپر ہے، سجین سے لے کر علیین تک سارے مکان اور موت سے لے کر حشر تک یہ سارا زمانہ.. جب یہ جمع ہو جاتے ہیں تو اس کو برزخ کہتے ہیں۔ تو برزخ؛ ظرفِ زمان اور ظرفِ مکان دونوں کے مجموعے کا نام ہے، سجین سے علیین تک ظرفِ مکان اور موت سے لے کر حشر تک ظرفِ زمان جب جمع ہوتے ہیں تو پھر برزخ بنتا ہے۔ کبھی اعتراض کرتے ہیں: جی فرعون بھی اسی زمین پر ہے اور ہم بھی اسی زمین پر ہیں، فرعون برزخ میں ہے ہم برزخ میں کیوں نہیں ہیں؟ اسی طرح اگر کسی شخص کو قبر میں دفن نہ کریں بلکہ زمین کے اوپر رکھ دیں تو وہ تو برزخ میں ہو گا اور ہم برزخ میں کیوں نہیں ہیں؟

میں نے کہا ہم زمین پر رہتے ہیں، سجین سے علیین تک ہمیں مکان ملا ہے لیکن صرف مکان کا نام برزخ نہیں ہے بلکہ موت سے لے کر حشر تک جب زمان بھی ملے گا تو پھر برزخ بن جائے گا۔ فرعون کو دونوں چیزیں ملی ہیں، ظرفِ زمان بھی اور ظرفِ مکان بھی اور ہمیں ظرفِ مکان تو ملا ہے لیکن ظرفِ زمان نہیں ملا، اسی وجہ ہم برزخ میں نہیں ہیں، وہ برزخ میں ہے۔

اب دیکھو! برزخ کو سمجھنا کتنا آسان ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بہت مشکل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مشکل ہو گا آپ کے لیے اللہ نے ہم پر آسان کیا ہے، تم نہیں سمجھا سکتے تو پھر ہماری درس گاہ کا رخ کرو اور ہماری اردو بھی اتنی عجیب ہے کہ مجھے دور دور سے لوگوں کے میسیج آتے ہیں کہ مولانا صاحب! آپ کی اردو اتنی عجیب ہے کہ

مشکل سے مشکل عقیدہ بھی خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہ اللہ کا نظام ہے۔ جب بھی کسی چیز کا فقدان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ افراد پیدا فرما دیتے ہیں، اس فرد سے کام لیتے ہیں، جب کام پورا ہو جائے تو اس فرد نے دنیا سے جانا ہوتا ہے اور وہ چلا جاتا ہے، حجت تام ہو جاتی ہے۔ اب لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات ہمیں کسی نے سمجھائی نہیں۔

کامیابی کا راز؛ محنت اور تقویٰ

اور اب اگلی بات سمجھنا! یہ برزخ اور مابعد الموت کے مسائل، علوم سے نہیں آتے، یہ اس وقت آتے ہیں جب آدمی صاحبِ حال ہو، صرف صاحبِ قال ہو تو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جو قول سے سمجھ آتی ہیں اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو قول سے نہیں بلکہ ذوق اور وجدان سے سمجھ میں آتی ہیں اور یہ وجدان اور ذوق کی نعمت اللہ دیتے ہیں تقویٰ کی برکت سے اور محنت کی برکت سے۔ صرف تقویٰ ہو تو بھی وجدان ٹھیک نہیں ہوتا اور صرف محنت ہو تب بھی ٹھیک نہیں ہوتا، محنت اور تقویٰ دو چیزیں مل جائیں تو اللہ پاک ذوق عطا فرماتے ہیں، پھر اللہ اس چیز کو بندے کا حال بنا دیتے ہیں اور جب کسی پر حال طاری ہو جائے تو اس کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے اور ایسا حال ہوتا ہے کہ بسا اوقات بندہ اس حال میں مغلوب ہو جاتا ہے۔ مجھ سے ایک ساتھی نے پوچھا کہ ہم جو مشائخ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے مغلوب الحال ہو کر بات کی ہے اس لیے ان کی بات کا اعتبار نہیں ہے تو کیا نبی بھی مغلوب الحال ہوتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں کبھی نبی بھی مغلوب الحال ہوتا ہے کبھی ایسا حال ہوتا ہے کہ پیغمبر کی ظاہری بات بظاہر شریعت کے خلاف نظر آ رہی ہوتی ہے حالانکہ وہ بات ٹھیک ہوتی ہے۔ دیکھو! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر میں گئے، تین سو تیرہ صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ

أَبَدًا.[78]

اے اللہ! اگر یہ تین سو تیرہ شہید ہو گئے تو قیامت تک آپ کی عبادت کوئی نہیں کرے گا۔

ایسے ہو سکتا ہے؟ اللہ کی عبادت تین سو تیرہ پر موقوف ہے؟ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مغلوب الحال ہو کر فرما رہے ہیں کہ اللہ! میں پوری جمع پونجی لے کر آ گیا ہوں، میں آخری نبی ہوں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اعتبار سے بات فرما رہے ہیں۔ اس لیے اگر مشائخ سے کوئی بات مغلوب الحال ہو کر نکل جائے تو الجھن کا شکار کبھی نہ ہوا کرو، مشائخ کو چھوڑو مت! ہاں جو بات سمجھ نہیں آتی تو اسے سمجھو، ایک نہیں سمجھا سکتا تو دوسرے سے سمجھو۔

کبھی لوگ فون کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ فون نہیں سفر کرو، جی! بہت دور ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر نہ سمجھو، عبارات کو اتنا سمجھنے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ اور اگر ضرورت ہے تو آ جاؤ! ہم تمہیں سمجھاتے ہیں لیکن تھوڑا سا وقت نکالو۔

اللہ ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

78۔ مصنف ابن ابی شیبۃ: ج20 ص315 رقم الحدیث 38839

سورۃ التکویر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝۱ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝۲ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۝۳﴾

نفخہ اولیٰ کے بعد کے احوال:

قیامت میں ایک نفخہ اولیٰ ہو گا اور ایک نفخہ ثانیہ ہو گا۔ نفخہ اولیٰ کا معنی کہ صور پہلی بار پھونکا جائے گا اور نفخہ ثانیہ کہ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ قیامت کے بعض احوال وہ ہیں کہ جن کا تعلق نفخہ اولیٰ کے ساتھ ہے اور بعض وہ ہیں کہ جن کا تعلق نفخہ ثانیہ کے ساتھ ہے۔ اب یہ جو پہلے چھ احوال ہیں یہ نفخہ اولیٰ کے حوالے سے ہیں۔

﴿اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝۱﴾

اس کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ جب سورج بے نور ہو جائے گا۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ جب سورج کو توڑ دیا جائے گا۔ ''تکویر'' کے دونوں معانی ٹھیک ہیں اور دونوں کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ دونوں میں تطبیق بھی ممکن ہے کہ پہلے سورج کی روشنی ختم کر دی جائے گی، پھر اس کو سمندر میں گرا دیا جائے گا کیونکہ روایات میں ہے کہ شمس و قمر کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا، پھر وہاں تیز آندھی چلے گی جس سے پورا

سمندر بھڑک اٹھے گا اور اس سے ایک طوفان برپا ہو گا۔

﴿وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲﴾

اور جب ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔

﴿وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳﴾

جب پہاڑوں کو چلا دیا جائے گا۔ پہاڑ اڑیں گے روئی کی طرح۔

﴿وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴﴾

اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنی آزاد پھرے گی، کوئی بھی اس کو پکڑنے والا نہیں ہو گا۔ عربوں کے ہاں دس ماہ کی گابھن اونٹنی بہت قیمتی شمار ہوتی ہے۔ تو جب نفخہ اولیٰ ہو گا تو یہ آزاد پھرے گی، کوئی بھی اس کا خیال کرنے والا نہیں ہو گا۔

﴿وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵﴾

اور جب جنگلی اور وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔ عام طور پر سارے جانور اکٹھے نہیں ہوتے، ہاتھیوں کے ریوڑ الگ ہوتے ہیں، گیدڑ الگ ہوتے ہیں، شیر الگ رہتے ہیں لیکن نفخہ اولیٰ کا منظر ایسے ہو گا کہ سارے مکس ہوں گے، اکٹھے پھریں گے۔

﴿وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶﴾

اور جب دریاؤں کو بھڑکا دیا جائے گا۔

نفخہ ثانیہ کے بعد کے احوال:

﴿وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷﴾

یہاں سے آگے چھ احوال وہ ہیں جن کا تعلق نفخہ ثانیہ کے ساتھ ہو گا۔ فرمایا:
جب ہر قسم کے لوگوں کے جوڑے بنا دیے جائیں گے، کافروں کا جوڑا الگ ہو گا مسلمانوں کا الگ ہو گا، گروہ اور ٹولیاں بنیں گی، پھر صلحا الگ ہوں گے، فساق الگ ہوں

گے، پھر فساق میں بھی خاص گناہ کرنے والے الگ ہوں گے، زانی الگ ہوں گے، چور الگ ہوں گے، ڈکیت الگ ہوں گے۔

یعنی جرائم کرنے والے تو ہوں گے لیکن بعض لوگ خاص گناہ کرتے ہیں جیسے ڈکیتی کرتے ہیں، پھر شراب بھی پیتے ہیں، پھر زنا بھی کرتے ہیں اور عیاشی بھی کرتے ہیں۔ اب یہ شراب اور زنا گناہ ہیں لیکن اصل اس کا جرم کون سا ہے؟ ڈکیتیاں کرنا، اور جب ڈکیتی چھوڑ دیں تو زنا شراب بھی ختم ہو جائے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ڈکیت ہے حالانکہ جرم اور بھی ہوتے ہیں، پھر جو اس طرح خاص جرم کرنے والے ہوں گے وہ لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ اسی طرح صلحاء ہیں، عالم نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں لیکن یہ کون ہیں؛ علماء۔ اب یہ علماء اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ مطلب ہے اس کا۔

زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے سوال:

﴿وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸﴾

اور جس بچی کو زندہ درگور کرتے تھے اس سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔

﴿بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹﴾

کہ کس جرم کی وجہ سے اس کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ پوچھا کس سے جائے گا؟ خود اس بچی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کیوں قتل کیا تھا؟ یہ اس لیے کہ اس بچی کی طرف سے قیامت کے دن دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں ہو گا تو اللہ اسی سے پوچھیں گے کہ تو بتا تجھے کیوں قتل کیا گیا تھا؟ کوئی اور تو اس کا مقدمہ لڑنے والا نہیں ہو گا، تو وہ بتائے گی کہ اللہ! میرا کوئی جرم نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں لڑکی تھی اور یا اس بچی کے بارے میں ان درندوں سے پوچھیں گے جو زندہ درگور کرتے تھے کہ تم نے یہ جرم کیوں کیا تھا؟

قیامت کے دن ہر جرم کے بارے میں پوچھا جائے گا لیکن بطورِ خاص اس بچی کا ذکر اس لیے کیا کہ اس کی طرف سے قیامت کے دن کوئی دعوے دار نہیں ہوگا تو اللہ اس کے خود دعوے دار بن کر پوچھیں گے۔

﴿وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾﴾

عمال نامے پھیلا دیے جائیں گے، ہر آدمی اپنے اعمال نامے کو دیکھے گا۔

﴿وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾﴾

آسمان کھول دیے جائیں گے۔ کھول دینے کا معنی یہ ہے کہ نیچے سے دیکھیں گے تو آسمان کے اوپر کی جو چیزیں ہیں وہ بھی نظر آئیں گی۔

﴿وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾﴾

اور جب جہنم کو مزید بھڑکا دیا جائے گا۔

﴿وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾﴾

اور جنت کو متقین کے قریب کر دیا جائے گا۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾﴾

جس شخص نے جو اعمال کیے ہیں آج اس کے سامنے ہوں گے، وہ اپنے اعمال کو جان لے گا۔ یہاں تک کے چھ احوال نفخہ ثانیہ کے بعد ہوں گے۔

پانچ ستاروں کی قسمیں:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾﴾

اللہ رب العزت نفخہ اولیٰ اور نفخہ ثانیہ کو بیان کرنے کے بعد اب قسمیں کھا کر یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ قیامت نے بھی آنا ہے اور قرآن بھی سچا ہے، میرا پیغمبر بھی سچا ہے، لہٰذا تم اس کو مان لو۔ فرمایا: قسم ہے ان ستاروں کی جو چھپ جاتے ہیں۔ میں پہلے

بھی عرض کر چکا ہوں کہ ”اُقْسِمُ“ پر ”لَا“ داخل کیا جاتا ہے مخاطب کے نظریے کی تردید کرنے کے لیے کہ جو تمہارا خیال ہے کہ قرآن ٹھیک نہیں ہے، تمہارا جو خیال ہے کہ پیغمبر - معاذ اللہ - مجنون ہے ایسی بات نہیں ہے، ”اُقْسِمُ“ میں قسم کھا کر یہ بات کہہ رہا ہوں: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍۙ۝۱۹﴾

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِۙ۝۱۵ الْجَوَارِ الْكُنَّسِۙ۝۱۶﴾

ستاروں میں سے پانچ ستارے ایسے ہیں جو پہلے آگے چلتے ہیں، پھر الٹے ہوتے ہیں اور پھر وہ عالمِ ملکوت میں جا کر چھپ جاتے ہیں، ورنہ عام طور پر ستارے آگے جا کر پیچھے نہیں ہوتے یا کھڑے رہتے ہیں یا وہ اپنے مدار میں چلتے رہتے ہیں۔ وہ پانچ ستارے زحل، مشتری، عطارد، مریخ اور زہرا ہیں اور ان پانچوں کو فلسفہ میں ”نجوم متحیرہ“ کہتے ہیں۔ یہ حیران کن قسم کے ستارے ہیں۔ اللہ نے ان کی قسم کھائی ہے کہ قسم ہے ان ستاروں کی جو چھپ جاتے ہیں اور جب آگے ہو کر پیچھے ہوتے ہیں تو پھر چلتے رہتے ہیں۔ ”الْخُنَّسِ“ کا معنیٰ پیچھے ہٹ جانے والے، ”الْجَوَارِ“ کا معنیٰ سیدھے چلنے والے اور ”الْكُنَّسِ“ کا معنیٰ چھپ جانے والے۔

﴿وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَۙ۝۱۷﴾

قسم ہے رات کی جب وہ چلی جاتی ہے۔

﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَۙ۝۱۸﴾

اور قسم ہے صبح کی جب وہ آجاتی ہے۔

جبرئیل امین کی صفات:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍۙ۝۱۹ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍۙ۝۲۰﴾

یہ جوابِ قسم ہے۔ یعنی یہ جو قرآن کریم ہے یہ اللہ کا کلام ہے، اس کو لانے

والا کریم ہے، عزت والا ہے، طاقت والا ہے۔ طاقت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ اس کے چھ سو پر ہیں۔ یہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہیں۔ اور عرش کے مالک؛ اللہ کے ہاں ان کا بڑا مرتبہ ہے۔

بطور خاص عرش کی بات کیوں کی ہے۔ آپ "القواعد فی العقائد" میں ایک سوال جواب پڑھ چکے ہیں، سوال یہ تھا کہ اللہ رب العزت ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں کہ اللہ اپنے عرش پر مستوی ہوئے۔ وہاں ہم نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم استواء علی العرش کا معنی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش کے مالک ہیں، اللہ تعالیٰ کی عرش پر حکومت ہے۔ ہم اس کا معنی یہ کرتے ہیں۔ مخلوقات میں سب سے بڑی مخلوق عرش ہے، اس لیے اللہ رب العزت عرش کا بطورِ خاص ذکر فرماتے ہیں۔ یہاں ﴿ذِی الْعَرْشِ﴾ فرمایا کہ اللہ تو وہ ہے جو عرش کا مالک ہے۔ تو جب عرش کے مالک ہیں تو باقی چیزیں سب کی سب خود بخود ان کی مِلک میں آئیں گی۔ اس لیے یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص عرش کا ذکر فرمایا ہے۔

﴿مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿۲۱﴾﴾

مطاع ہے یعنی اس کی بات فرشتے بھی مانتے ہیں، امانت دار بھی ہے خیانت کبھی نہیں کرتا۔

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾﴾

اور جس کے پاس قرآن آیا ہے جو تمہارے ساتھی ہیں- العیاذ باللہ- ان میں جنون نہیں ہے۔

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾﴾

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل کو افق؛ اوپر والا جو

واضح کنارہ ہے وہاں ان کو دیکھا ہے۔

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾﴾

اور خود پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ ہے کہ یہ غیب کی بات بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ کاہن کے پاس غیب کی خبریں نہیں ہوتیں لیکن جو جھوٹی خبریں غیب کی بنا کر وہ بتاتے ہیں وہ بھی مفت میں نہیں بتاتے بلکہ پیسے لے کر بتاتے ہیں، خبریں چھپا کر رکھتے ہیں جبکہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چھپا کر نہیں رکھتے بلکہ جو خبر آتی ہے بتا دیتے ہیں۔

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾﴾

اور یہ قرآن کریم شیطان مردود کاہنوں والی بات نہیں ہے بلکہ پیغمبر والی بات ہے۔

قسم اور مقسم بہ میں مناسبت:

اب یہاں دیکھو! جو قسمیں کھائی ہیں: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾﴾ کہ قسم ہے ستاروں کی جو آگے جاتے ہیں، پھر پیچھے آتے ہیں، پھر چلتے رہتے ہیں پھر عالمِ ملکوت میں چھپ جاتے ہیں۔ اس کے مناسب آگے کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾﴾ جبرائیل امین علیہ السلام آتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں کسی کو نظر نہیں آتے۔ تو حضرت جبرائیل امین کی حالت کے موافق یہ قسم کھائی۔

یہ جو قسم کھائی ہے ﴿وَ الَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾ وَ الصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾﴾ یہ قرآن کریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں تو ظلمتیں چھٹ گئی ہیں اور صبح ہو گئی ہے۔ تو ان

دونوں کی مناسبت سے اللہ نے دونوں طرح کی قسمیں کھائی ہیں۔ ایک قسم ایسی ہے کہ جو جبرائیل علیہ السلام کے مناسب ہے اور ایک قسم وہ ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناسب ہے۔

﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾﴾

اس قرآن کو چھوڑ کر تم کہاں دوڑتے ہو؟! یہ قرآن کریم نصیحت ہے بالعموم سارے جہان کے لیے اور بالخصوص اس شخص کے لیے جو سیدھے راستے پر چلنا چاہتا ہو۔ یہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان القرآن کا ترجمہ ہے۔

ہدایت کی دو قسمیں:

ہم کہتے ہیں کہ ہدایت کے دو طریقے ہیں:

1: اراءۃ الطریق.. سیدھا راستہ دکھا دینا

2: ایصال الی المطلوب.. سیدھے راستے پر چلا دینا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ذکر بالعموم نصیحت ہے جہان والوں کے لیے اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہتے ہوں۔ بالعموم عوام الناس کے لیے یہ قرآن نصیحت ہے اراءۃ الطریق کے طور پر کہ ان کو راستہ دکھا دیتا ہے اور خواص کے لیے یہ نصیحت ہے کہ ان کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تعبیرات ہیں۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ بیان القرآن پڑھا کرو، لطف لو بیان القرآن پڑھ کر، حضرت نے کمال کر دیا ہے لغات الگ حل کی ہیں، صرف و نحو کو الگ حل کیا ہے، تصوف کو الگ چھیڑا ہے، عقائد کی بات کرتے ہیں، پھر مسائل سلوک لاتے ہیں، پھر بین القوسین میں سارے شبہات کو رد فرما دیتے ہیں۔ حضرت نے یہ عوام کے لیے لکھا

ہے اور آپ یقین فرمائیے کہ جب حضرت یہ فرماتے ہیں کہ میں طالب علمانہ طور پر یہ بات کر رہا ہوں تو میں کسی اور کی بات نہیں کرتا میں اپنی بات کرتا ہوں کہ میری بس ہو جاتی ہے، مجھے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے جب حضرت خالص علمی رنگ اختیار فرماتے ہیں۔

جب یہ نصیحت ہے بالعموم بھی اور بالخصوص بھی تو پھر بھی لوگ ہدایت پر کیوں نہیں آتے؟ حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ کی تکوینی حکمتیں ہیں کہ بعضوں کے لیے مشیت ہوتی ہے تو ہدایت مل جاتی ہے اور بعضوں کے لیے حکمت کی وجہ سے مشیت نہیں ہوتی تو ان کو ہدایت نہیں ملتی، اس لیے آپ اس پر زیادہ پریشان نہ ہوں۔

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾

تم چاہو بھی تو سیدھے راستے پر نہیں چل سکتے۔ ہاں جب اللہ چلانا چاہے تو پھر چل سکتے ہو۔ بس یہ دعا کریں کہ اللہ ہم سب کے لیے صراط مستقیم پر چلانے کا فیصلہ فرما لیں۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الانفطار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾﴾

احوالِ قیامت کا بیان:

جب آسمان ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا۔ ستارے گر پڑیں گے۔ جب دریاؤں کو مزید چلا دیا جائے گا۔ دریا تو پہلے بھی چل رہے ہیں یہاں چلانے کا مطلب یہ ہے کہ میٹھے اور کھارے پانی کو ملا دیا جائے گا، پھر ان کو اکٹھا کر کے چلایا جائے گا۔

﴿وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾﴾

قبروں کو اکھاڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ اب دیکھو! قبر اسے کہتے ہیں جہاں میت یا اجزائے میت ہوں، قبر کا معنی علیین یا سجین نہیں ہے۔

﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾﴾

ہر آدمی جان لے گا کہ اس نے آگے کون سا عمل بھیجا ہے اور پیچھے کون سا عمل چھوڑا ہے۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ جو نیک اعمال اس نے کیے تھے آگے وہ اس کے لیے ذخیرہ ہوں گے وہ بھی دیکھ لے گا اور جو نیک عمل وہ نہیں کر سکا تھا چھوڑ

دیے تھے وہ بھی اس کے سامنے آجائیں گے، پیچھے والے اور بعد والے بھی۔

یا یہ معنیٰ ہے کہ کوئی ایسا شخص کہ جس نے کوئی نیک عمل خود کیا تو اس کا اجر بھی اسے ملے گا اور ایسا نیک عمل پیچھے چھوڑا کہ لوگ اس پر عمل کرتے تھے اس کا اجر بھی اس کو ملے گا جسے صدقہ جاریہ کہتے ہیں۔ مثلاً مسجد بنادی، مدرسہ بنادیا، نیک اولاد چھوڑ کر چلا گیا یا علم چھوڑ کر چلا گیا۔ تو جو نیک اعمال خود کیے اور آگے بھیج دیے یہ اس کا "قَدَّمَتۡ" ہیں اور جو پیچھے چھوڑے کہ لوگ اس پر عمل کرتے تھے یہ اس کا "اَخَّرَتۡ" ہیں۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِۙ ۝٦ الَّذِىۡ خَلَقَكَ فَسَوّٰٮكَ فَعَدَلَكَۙ ۝٧ فِىۡۤ اَىِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَؕ ۝٨﴾

اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈالا اپنے رب کریم کے بارے میں جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہارے جوڑوں کو تناسب سے بنایا، پھر تمہارے مزاج میں اعتدال رکھا۔ اخلاطِ اربعہ میں سے کسی کو بڑھا دیا یا کسی کو کم کر دیا، جسم میں حرارت یا برودت بڑھ جائے یا کم ہو جائے ایسا نہیں کیا بلکہ مزاج میں اعتدال رکھا۔ پھر جیسے چاہا اس طرح تمہیں جوڑ کر تمہاری شکل کو بنا دیا۔

اللہ کی صفت کریمی:

اللہ نے یہاں صفت کریم کیوں بیان فرمائی۔ اللہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! جس کے تم مستحق نہیں ہو اللہ پھر بھی دیتا ہے اور اللہ نے تمہارے اعمال پر فوراً مواخذہ نہیں فرمایا، تم نے رات کی تاریکی میں گناہ کیے تھے لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے چھپا لیے تو تم دھوکے میں آگئے ہو کہ ہمارا کچھ نہیں ہوگا! تو فرمایا:

﴿كَلَّا بَلۡ تُكَذِّبُوۡنَ بِالدِّيۡنِۙ ۝٩﴾ ہرگز نہیں! دھوکے میں مت آؤ، بلکہ

تم مزید دھوکے میں آجاتے ہو اور اتنے دھوکے میں آتے ہو کہ قیامت کے دن کو بھی جھٹلانا شروع کر دیتے ہو، کچھ خیال کرو۔

﴿وَ اِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ ۝۱۱ يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝۱۲﴾

تم پر تو فرشتے متعین ہیں - تمہاری حفاظت ہو رہی ہے - یہ فرشتے عزت والے ہیں۔ وہ لکھ رہے ہیں جو تم کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں۔

اللہ! تیرے کرم نے دھوکے میں ڈالا

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کراچی والے میں نے خود ان کے سامنے بیٹھ کر سنا ہے، حضرت فرماتے تھے کہ میں جب یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِ﴾ کہ تمہیں تمہارے کریم رب کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈالا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلتا ہے کَرَمُكَ.. كَرَمُكَ.. كَرَمُكَ.. بس اللہ! آپ کریم اتنے ہیں کہ ہم دھوکے میں پڑگئے ہیں۔ جس طرح ایک بندہ ہے وہ سمجھتا ہے کہ فلاں بزرگ ایسا ہے کہ میں نے اس کی کوئی چیز کھا بھی لی تو وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے، میں نے ان کو کچھ کہَ بھی دیا تو بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے، میں دیر سے چلا گیا تو استاذ جی نے پھر بھی کچھ نہیں کہنا! یہ ہے کرم۔ اس کرم کا تقاضا یہ تھا کہ وقت پر آتے، اس کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ آدمی نافرمانیاں شروع کر دیتا۔

اللہ کریم ہے اور کرم کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے کرم کو دیکھ کر بات مانتے، ہم اس کے کرم کو دیکھ کر دھوکے میں آگئے اور ہم نے کیا کام شروع کر دیا؟!

”کریم“ کے پانچ معانی:

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ”کریم“ کے پانچ معانی لکھے ہیں:

1: اَلَّذِیۡ یُعۡطِیۡ بِدُوۡنِ الۡاِسۡتِحۡقَاقِ.

کریم وہ ہے جو اس کو دیتا ہے جو حقدار نہیں ہوتا، غیر مستحق کو دینے والے کو کریم کہتے ہیں۔

2: اَلَّذِیْ یُعْطِیْ بِدُوْنِ الْمَنِّ وَالْفَضْلِ

کریم وہ ہے جو دیتا ہے پھر جتلاتا نہیں ہے کہ تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں دیا تھا، اس کو کریم کہتے ہیں۔

3: اَلَّذِیْ یَتَفَضَّلُ عَلَیْنَا فَوْقَ مَا نَتَمَنّٰی بِہٖ

جتنی آدمی کی توقع ہوتی ہے اس سے بڑھ کر دیتا ہے، اس کو کریم کہتے ہیں۔

4: اَلَّذِیْ یَتَفَضَّلُ عَلَیْنَا بِدُوْنِ مَسْئَلَۃٍ وَلَا وَسِیْلَۃٍ

جو بن مانگے بھی دے اور بن وسیلہ بھی دے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وسیلہ نہ کریں تب بھی دیتا ہے اور اگر وسیلہ کریں تو اللہ تعالیٰ جلدی دیتا ہے۔ اھل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ وسیلہ کر سکتے ہیں۔

5: اَلَّذِیْ یَتَفَضَّلُ عَلَیْنَا وَلَا یَخَافُ نِفَادَ مَا عِنْدَہٗ

وہ عطا کرے اور اس کو اپنے خزانے میں کمی کا کوئی خدشہ نہ ہو۔

اللہ پاک ہمیں اپنی شان کریمی سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

ایصال ثواب کا اثبات:

میں اس آیت کو بسا اوقات ایصالِ ثواب پر پیش کرتا ہوں بطورِ دلیل کے۔ دیکھو! اگر کوئی شخص ارادۂ گناہ کرے اور گناہ نہ کرے تو اس کو نہیں لکھا جاتا جب تک گناہ نہ کرے، ارادۂ نیکی کرے اور نیکی نہ کرے تب بھی لکھ لیا جاتا ہے۔ قانونِ عدل یہ ہے کہ ارادۂ گناہ پر گناہ نہ لکھتے تو ارادۂ نیکی پر نیکی نہ لکھی جاتی، اگر ارادۂ نیکی پر نیکی لکھ دیتے تو ارادۂ گناہ پر گناہ بھی لکھ لیتے لیکن اللہ نے قانونِ عدل سے کام نہیں لیا بلکہ قانونِ کرم سے کام لیا۔

آدمی گناہ ایک کرے تو ایک لکھا جاتا ہے اور نیکی ایک کرے تو دس لکھی جاتی ہیں۔ قانونِ عدل یہ تھا کہ ایک گناہ پر ایک گناہ اور ایک نیکی پر ایک نیکی لکھتے، نیکی پر دس ہے تو گناہ پر بھی دس لکھتے لیکن قانونِ عدل سے کام نہیں لیا بلکہ قانونِ کرم سے کام لیا۔ پھر اگر باپ مر جائے اور بیٹا زنا کرے اور کہے کہ یا اللہ! اس کا گناہ میرے ابا کو دے دیں تو اللہ نہیں دیتے اور اگر یہ بندہ نیک عمل کرے اور کہے کہ یا اللہ! اس کا ثواب میرے ابا کو دے دیں تو اللہ دے دیتے ہیں، ایصالِ عذاب نہیں ہوتا بلکہ ایصالِ ثواب ہوتا ہے، قانونِ عدل یہ ہے کہ اگر نیکی دی ہے تو اس کا گناہ بھی دے دیتے اور اگر گناہ نہیں پہنچتا تو نیکی بھی نہ پہنچتی، یہاں بھی قانونِ عدل سے نہیں بلکہ قانونِ کرم سے کام لیا ہے۔

پھر اللہ رب العزت نے انسان کو جتنی عمر دی ہے مثلاً ستر سال۔ یہ بالغ ہوا ہے پندرہ سال کے بعد تو پچپن سال کی نیکیاں اور پچپن سال کے گناہ اعمال نامہ میں تول دیے جائیں گے۔ اب اگر جتنی عمر ہے اور اتنے ہی اعمال ہوتے – میں اپنی بات کرتا ہوں، آپ کی تو نہیں کرتا – شاید ہمارے لیے جنت میں جانے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی چونکہ ہماری عمر میں گناہ زیادہ ہیں اور نیک اعمال کم ہیں اور شاید جنت کی صورت نہ نکلتی۔

اگر اللہ قیامت تک انسان کو زندہ رکھتے اور قیامت کے دن اس کو موت دیتے اور پھر اس کو زندہ کرتے اور اس کی نیکیوں اور گناہوں کو تولا جاتا تو گناہ بڑھ جاتے اور نیکیاں کم ہو جاتیں، اللہ نے کرم فرمایا کہ زندگی تھوڑی دی ہے اور اس کے بعد والے اگر گناہ کر کے اس کو بخشیں تو نامہ اعمال میں نہیں ڈالتے اور بعد والے نیک اعمال کر کے بخشیں تو اللہ اس کے نامہ اعمال میں ڈال دیتے ہیں۔ زندگی پچپن سال ہے، گناہ بھی پچپن سال کے ہیں اور نیک اعمال پچپن سال کے نہیں، تو بعد والے نیک اعمال کر

کے اس کو بخشیں تو قیامت تک اللہ اس کے نامہ اعمال میں ڈالتے رہیں گے۔ اب جب قیامت کے دن نامہ اعمال تولا جائے گا تو بہت کم بد قسمت ایسے ہوں گے کہ جن کے نامہ اعمال میں نیکیاں کم نکلیں اور گناہ زیادہ نکلیں۔ یہ اللہ کا قانونِ کرم ہے۔

ایصالِ ثواب اللہ کے کریم ہونے کی دلیل ہے اور ایصالِ ثواب کا انکار اللہ کے شانِ کرم کے انکار کی دلیل ہے۔ ہم اللہ کو کریم مانتے ہیں۔ ہاں ہم یہ بات کہتے ہیں کہ جو ایصالِ ثواب کو نہیں مانتے ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمارے بعد والے نیک اعمال ہمیں بخش دیں تو وہ ہمیں مل جائیں اور تمہارے بعد والے نیک عمل کریں اور تمہیں بخشیں تو اللہ کرے تمہیں نہ ملیں تو اس پر ان آمین کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اللہ پاک ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

نیک اور برے لوگوں کا انجام:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴿۱۴﴾ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ ﴿۱۶﴾﴾

نیک لوگ جنت کی نعمتوں میں ہوں گے اور کفار لوگ جہنم میں ہوں گے۔

یہاں فجار سے فاسق نہیں بلکہ فجار سے کافر مراد ہیں، اس کی دلیل ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ ﴿۱۶﴾﴾ یہ جہنم میں داخل ہوں گے تو پھر کبھی اس سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔ خلود فی النار یہ کفر کے لیے ہوتا ہے فسق کے لیے نہیں ہوتا۔

﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۸﴾﴾

آپ کو کیا پتا قیامت کتنی سخت ہے؟ آپ کو پھر بتا رہا ہوں کہ آپ کو کیا پتا قیامت کتنی سخت ہے؟ ''ثُمَّ'' کا معنی سمجھ میں آ گیا؟ میں اس لیے رک رک کر ترجمہ کر رہا ہوں تاکہ تمہیں سمجھ میں آ جائے۔

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝۱۹﴾

قیامت وہ ہے جس دن کوئی آدمی کسی دوسرے کے ذرہ برابر کام نہیں آسکے گا اور اس دن معاملات خالص اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے، کسی کا اختیار نہیں چلے گا۔

یہاں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ قیامت کے دن شفاعت نہیں ہوگی۔ شفاعت کا معاملہ الگ ہے۔ ذاتی طور پر انسان کسی دوسرے کے کام نہیں آئے گا۔ جس کو اللہ اجازت دیں گے وہ شفاعت بھی کرے گا اور وہ بولے گا بھی۔ اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی۔ اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ المطففین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫﴿۲﴾ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۳﴾﴾

تطفیف کا معنیٰ:

"تطفیف" کہتے ہیں کمی بیشی کو۔ تطفیف کا تعلق صرف ناپ اور تول کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تمام معاملات کے ساتھ ہے۔ مثلاً استاذ ہے پڑھانے میں کمی کرتا ہے اور تنخواہ پوری لیتا ہے تو یہ مُطَفِّف ہے۔ طالب علم داخلہ لیتا ہے، کھانا پورا کھاتا ہے لیکن پڑھنے میں کمی کرتا ہے تو یہ بھی مُطَفِّف ہے۔ یہ سب مُطَفِّف کی صورتیں ہیں۔

لیکن یہاں بطورِ خاص ذکر ہے لین دین کا۔ آدمی جب کسی کو دے تو کم کر کے دے اور جب لے تو مکمل لے۔ مکمل لینا جرم نہیں ہے لیکن مکمل لینا اور کم دینا یہ جرم ہے۔ اگر آدمی دے بھی کم اور لے بھی کم تو پھر جرم کی نوعیت بدل جاتی ہے اور جب لے مکمل لیکن دے کم تو پھر جرم کی نوعیت بڑھ جاتی ہے۔

چونکہ اصل مقصود دینے میں کمی ہے اس لیے کیل اور وزن دونوں کا ذکر کیا اور مکمل حق لینا یہ کوئی عیب نہیں ہے اس لیے یہاں پر صرف کیل ذکر فرمایا ہے اور یہ

جو کیل ہوتا ہے کہ پیمانے کے ساتھ ناپنا اس کا ذکر خاص اس وجہ سے کیا ہے کہ مکہ میں عموماً اور مدینہ منورہ میں خصوصاً تول کا رواج کم تھا اور ناپ کا زیادہ تھا، ڈھیریاں لگانے یا گنتی کرنے کا رواج زیادہ تھا۔

فکرِ آخرت تمام اعمال کی بنیاد:

﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝﴾

یہ جرم اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کو اس بات کا اعتقاد نہیں ہے کہ قیامت کے دن ہم اٹھیں گے۔ جس شخص کا یہ اعتقاد ہو کہ قیامت کے دن اٹھیں گے وہ ایسا جرم کبھی نہیں کرتا اور یہ بالکل اپنا ذہن بنالیں کہ تمام اعمال کی بنیاد آخرت ہے، جب انسان کو پورا یقین ہو کہ موت کے بعد ہر چیز کا حساب ہونا ہے پھر آدمی دینے میں کمی نہیں کرتا، جھوٹ نہیں بولتا، کسی کی عزت پہ حملے نہیں کرتا جب یہ یقین ہو، اور بطورِ خاص ہم جو علماء ہیں ہمیں اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کہ ہمارے قول اور فعل سے نہ کسی کو تکلیف ہو نہ کسی پر الزام ہو، باطل کے ساتھ بھی جنگ ہو تو اتنی ہو جتنی بنتی ہے، ذاتیات پہ بلاوجہ حملہ کرنا مناسب نہیں ہے اور کسی مسلک میں کوئی چیز نہ ہو تو اس کا ذکر کرنا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا قیامت کے دن ہم سے حساب ہو گا۔ اس کا بہت خیال رکھیں۔

﴿كَلَّآ﴾

یہ جو ان کا خیال ہے قیامت کے دن نہیں اٹھائے جائیں گے یہ خیال بالکل غلط ہے، ہرگز ایسی بات نہیں ہے بلکہ یہ اٹھائے جائیں گے۔

یہ میں کا ہر جگہ پہ ترجمہ قصداً کرتا ہوں کہ آپ اس کو سمجھیں کہ یہ یہاں کیوں استعمال ہو رہا ہے۔ ﴿كَلَّآ﴾ کا یہاں مطلب یہ ہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہم

قیامت کو نہیں اٹھائے جائیں گے، فرمایا:﴿كَلَّآ﴾ان کی یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ہرگز ایسی بات نہیں بلکہ یہ اٹھائے جائیں گے۔

”سجین“ کیا ہے؟

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝٧﴾

تمہارے جتنے نامۂ اعمال ہیں وہ محفوظ ہیں، نامہ اعمال کفار کا بھی ہے اور نامہ اعمال ایمان والوں کا بھی ہے۔ ”الْفُجَّارِ“ سے مراد کفار ہیں۔ کفار کا نامۂ اعمال سجین میں ہے اور مؤمنین کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔ اسی طرح مؤمنین کی ارواح کا مقام اور مستقر علیین میں ہے اور کفار کی ارواح کا مستقر سجین میں ہے۔

سجین؛ سات زمینوں سے نیچے جگہ کا نام ہے اور علیین سات آسمانوں سے اوپر عرش کے نیچے ایک مقام کا نام ہے۔﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ کہ کفار کے اعمال سجین میں محفوظ ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ کفار کے اعمال نامے سجین میں محفوظ ہوتے ہیں اور یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں ایک جامع رجسٹر ہو جس میں تمام کفار کے اعمال کو لکھا جاتا ہو اور وہ رجسٹر وہاں پہ محفوظ ہوتا ہے۔ ارواح بھی ان کی وہاں پر ہیں اور اعمال بھی وہاں پر ہیں۔

دلوں کا زنگ:

﴿وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝١١ وَ مَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٣ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٤﴾

قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی ہو گی۔ یہ جھٹلانے والے وہ لوگ ہیں جو قیامت کا انکار کرتے ہیں، قیامت کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں جو حد

سے تجاوز کرنے والے ہیں، جو گناہ کرتے ہیں، جب ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی بے سند قسم کی باتیں ہیں-العیاذ باللہ-

فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ یہ جو تمہارا خیال ہے کہ قرآن کریم بے سند کہانی ہے یہ خیال ٹھیک نہیں ہے، ایسی بات نہیں ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کہانی ہے-معاذ اللہ-تو اس پر ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔ دل سیاہ ہو گئے ہیں اس لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور یہ زنگ کیوں لگا ہے؟ ﴿مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے۔

جیسے حدیث پاک میں ہے کہ مؤمن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر یہ بندہ توبہ کر لیتا ہے اور گناہوں کو چھوڑ کر نیک اعمال شروع کر دیتا ہے تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل پہلے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ بندہ توبہ نہیں کرتا بلکہ گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے تو یہ نقطے لگتے لگتے انسان کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝١٥﴾

ان کا خیال ہے کہ نہ قیامت ہو گی نہ ہم اٹھیں گے، نہ ہمارا حساب کتاب ہو گا نہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ ہرگز نہیں، یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ جب قیامت کو اٹھیں گے اور اللہ کے سامنے پیشی ہو گی تو ان کا حشر یہ ہو گا کہ یہ اللہ کا دیدار نہیں کر سکیں گے۔

دیدارِ الٰہی:

یہاں ایک بات یوں سمجھیں کہ قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ کی زیارت ممکن نہ ہوتی یا اہلِ ایمان کو زیارت نہ ہوتی تو یہ بات نہ کہی جاتی کہ ﴿اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ

﴿يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ کفار کو اللہ کی زیارت سے روک دینا اور ان کو اللہ کا دیدار نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ ایمان کو دیدار ہو گا۔ اگر اہلِ ایمان کو بھی دیدار نہ ہو اور ان کو بھی دیدار نہ ہو تو دونوں میں فرق کیا ہو گا؟ تو کفار کے بارے میں یہ کہنا کہ قیامت کے دن ان کو اللہ کا دیدار نہیں ہو گا اس بات کی دلیل ہے کہ مومنین کو اللہ کا دیدار ہو گا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ [79]

اس دن کئی چہرے تر و تازہ ہوں گے، اور وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

دوسری بات کہ اللہ رب العزت کا دیدار اور اللہ کی زیارت کا شوق اور تقاضا ہر انسان کی فطرت اور طبیعت میں اللہ نے رکھ دیا ہے۔ اللہ کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ بسا اوقات ماحول کی وجہ سے اس محبت کا اظہار نہیں ہوتا وگرنہ یہ ہر انسان کی طبیعت میں شامل ہے۔ قیامت کے دن جب رکاوٹیں ساری ختم ہو جائیں گی تو فطری تقاضا ہو گا اللہ کی زیارت کا۔

کفار کو اللہ اپنی زیارت نہیں کروائیں گے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے، جس سے محبت ہوتی ہے اس کو دیکھنے کو دل بھی کرتا ہے، اللہ کو دیکھنے کو دل اس لیے کرے گا کہ اللہ سے پیار ہے، اللہ سے محبت نہ ہو تو دیکھنے کو دل کیوں کرے گا اور ان کو کیوں روک دیا جائے گا کہ یہ اللہ کا دیدار نہیں کر سکتے۔ تو اللہ کی محبت اور اللہ کی زیارت یہ دونوں چیزیں فطرت میں شامل ہیں۔

﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ

79۔ القیامۃ 75:22، 23

تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٧﴾

پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور انہیں کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾﴾

ان کا خیال یہ تھا کہ ہم دنیا میں ختم ہو جائیں گے، مر جائیں گے، نہیں اٹھائے جائیں گے، جو اعمال ہم کرتے ہیں ان کا حساب نہیں ہو گا، فرمایا: "كَلَّا" ہرگز نہیں، حساب ہو گا! نیک لوگوں کا نامۂ اعمال ہم نے علیین میں رکھا ہے۔

﴿كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

وہ رجسٹر ہے جسے اردو میں دفتر کہتے ہیں۔اس پر مہر لگی پڑی ہے جیسے سرکاری رجسٹر جب بند ہو جائے تو اوپر مہر لگا دیتے ہیں۔ اللہ کے مقرب فرشتے اس کے پاس جاتے ہیں۔

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾

نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ آرام دہ نشستوں پر بیٹھے ہوں گے اور نظارے کر رہے ہوں گے۔

جنت کی شرابِ خالص:

﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾

ان کو خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہو گی اور مہر بھی مشک کی ہو گی۔اس میں آگے بڑھنے والوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔ بڑھنے کی چیزیں یہ ہیں۔

﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾﴾

اور اس شراب میں کچھ "تسنیم" بھی ہو گا۔ تسنیم کیا ہے؟ یہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے مقربین پیتے ہیں۔ یعنی ان کو تو خالص تسنیم ملتا ہے اور جو نیچے درجے کے جنتی ہیں ان کو شراب کی اندر کچھ تسنیم ملا دیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تسنیم تو شراب سے بھی اعلیٰ قسم کا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝٢٩ وَاِذَا
مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝٣٠ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝٣١ وَ
اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝٣٢﴾

یہ مجرم لوگ دنیا میں ایمان والوں پر ہنستے تھے، جب ان کے قریب سے گزرتے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب گھر جاتے تو مزے لے لے کر ان کے تذکرے کرتے اور جب دنیا میں ان ایمان والوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔

﴿وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ۝٣٣ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ
الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝٣٤ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝٣٥ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا
كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝٣٦﴾

حالانکہ یہ کافران مسلمانوں پر نگہبان تھوڑے ہیں۔ آج تو یہ ہو گا کہ ایمان والے کفار پر ہنسیں گے۔ جنت میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھ کر ان کو دیکھ رہے ہوں گے اور پھر یہ کہیں گے کہ کافروں کو اس کام کا بدلہ مل گیا ہے جو وہ کرتے تھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الانشقاق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡاَرۡضُ
مُدَّتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡہَا وَ تَخَلَّتۡ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ؕ﴿۵﴾﴾

احوالِ قیامت کا بیان:

جب آسمان پھٹ پڑے گا۔ آسمان اللہ کی بات کو سنے گا اور مان لے گا اور وہ اسی لائق ہے کہ سنے اور مان لے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ زمین میں ہے نکال کر باہر کرے گی اور خود خالی ہو جائے گی اور اللہ کے حکم کو سنے گی اور مانے گی اور زمین کو حکم ماننا بھی چاہیے۔

اللہ رب العزت کے حکم دو قسم کے ہیں:

1: حکم تشریعی 2: حکم تکوینی

حکمِ تشریعی کا معنی کہ جس میں اللہ مکلف کو کرنے نہ کرنے کا کچھ اختیار بھی دیں، کرنے پر اس کو اچھا اجر ملے اور نہ کرنے پر اس کو سزا ملے اور حکمِ تکوینی کہ جس میں مکلف کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، اس کو کرنا ہی کرنا ہوتا ہے اور اس میں یہ شامل نہیں ہوتا کہ اسے کرنے پر اچھا بدلہ ملے گا اور نہ کرنے پر عذاب ملے گا۔ آسمان اور زمین کو جو حکم ملیں گے وہ حکم تکوینی ہوں گے، حکم تشریعی نہیں ہوں گے۔

قیامت کے دن زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔ حدیث پاک میں ہے جیسے چمڑے کو کھینچ کر بڑا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ربڑ سمجھیں کہ اسی زمین کو کھینچ کے بڑا کر دیا جائے گا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے سب انسان اس زمین پر جمع ہوں گے اور ہر آدمی کو اتنی جگہ ملے گی جہاں وہ پاؤں رکھ کر کھڑا ہو سکے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

انسانی محنت اور اس کا ثمرہ:

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۝٦﴾

اے انسان! تم نے اپنے رب تک مشقت اٹھا کر پہنچنا ہے اور مشقت اٹھاتے اٹھاتے اللہ تک پہنچ جانا ہے۔ مسلمان ہو یا کافر دنیا میں ہر کسی نے مشقت اٹھانی ہے۔ اگر مشقت نیک کام کی ہو گی تو اچھا بدلہ ملے گا اور برے کام کی ہو گی تو ظاہر ہے کہ انجام برا ہو گا۔

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝٧ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝٨ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝٩﴾

جس شخص کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیں گے تو اس کا حساب آسان ہو جائے گا۔ حساب آسان ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ صرف پیشی فرمائیں، اعمال نامہ دیکھیں اور اس کو چھوڑ دیں اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس کے عذاب کو کم کر دیں۔ دونوں اس میں شامل ہیں۔ جب اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا تو یہ اپنے تعلق والوں کے پاس خوش ہو کر آئے گا کہ میری جان بچ گئی، میں تو چھوٹ گیا۔

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ۝١١ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝١٢ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝١٣ إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ۝١٤ بَلَىٰ ۚ

﴿اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝١٥﴾

وہ شخص جس نے مشقت اٹھائی ہو گی لیکن گناہوں میں اور اللہ کی نافرمانی میں تو اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیں گے۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے اور بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال پکڑا دیا جائے گا۔ اس وقت یہ موت کو پکارے گا جس طرح آدمی مصیبت میں موت کو پکارتا ہے لیکن جہنم میں داخل ہو گا، موت نہیں آئے گی۔ یہ وہ شخص تھا کہ دنیا میں بہت خوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں دوبارہ نہیں اٹھوں گا، لوٹ کر وہاں نہیں جاؤں گا۔ اللہ فرماتے ہیں: "بَلٰى" کیوں نہیں، وہاں تو جانا ہی ہے۔ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝١٦ وَ الَّيْلِ وَ مَا وَسَقَ ۝١٧ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝١٨ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝١٩﴾

پھر اللہ نے چار قسمیں کھائی ہیں، فرمایا: "فَلَآ" تمہارا خیال ہے کہ نہیں اٹھیں گے تمہاری یہ بات صحیح نہیں ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے اٹھنا ہے۔ یہ "لَا" زائد کا مطلب ہے۔ آگے چار قسمیں کھائی ہیں۔ چونکہ چار قسم کے احوال ہیں کہ پہلے سورج غروب ہوتا ہے اور رات شروع ہوتی ہے اس کو "الشَّفَقِ" کہتے ہیں تو اس کی قسم کھائی، پھر اس کے بعد کچھ اندھیرا ہو جائے تو اس کو "الَّيْلِ" کہتے ہیں تو اس کی قسم کھائی، پھر جب رات مزید گہری ہو جائے تو لوگ رات میں چھپ جاتے ہیں یعنی آدمی سو گئے ہیں، جانور ہیں، اور بھی چیزیں ہیں رات کا اندھیرا ان کو چھپا لیتا ہے تو اسے فرمایا "وَ مَا وَسَقَ" کہہ کر اس کی قسم کھائی، پھر جب چاند نکلتا ہے تو چاند بھی اپنے اندر چیزوں کو سمیٹ لیتا ہے، رات آتی ہے تو اپنی تاریکی میں لے لیتی ہے اور چاند آتا ہے تو اپنی روشنی میں لے لیتا ہے تو "وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ" کہہ کر اس کی قسم کھائی ہے۔ یہ چار

قسمیں کھاکر فرمایا۔

پیدائش سے جنت و جہنم تک کے مراحل:

﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾

قسم کھاکر فرمایا کہ تم ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف چڑھتے جاؤ گے!

جب کوئی چیز تہہ بہ تہہ ہو تو اس کی ایک تہہ کو طبقہ کہتے ہیں اور مجموعے کو "طبقات" کہتے ہیں۔ تو فرمایا کہ تم نے بھی تہہ بہ تہہ آگے جانا ہے، اور یہ انسان کی پیدائش سے لے کر جنت تک کے مراحل ہیں۔ ایک وقت ہوتا ہے کہ انسان نطفہ ہوتا ہے، پھر ایک مرتبہ ماں کے رحم میں جاتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ آدمی جما ہوا خون بنتا ہے، پھر گوشت بنتا ہے، پھر ہڈیاں ہوتی ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے، پھر اس میں اعضاء بنتے ہیں، پھر اس میں روح آتی ہے، پھر یہ بطورِ خوراک ماں کے پیٹ کے حیض کو استعمال کرتا ہے، پھر وقت آتا ہے کہ ماں کے دودھ کو استعمال کرتا ہے، پھر اچھی خوراک کھاتا ہے، پھر اس کی جوانی آتی ہے، پھر بڑھاپا آتا ہے، پھر موت ہے، پھر برزخ ہے، پھر حشر ہے، پھر جنت ہے یا جہنم ہے۔ یہ لمبا سلسلہ ہے۔

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿٢١﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿٢٣﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٤﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٢٥﴾﴾

ان کو کیا ہو گیا کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔ ان کو ایسا کرنا چاہیے تھا بلکہ یہ عجیب لوگ ہیں کہ الٹا تکذیب کرتے ہیں۔ اللہ ان کے اعمال کو محفوظ کرتے ہیں۔ ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے اجر ہو

گا، ایسا اجر ہو گا جو ختم بھی نہیں ہو گا۔

آیت سجدہ:

﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ﴾

یہ آیت سجدہ ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اس آیت کو جو پڑھے یا سنے اس پر سجدہ کرنا واجب ہے۔ بعض ائمہ سجدے کے قائل نہیں۔ ہمارے امام صاحب سجدہ کرنے کے قائل ہیں۔ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر سجدہ کیا۔ میں نے پوچھا: سجدہ کیوں کیا؟ فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسری روایت میں فرماتے ہیں: ہم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں اس سورت انشقاق پر بھی سجدہ کرتے دیکھا ہے اور اقرأ باسم ربک پر بھی سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ تو امام صاحب یہاں پر سجدے کے قائل ہیں۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ حضرت وجوب سجدہ کے قائل تھے لیکن رہتے ایسے لوگوں میں تھے جو سجدہ کے قائل نہیں تھے تو حضرت فرماتے ہیں کہ میں نماز میں اس سورت کی کبھی تلاوت نہیں کرتا چونکہ میرے ہاں سجدہ واجب ہے، میں سجدہ کروں گا اور یہ لوگ سجدہ نہیں کریں گے، اگر میں نہیں کروں گا ان کی رعایت کرتے ہوئے تو مجھے گناہ ہو گا اور اگر اپنے مسئلے کی رعایت پر سجدہ کروں گا تو ان میں اختلاف ہو گا، اس لیے میں اس سورۃ کی تلاوت نماز میں نہیں کرتا تاکہ ہم باہمی اختلاف سے بچ جائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ البروج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾ وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاہِدٍ وَّمَشۡہُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾﴾

شانِ نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ سے 70 سال پہلے ایک بادشاہ تھا- یہ معروف واقعہ ہے آپ نے سنا ہوگا- یوسف ذونواس اس بادشاہ کا نام تھا اور یہ کافر تھا۔ اس کے پاس ایک جادوگر تھا، جادوگر جب بوڑھا ہوا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے ایک لڑکا دو جس کو میں جادو سکھا دوں تاکہ میرے بعد وہ تمہارے کام آتا رہے۔ اس بادشاہ نے اس کو ایک لڑکا دیا جس کا نام عبد اللہ بن تامر تھا کہ اس کو جادو سکھاؤ۔

یہ بچہ گھر سے جادو سیکھنے کے لیے اس جادوگر کے پاس جاتا تو راستے میں ایک راہب تھا جو عیسائی مذہب پر تھا اور عبادت کرتا تھا، یہ بچہ اس کے پاس رکتا۔ اس کے پاس بیٹھتا، اس کی باتیں سنتا۔ بچہ اس سے بہت متاثر ہوا اور عیسائی مذہب کے مطابق جو اس وقت حق تھا ایمان لے آیا۔ ایک بار یہ بچہ آرہا تھا تو راستے میں ایک شیر تھا اس نے لوگوں کا راستہ روکا ہوا تھا۔ اس بچے نے پتھر اٹھایا اور شیر کو مارتے ہوئے یہ کہا کہ اے اللہ! اگر راہب کی باتیں جادوگر کی باتوں سے سچی ہیں تو یہ شیر مر جائے۔ یہ کہہ کر اس

نے پتھر مارا تو شیر مر گیا۔ اب لوگوں میں اس بچے کی کرامت مشہور ہوگئی۔

ایک نابینا اس کے پاس آیا کہ میری آنکھیں ٹھیک کر دو! لڑکے نے کہا کہ شفا دینے والی ذات تو اللہ کی ہے، تم وعدہ کرو کہ اگر ٹھیک ہو گئے تو للہ کی توحید پر ایمان لاؤ گے! نابینا نے شرط مان لی۔ اس نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا اور اللہ کی توحید پر ایمان لے آیا۔ اس کی وجہ سے اس بچے کی شہرت بہت ہو گئی۔ جب یہ بات کاہن تک پہنچی تو اس نے بادشاہ کو بتایا کہ ہمارے دین کا نقصان ہو رہا ہے۔ تو بادشاہ نے راہب کو بھی اور عبداللہ بن تامر اس بچے کو بھی اور اس نابینا کو جس کی آنکھ ٹھیک کی تھی سے بھی بلایا۔ راہب اور اس نابینے کو فوراً قتل کر دیا اور اس بچے کے بارے میں اس نے اپنے نوکروں کو بھیجا کہ اس کو پہاڑ پر لے جاؤ اور وہاں سے گراؤ۔ جب وہاں لے گئے تو زلزلہ آیا اور جو گرانے کے لیے گئے تھے وہ خود گر کر مر گئے اور یہ بچہ زندہ واپس آگیا۔

پھر بادشاہ نے کہا کہ اس کو دریا میں غرق کر دو! جب اس کو دریا میں لے گئے تو پانی میں ہلچل ہوئی اور کشتی الٹ گئی، جو غرق کرنے کے لیے گئے تھے وہ خود غرق ہو گئے اور یہ بچ کر واپس آگیا۔ اس کو بادشاہ قتل نہیں کر سکا تو اس بچے نے بادشاہ سے کہا کہ ایک صورت تم اختیار کرو تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے تیر مارو اور یہ کہہ کے مارو کہ "بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّیْ" اور لوگوں کے مجمع کے درمیان مارو۔ مجمع موجود ہو تو ظاہر ہے کہ ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ تو جب بادشاہ نے "بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّیْ" کہہ کر تیر مارا تو تیر اس کی کنپٹی پہ لگا اور بچہ شہید ہو گیا۔ اس وقت یہ بات دیکھتے ہی بادشاہ کی سلطنت کے کئی لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ اصل مذہب یہی سچا ہے جو اللہ کے نام والا ہے۔

بادشاہ نے ان کے لیے آگ کی خندقیں کھدوائیں اور اس میں ان کو ڈال کر مارنا شروع کر دیا۔ 12 ہزار کی تعداد میں بندے اس بے ایمان نے قتل کیے۔ کہتے ہیں کہ اس میں صرف ایک عورت تھی جس کو آگ کی خندق میں گرنے میں ہچکچاہٹ

ہوئی۔ اس کی گود میں چھوٹا بچہ تھا۔ انہوں نے اس بچے کو لے کر پھینکا۔ اس بچے نے خندق سے آواز دی ”اَنَا عَلَی الْحَقِّ“ میں حق پر ہوں تم لوگ صبر کرو۔ پھر ماں نے چھلانگ لگادی توماں بھی شہید ہوگئی۔

یہ واقعہ سنایا مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے کہ جس طرح ظالموں نے ظلم کیا تھا اور انجام بد ہوا تھا اسی طرح کفار تمہارے اوپر ظلم کرتے ہیں تو انجام بد کا سامنا ان کو بھی کرنا پڑے گا۔ جنہوں نے خندق کھودی تو اس خندق کی آگ پھیلی اور شہر میں لگ گئی۔ لوگ سارے جل گئے۔ بادشاہ دوڑ کر دریا میں گیا تو غرق ہوگیا۔ سارے ختم ہوگئے۔ مومنین تو جنت میں چلے گئے اور کفار جو اُن کو قتل کرتے رہے اور ظلماً مارتے رہے خود اس آگ میں جل کر جہنم میں چلے گئے۔

حضرت عبداللہ بن تامر کا یہ واقعہ یمن میں ہوا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں کسی وجہ سے اس جگہ کو کھودا گیا تو اتفاق سے وہاں ایک بچہ نکلا جس نے ہاتھ اپنی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا۔ جب اس کا ہاتھ ہٹایا گیا تو خون بہنا شروع ہوگیا اور۔ جب ہاتھ اسی جگہ رکھا گیا تو بچے کا خون نکلنا بالکل بند ہوگیا۔ یمن کے امیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاتھ وہیں پر رکھو اور اسی طرح بچے کو دفن کردو۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱﴾

قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے۔ ”برج“ کہتے ہیں محل کو۔ اصل معنی ہے کھلنا۔ تو کھلی ہوئی چیز کو برج کہتے ہیں۔ یہاں برج سے مراد یا تو آسمان کے سیارے ہیں یا برج سے مراد آسمانوں میں بڑے بڑے محلات ہیں جہاں پر فرشتے رہتے ہیں جو آسمانوں کی حفاظت پر مامور ہیں۔

﴿وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝۳﴾... اور قسم ہے اس

دن کی جس کا وعدہ ہے یعنی قیامت کے دن کی اور قسم ہے اس دن کی جو آتا ہے یعنی جمعہ کا دن، اور قسم ہے اس دن کی جس میں لوگ جاتے ہیں یعنی عرفہ کا دن، چونکہ عرفہ میں لوگ میدان عرفات میں جاتے ہیں اور جمعہ میں لوگ اپنی جگہ پر ہوتے ہیں اس لیے جمعہ کو شاہد اور عرفہ کو مشہود کہہ دیا۔

اصحابِ اخدود کا انجام:

﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ﴿۸﴾﴾

ملعون ہوئے ہیں خندقوں والے؛ اس آگ والے جو ایندھن سے بھری ہوئی تھی، جب وہ اس آگ کے پاس بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کرتے اس کا تماشا بھی دیکھتے تھے اور یہ ظلم کیوں کرتے تھے صرف اس وجہ سے کہ وہ لوگ اللہ عزیز وحمید پر ایمان لائے تھے۔

﴿الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ؕ﴿۹﴾﴾

وہ اللہ جس کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِيۡقِ ؕ﴿۱۰﴾﴾

وہ لوگ جنہوں نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو تکلیفیں دیں، پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور جلانے والی آگ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ "ثُمَّ" درمیان میں لا کر

اللہ نے اپنی شان کریمی بتائی ہے کہ اگر اس کے بعد توبہ کرتے تو یہ عذاب نہ آتا، پھر توبہ بھی نہیں کی۔ یہ ”ثُمَّ“ تراخی کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ان کو مہلت ملی کہ توبہ کریں لیکن انہوں نے توبہ بھی نہیں کی۔

اہلِ ایمان کی کامیابی:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿۱۱﴾﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

جہاں ان مجرمین کا ذکر کیا تو ساتھ ایمان والوں کی نعمتوں کا بھی ذکر کیا۔

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ۚ﴿۱۳﴾ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ﴿۱۴﴾﴾

آپ کے رب کی پکڑ بہت سخت ہے، وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اللہ معاف بھی فرماتے ہیں، محبت بھی فرماتے ہیں۔

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ؕ﴿۱۶﴾﴾

اللہ عرش کا مالک ہے اور بزرگی والا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اہلِ کفر کی ناکامی:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ؕ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ﴿۱۹﴾ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۠﴿۲۲﴾﴾

کیا آپ کے پاس لشکر والوں کی بات پہنچی ہے؟ فرعون اور قوم ثمود کی۔ جب یہ خبریں پہنچی ہیں تو اس سے لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے تھی لیکن کافر لوگ پھر بھی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں لیکن اللہ ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ خدا کی پکڑ سے یہ لوگ کہاں جائیں گے۔ باقی ان لوگوں کے جھٹلانے سے قرآن کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ فرمایا: قرآن مجید ویسی ہی عظمت والی کتاب ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے۔ یہ اگر جھٹلاتے ہیں تو اسکا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

اللہ ہم سب کو ایمان پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الطارق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾﴾

"طارق" کسے کہتے ہیں؟

قسم ہے آسمان کی اور طارق کی۔ طارق کا معنی ہے جو رات کو آئے۔ فرمایا کہ: آپ کو پتا ہے کہ طارق کیا ہے؟ وہ ستارہ ہے جو بالکل روشن ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب قرآن میں "وَ مَآ اَدۡرٰىكَ" کا لفظ آئے تو اس کا ترجمہ کرنا سیکھو۔ جب ہم اپنے محاورات میں بات کریں تو یوں کہتے ہیں: یہ جو مہمان آئے ہیں پتا ہے کون ہیں؟ یہ فلاں صاحب ہیں۔ اب یہ ہے "وَ مَآ اَدۡرٰىكَ" جب ہم اس طرز پر بات نہیں کرتے تو "وَ مَآ اَدۡرٰىكَ" کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے۔ اس سے قرآن کی فصاحت اور بلاغت کھل کر سامنے نہیں آتی۔ تو "وَ مَآ اَدۡرٰىكَ" یہ محاورات میں گفتگو ہو رہی ہے کہ تمہیں معلوم ہے طارق کیا ہے؟ وہ ستارہ ہے جو روشن ہے۔

﴿اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾﴾

ہر انسان پر ایک نگہبان فرشتہ مقرر ہے۔ یہ "اِنۡ" نافیہ ہے، "لَمَّا" بمعنی

"اِلَّا" ہے اور یہ حصر کے لیے ہے۔

﴿فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ۝۵﴾

انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟

تیسویں پارے میں زیادہ تر مضامین کا تعلق قیامت اور معاد کے ساتھ ہے۔ مشرکینِ مکہ کو خطاب ہے جو قیامت کے منکر تھے۔ یہاں ان کو یہ بات سمجھائی ہے کہ تم قیامت کے منکر ہو کہ انسان دوبارہ کیسے بنے گا؟ ہڈیوں میں جان کیسے آئے گی؟ گوشت کیسے چڑھے گا؟ تم نے دیکھا ہے کہ پانی کے نطفے سے اللہ اتنا بڑا انسان بناتا ہے تو بنے ہوئے انسان کو دوبارہ بنانا کیا مشکل ہے۔

صلب اور ترائب کا معنیٰ:

﴿خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ۝۶ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ۝۷﴾

انسان اس پانی سے پیدا ہوا ہے جو ٹپکنے والا ہے جو پشت اور سینے سے نکلتا ہے۔

یہ پشت اور سینے سے مراد کیا ہے؟ کیا واقعتاً پشت اور سینہ ہے یا پورا جسم پشت اور سینے سے کنایہ ہے؟ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ جب بھی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں اور والد دونوں کا پانی ملتا ہے تو بچہ پیدا ہوتا ہے، والد کا پانی کمر سے آتا ہے اور ماں کا پانی سینے سے آتا ہے، اس لیے "مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ" فرمادیا۔

لیکن بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ایسا نہیں بلکہ انسان جس نطفے سے پیدا ہوتا ہے وہ نطفہ انسان کے پورے جسم سے بنتا ہے تو نطفے کا وہ حصہ جو سر سے نکلا ہے اس سے سر بنتا ہے، نطفے کا وہ حصے جو پاؤں سے نکلا ہے اس سے پاؤں بنتا ہے، نطفے کا وہ حصہ جو ہاتھ سے نکلا ہے اس سے ہاتھ بنتا ہے تو جمیع اجزائے بدن نطفہ سے بنتے ہیں لیکن انسان کے پورے جسم میں اہم ترین حصے دو ہی ہیں؛ یا انسان کے سامنے کا حصہ یا انسان

کے پیچھے کا حصہ، تو سامنے والے حصے کو سینے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پیچھے والے حصے کو کمر سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کریم کا جو ظاہر ہے وہ یہ نہیں بتا رہا کہ مرد کی پشت اور عورت کا سینہ ہوتا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ اس سے مرد کی پشت اور عورت کا سینہ مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ پورے جسم سے نطفہ پیدا ہوتا ہے۔

﴿اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝۸ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝۹﴾

وہ اللہ جو اس طرح انسان کو پیدا کر سکتا ہے وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوبارہ وہ دن کون سا ہو گا؟ فرمایا: جس دن تمام مخفی چیزوں کو کھول دیا جائے گا۔

عقائد کا تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے، آدمی زبان سے کلمہ پڑھے لیکن دل میں کفر ہو تو قیامت کے دن یہ کفر کھول دیا جائے گا۔ آدمی کسی سے بہت اچھا تعلق رکھے لیکن اندر سے جڑیں کاٹتا ہو تو قیامت کے دن یہ راز کھل جائے گا۔ آدمی کسی کے ساتھ فساد کرتا ہو اور صورت اصلاح کی ہو تو قیامت کے دن یہ راز کھلے گا۔ تو وہ چیزیں جو دنیا میں انسان چھپا رہا ہے اور پردے ڈال رہا ہے قیامت کو ساری کھول دی جائیں گی۔ اس لیے اللہ ہم کی حفاظت فرمائے۔

کبھی بھی کسی انسان سے منافقانہ تعلق نہیں ہونا چاہیے اور دھوکے سے بچنا چاہیے۔ انسان دنیا میں دھوکہ دے سکتا ہے قیامت میں دھوکہ کیسے دے گا؟ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔

﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝۱۰﴾

اور قیامت کا دن ایسا ہو گا کہ نہ انسان کے پاس طاقت ہو گی کہ اللہ کے عذاب سے بچ سکے اور نہ اس کو کوئی بچانے والا کوئی دوسرا مددگار ہو گا۔ آدمی جب بھی مصیبت سے بچتا ہے تو اس کے بچنے کی دو ہی صورتیں ہیں؛ یا اپنے پاس طاقت موجود ہو یا اس کے پاس معاون ہو۔ قیامت کے دن دونوں صورتیں نہیں ہوں گی۔

امکانِ قیامت اور وقوعِ قیامت:

﴿وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾﴾

قسم ہے آسمان کی جس سے مسلسل بارش برستی ہے اور قسم ہے زمین کی کہ جب بیج زمین سے نکلتا ہے تو زمین پھٹ جاتی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھیں کہ ایک ہے قیامت کا وقوع اور ایک ہے قیامت کا امکان۔ جہاں تک تعلق ہے امکانِ قیامت کا تو اس کا رد منکرین کے پاس کچھ بھی نہیں کہ قیامت واقع ہونا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان آیات میں اللہ نے امکانِ قیامت پر دلیل دی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ آسمان سے بارش برسا سکتا ہے اور بیج کو زمین پھاڑ کر نکال سکتا ہے؛ جب یہ ساری باتیں ہو سکتی ہیں تو اللہ دوبارہ انسان کو پیدا کر کے قیامت کیوں نہیں برپا کر سکتا؟! امکانِ قیامت پر بہت سارے دلائل ہیں، یہ امکانِ قیامت کی ایسی عقلی دلیل ہے کہ کوئی عقل مند اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ ضد کا کوئی علاج نہیں۔

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾﴾

یہ جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یہ ایسا کلام ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتا ہے، یہ فضول کتاب نہیں ہے۔

یہ وقوعِ قیامت کی دلیل ہے۔ کیوں کہ وقوعِ قیامت کی بات کرنے والا خود قرآن کریم ہے اور قرآن کریم قول فاصل ہے حق اور باطل کے درمیان اور اس کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ تو قرآن کریم کا قول فصل ہونا وقوعِ قیامت کی دلیل ہے کہ قیامت ضرور واقع ہو گی۔

کافروں کو مہلت:

﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾﴾

یہ کافر پھر بھی آپ کے خلاف تدابیر اختیار کرتے ہیں تو ہم بھی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ ''کَیْدًا'' سے مراد ہمیشہ بری تدبیر نہیں ہوتی بلکہ مطلق تدبیر کو بھی ''کَیْدًا'' کہتے ہیں۔ تو وہ بھی تدبیریں کرتے ہیں اور ہم بھی تدبیریں کرتے ہیں۔

﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾﴾

آپ کچھ وقت کے لیے ان کو مہلت دیں۔

لیکن وہ مہلت کا معنی یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کو عذاب نہیں ہو گا، یہ تو ہماری طرف سے ڈھیل ہے جس کو یہ لوگ ہمارا کرم سمجھیں اور جب گرفت کا وقت آئے گا تو ان کو کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الاعلیٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪﴿۳﴾﴾

سجدوں کی تسبیح:

جب یہ سورت مبارکہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِجۡعَلُوۡهَا فِیۡ سُجُوۡدِكُمۡ.[80]

"سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡأَعۡلٰی" کو اپنے سجدے میں پڑھا کرو، اور احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جب سورۃ الاعلیٰ پڑھیں اور حالت نماز میں نہ ہوں تو پھر یہ کہنا چاہیے "سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡلٰی"۔ سارے ایک بار پڑھ لیں۔ اگر نماز میں ہوں تو پھر نہ پڑھیں۔

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾﴾

تم تسبیح بیان کرو اپنے رب کی جو بہت اعلیٰ ہے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جیسے ہم کہتے ہیں اسمِ ذات یک ضربی اللہ.. اللہ.. یہ آیت اس پر مستقل دلیل ہے۔ کیونکہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا "سَبِّحۡ رَبَّكَ الۡاَعۡلٰی" کہ تسبیح بیان کرو اپنے رب کی جو بہت اعلیٰ ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ تسبیح بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت اعلیٰ ہے اور نام کیا ہے؛ "اللہ"... تو قرآن کریم کی آیت سے اللہ کا نام جو اسمِ ذات ہے اس کا ذکر کرنا ثابت ہے۔

"سَبِّحۡ" کا معنی کیا ہوتا ہے؟ سَبَّحَ، یُسَبِّحُ، تَسۡبِیۡحًا تسبیح پڑھنا اور اسمِ

80۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج7 ص157 رقم الحدیث 14303

ذات کیا ہے؛ اللہ... اس لیے فرمایا کہ تم تسبیح بیان کرو اپنے رب کے نام کی۔ اللہ اللہ کرنا قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے۔

﴿الَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ‏ وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ‏﴾

جس رب نے پیدا کیا یعنی تمہیں عدم سے وجود میں لایا، پھر مناسب انداز سے بنایا جس کو جیسے بنانا چاہیے اسے ویسے بنایا، پھر ہر چیز کے مناسب کچھ چیزیں تجویز فرمائیں، پھر ان چیزوں کی طرف اس کی رہنمائی بھی فرمائی۔

یہاں اللہ نے چار صفتیں بیان فرمائی ہیں: خَلَقَ، فَسَوّٰى، قَدَّرَ، فَهَدٰى۔ کیسی پیاری ترتیب قائم فرمائی ہے!

خالق اور مُوجد میں فرق:

فرمایا: اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ خلق کا معنی ہوتا ہے عدم سے وجود میں لانا اور موجود کو نیا ڈیزائن دینے کو ایجاد کہتے ہیں۔ دنیا میں تمام چیزوں کا خالق اللہ ہے اور موجد انسان ہے۔ یہ ہمارے سامنے گھڑی ہے، یہ لوہے سے بنی ہے، تو لوہے کا خالق اللہ ہے لیکن یہ جو گھڑی کی موجودہ صورت ہے اس کا موجد کون ہے؟ انسان۔ تو خالق ہر چیز کا اللہ ہے اور موجد انسان ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجد کچھ وقت کے لیے مالک ہوتا ہے، جب اس چیز کو فروخت کر دے تو اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور خالق ہمیشہ ہر چیز کا مالک ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارا خالق اللہ ہے تو موت تک ہمارے وجود کا مالک بھی اللہ ہے، انسان کا موجد تو دنیا میں کوئی نہیں ہے، انسان کے علاوہ باقی چیزوں کا خالق اللہ ہے اور موجد انسان ہے۔ وہ جب چیز کو فروخت کرتا ہے تو اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے لیکن اللہ کا حقِ ملکیت ختم نہیں ہوتا، اللہ اپنی مخلوق میں جو فیصلے چاہیں صادر فرمائیں۔

یہ دلیل اچھی طرح سمجھنا! خودکشی کرنا حرام ہے۔ خودکشی اس لیے حرام

ہے کہ جسم کا مالک انسان خود نہیں ہے اس کو ضائع نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کی مِلک میں دخل دے رہا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ دلیل اس کی اللہ کا خالق ہونا ہے۔

﴿فَسَوّٰى﴾.. پھر اللہ رب العزت نے مناسب انداز میں پیدا فرمایا۔ مثلاً جیسے اونٹ بنانا چاہیے اس کو ویسے بنایا، جیسا انسان بنانا چاہیے اس کو ویسا بنایا، جس طرح دوسرے جانوروں کو بنانا چاہیے ان کو بنایا۔ تو جس چیز کی جیسے بنانی چاہیے اللہ پاک نے ویسی شکل بنائی۔

﴿قَدَّرَ﴾.. پھر اللہ نے ہر جاندار کے مناسب چیزوں کو تجویز فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے مناسب ہے کہ گندم کھائے، جانور کے لیے مناسب ہے کہ گھاس کھائے تو جس کے لیے جو چیز مناسب تھی اللہ نے اس کے لیے وہ تجویز فرمائی۔

﴿فَهَدٰى﴾.. پھر اس کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ مثلاً انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی کہ خود اس کی طرف چلتا ہے۔ بچے کے لیے دودھ مناسب ہے تو اللہ پاک نے دودھ پیدا فرمایا اور دودھ کے لیے کچھ کہنا نہیں پڑتا بچہ از خود دودھ کا مطالبہ کرتا ہے۔ انسان کے لیے مناسب ہے پانی تو پانی کے لیے اس کو کہنا نہیں پڑتا خود بخود اس کی طلب ہوتی ہے۔ اگر سردی ہو تو سردی میں انسان کے مناسب کیا ہے؛ چادر، جرسی کوئی اور چیز اب یہ کہنا نہیں پڑتا بلکہ انسان کی طبیعت میں ہے کہ یہ خود بخود ان چیزوں کو تلاش کرتا ہے۔ یہ معنی ہے "فَهَدٰى" کا۔

﴿وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝۵﴾

اور جس نے زمین سے گھاس اگایا ہے، پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا بنا دیا۔

گھاس شروع میں چھوٹا ہوتا ہے پھر بڑا ہوتا ہے، پھر کٹ جاتا ہے، پھر ریزہ ریزہ ہو جاتا

ہے۔ یہ قیامت کے احوال بتائے ہیں کہ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے، پھر اسے چیزیں ملتی ہیں، پھر کھاتا پیتا ہے، پھر عمر گذار کر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے گھاس ہے کہ پہلے پیدا ہوتا ہے پھر بڑا ہو کر سر سبز ہوتا ہے پھر زرد ہو جاتا ہے، پھر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حالت تمہاری ہے کہ انسان نطفے سے لے کر بڑھاپے تک کے کئی مراحل سے گزرتا ہے، پھر اس کا دنیا میں وجود ہی نظر نہیں آتا۔

نسخ کی چند صورتیں:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ﴿٦﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى ؕ﴿٧﴾﴾

ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ بھولیں گے نہیں، ہاں جو اللہ چاہے کہ بھول جائیں وہ تو بھول جائیں گے۔ نسخ کی ایک صورت ہے بھول جانا۔ فرمایا:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾[81]

ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر آیت لاتے ہیں یا اس جیسی لاتے ہیں۔ نسخ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ بھلا دیتے ہیں اور بسا اوقات ایک آیت کے بدلے میں دوسری آیت لے آتے ہیں۔

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جانتے ہیں جو ظاہر ہیں اور جو مخفی ہیں۔

پہلے عادت، پھر عبادت:

﴿وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۚ﴿٨﴾﴾

یہ آیت بہت سمجھنے والی ہے۔ یہاں "الْيُسْرٰى" سے مراد ہے آسان

81۔ البقرة 106:2

شریعت۔ بظاہر یوں ہونا چاہیے تھا "نُيَسِّرُ لَكَ الْيُسْرٰى" کہ ہم آپ کے لیے شریعت کو بہت آسان کر دیں گے جس پر آپ آرام سے چل سکیں گے لیکن فرمایا کیا؟ کہ ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ کہ ہم آپ کو آسان کر دیں گے شریعت کے لیے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم آپ کی طبیعت میں شریعت پر چلنا بنا دیں گے، شریعت پر چلنے میں آپ کو دقت محسوس نہیں ہو گی، آپ کے مزاج کو شریعت بنا دیں گے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جب انسان اعمال کرتا ہے تو شروع میں ریا ہوتی ہے، اس کے بعد عادت بنتی ہے، اس کے بعد عبادت بنتی ہے۔ جب یہ جملہ میں نے سنا تو مجھے بھی سمجھ نہیں آتا تھا لیکن ایک وقت آیا کہ پھر سمجھ میں آیا۔ اس لیے میں بسا اوقات سبق میں چھوٹے طلبہ کو بھی بٹھا دیتا ہوں کہ بعض باتیں سمجھ نہیں آئیں گی لیکن یاد ہو جائیں گی اور ایک وقت آئے گا سمجھ بھی آئیں گی۔

حضرت کے اس جملے کا معنی سمجھو! اب ایک طالب علم چھوٹا ہوتا ہے، حفظ کا پھر متوسطہ کا پھر اولیٰ کا، اب تہجد پڑھنے کو اس کا دل نہیں کرتا لیکن پھر بھی پڑھ لیتا ہے اللہ کے لیے یا استاد جی کے لیے؟ استاد جی کے لیے پڑھتا ہے تو یہ ریا ہے۔ ہمارے ہاں ریا کا مفہوم خاص ہے کہ آدمی دکھاوے کے لیے پڑھے یا شہرت کے لیے پڑھے حالانکہ ریا کے مفہوم میں وسعت ہے۔ دکھاوے کا ایک معنی شہرت ہے اور دکھاوے کا ایک معنی شہرت تو نہیں لیکن خوف ہے کہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ نماز پڑھی ہے۔ بسا اوقات چھوٹے بچوں کا وضو بھی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی پڑھتے ہیں۔

یہ اعمال شروع میں کیا ہیں؟ ریا ہے۔ اس کے بعد عادت، عادت کا معنی کہ انسان بہت سارا وقت نماز میں ایسا گزارتا ہے کہ اس کے ذہن میں قیامت کا استحضار بھی نہیں ہوتا، جنت اور جہنم کا استحضار بھی بوقت عبادت نہیں ہوتا، بس وہ روٹین سے چل رہا ہوتا ہے کہ نماز بھی پڑھنی ہے، تہجد بھی پڑھنی ہے، تلاوت بھی کرنی ہے۔ اب

دیکھیں! جو آپ اسباق پڑھتے ہیں ان کا پڑھنا باعثِ اجر ہے، باعثِ ثواب ہے، اس پر اللہ راضی ہوتے ہیں، قیامت کے بعد جنت ملتی ہے لیکن کوئی طالب علم صَرف پڑھ رہا ہو، کوئی نحو پڑھ رہا ہو تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتا کہ میں صَرف و نحو پڑھ رہا ہوں اور اس سے قرآن سمجھ میں آئے گا اور ثواب ملے گا لیکن بس وہ پڑھ رہا ہوتا ہے، یہ اس کی عادت بنی ہوئی ہوتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ ردِ فِرَقِ باطلہ پر کوئی کتاب پڑھنے کو بھی عبادت سمجھتا ہے کہ اس سے مقصود دشمن کا رد ہے۔

ردِ فِرَق باطلہ ایک مشکل کام ہے:

حضرت مولانا حیات رحمہ اللہ فاتح قادیان یہاں چوکیرہ میں بھی رہے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ مرزائیت پر سب سے بڑے مناظر رہے ہیں۔ حضرت نے ایک مرتبہ بنیان پہنی ہوئی ہے اور نیچے لنگی باندھی ہوئی ہے، سخت گرمی میں پسینہ بہہ رہا ہے اور چاروں طرف مرزے کی کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔ امیر شریعت رحمہ اللہ یا کوئی اور تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ اس پر حضرت مولانا حیات رحمہ اللہ نے کہا کہ حضرت! کیا پڑھنا ہے، لوگ قرآن پڑھتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اور میں ہر وقت مرزے کی گالیاں پڑھتا ہوں، ہر وقت اس کے گند کو کھولے بیٹھا ہوں، مجھے تو اپنی زندگی بھی عجیب لگتی ہے۔ فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن پڑھنے سے بھی زیادہ اجر دے گا! یہ کتنا مشکل ہے امت کے ایمان کو بچانے کے لیے ایسی باتیں پڑھنا جن کو پڑھنے کے لیے دل بھی تیار نہیں ہو رہا۔ یہ اتنا مشکل کام ہے! اس پر اللہ کی طرف سے بہت مقبولیت ملتی ہے۔

تو خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اعمال پہلے ریا.. پھر عادت.. پھر عبادت.. بڑی دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ اللہ انسان کی طبیعت کو ایسا بناتا ہے کہ شریعت پر عمل کرنے میں اس کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ ظہر کا وقت

ہے اور گرمی بہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال سے فرماتے ہیں: ”یَا بِلَالُ أَرِحْنَا“ ہمیں اذان سے راحت پہنچاؤ۔[82]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے راحت ملتی ہے۔

دیکھیں! آج ایک وقت ہے، جوانی کی مستی ہوتی ہے، آدمی دوپہر کو سوتا ہے استاد بھی اٹھائیں تو اٹھنے کو دل نہیں کرتا لیکن آپ اس کو برداشت کریں! ایک وقت آئے گا کہ آپ ظہر پڑھ کر عصر کا انتظار کریں گے کہ اذان کب ہو اور میں عصر کی نماز پڑھوں، کب تہجد کا وقت ہو کہ میں اٹھ جاؤں! اللہ سب کو یہ چیزیں عطا فرمائے۔

نصیحت مؤمنین کے لیے سود مند:

﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹﴾

اگر نصیحت کا فائدہ ہے تو آپ نصیحت کرتے رہیں۔

یہاں ”اِنْ“ شرط کے لیے نہیں ہے کہ اگر نصیحت کا فائدہ ہو تو نصیحت کریں اور نہ ہو تو نہ کریں، ایسا نہیں ہے، یہ محاورات ہیں۔ جس طرح ہم کہتے ہیں: بھائی! اگر تم طالب علم ہو تو تمہیں یہ کام کرنا چاہیے، اگر تم انسان ہو تو بات سمجھو! اب اس میں کوئی شک ہے کہ مخاطب انسان نہیں ہے؟ یہ صرف یاددہانی ہوتی ہے، اس میں شرط مقصود نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ نصیحت تو ہوتی ہی نفع کے لیے ہے یعنی اے پیغمبر! اگر نصیحت کا فائدہ ہے تو آپ کرتے رہیں یعنی آپ نصیحت کرتے رہیں نصیحت کا فائدہ ہوتا ہے۔

﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝۱۱ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ

82۔ مسند احمد: ج16 ص519 رقم الحدیث 22982، وغیرہ

الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾

لیکن نصیحت سے فائدہ وہی حاصل کرتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ بدبخت آدمی نصیحت سے دوڑتا ہے۔ بدبخت وہ شخص ہے جو جہنم میں داخل ہوگا جو بہت بڑی آگ ہے۔ "النَّارَ الْكُبْرٰى" دنیا کی آگ چھوٹی ہے اور جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے بڑی ہے۔ یہ بندہ نہ اس میں مرے گا نہ اس میں زندہ رہے گا۔ "مرے گا نہیں" یہ بات تو سمجھ آتی ہے لیکن "زندہ نہیں رہے گا" اس کا مطلب کیا ہے؟ "لَا يَحْيٰى" کا معنی یہ ہے کہ راحت کے ساتھ زندہ نہیں رہے گا، موت تو آئے گی نہیں اور زندہ بھی نہیں رہے گا، مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی راحت والی نہیں ہوگی، وہ موت سے بدتر زندگی ہوگی۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

تزکیہ نفس کامیابی کا ذریعہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾﴾

وہ شخص کامیاب ہے جس نے اپنی اصلاح کر لی اور اپنے رب کے نام کو یاد کیا۔

اب دیکھو! یہاں یہ نہیں آیا کہ جس نے اپنے رب کو یاد کیا بلکہ آرہا ہے "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى" کہ اپنے رب کے نام کو یاد کیا۔ اس سے اللہ اللہ کا ذکر سمجھ آتا ہے۔ کتنی قرآنی آیات ہیں جن سے اللہ کے نام کا ذکر ثابت ہے۔ بعض لوگ پھر بھی کہتے ہیں کہ اللہ اللہ کرنا بدعت ہے۔

قرآن سے اللہ اللہ کا ثبوت:

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں۔ میں کئی بار کہتا ہوں کہ میرے بہت سارے تعجبات ہوتے ہیں۔ مجھے اس پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ جب ہم کہیں گے کہ

بھائی ذکر کرو! تو فوراً سوال ہوتا ہے کہ اللہ اللہ کہاں سے ثابت ہے؟ ہم نے کہا: ہمارے مشائخ کرتے ہیں، ہمارے بزرگ کرتے ہیں۔ بزرگ کیا ہوتے ہیں؟ قرآن پیش کرو! ہم نے قرآن پیش کیا: ﴿وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ کہ وہ شخص کامیاب ہے جس نے اپنے رب کا نام لیا۔ کہتا ہے: اس کے تحت کس نے لکھا ہے کہ اس سے مراد اللہ کا ذکر ہے؟ ہم نے کہا: پھر بزرگ آ گئے! جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بزرگ ذکر کرتے ہیں تو تم نے کہا کہ آیت پیش کرو! جب ہم نے آیت پیش کی ہے تو اب کہتے ہو کہ اس کا معنی کس بزرگ نے کیا ہے؟ تعجب والی بات ہے! میں اسی لیے کہتا ہوں کہ جب گفتگو ہوتی ہے تو ایک بنیاد بناؤ۔

جب یہ لوگ دلیل میں امامِ حرمین پیش کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ طے کرو کہ دلیل میں امامِ حرمین ہو گا بس! پھر جب ہم امامِ حرم کے مسئلے ان کے خلاف پیش کرتے ہیں تو پھر کہتے ہیں کہ ہم ان کے مقلد ہیں؟ ہم نے کوئی ان کا کلمہ پڑھا ہے؟ اس لیے کہتا ہوں کہ ایک بات طے کرو؛ یا دلائل طے کرو یا شخصیات طے کرو۔

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝۱۷﴾

لیکن تم لوگ ایسے ہو کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی بھی رہے گی۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾[83]

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ کان تمہارے پاس ہے اس نے ختم ہو جانا ہے اور اس سے جو تم نے نیک بات سنی ہے وہ اللہ کے پاس چلی گئی اُس نے باقی رہنا

83۔ النحل 96:16

ہے۔ آنکھ تمہارے پاس ہے اس نے ختم ہو جانا ہے اور اس سے جو تم نے صحیح دیکھا ہے وہ اللہ کے پاس ہے اُس نے باقی رہنا ہے۔ زبان تمہارے پاس ہے اس نے ختم ہو جانا ہے اور تم نے اس سے جو نیک بات کی ہے، قرآن پڑھا ہے، درود شریف پڑھا ہے؛ وہ باقی رہے گا۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝١٨ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۝١٩﴾

یہ مضمون صرف قرآن میں نہیں ہے بلکہ پہلے صحیفوں میں بھی ہے، وہ پہلے صحیفے یعنی ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے صحیفے عطا فرمائے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے پہلے دس صحیفے عطا فرمائے اور بعد میں تورات عطا فرمائی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الغاشیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱﴾

کیا آپ کے پاس اس واقعے کی خبر آئی ہے جو سب کو ڈھانپ لے گا۔ اس واقعے سے مراد قیامت ہے۔

مشقت برداشت کریں لیکن اللہ کے دین کے لیے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴﴾

جس دن بعض چہرے ذلیل اور رسوا ہوں گے۔ محنت کر کر کے تھکے ہوں گے اور گرم آگ میں داخل ہوں گے۔

"محنت کر کر کے تھکے ہوں گے" اس کا کیا معنی ہے؟ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝۶﴾[84]

اے انسان! تُو نے مشقت اٹھاتے اٹھاتے اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔

تو ہر آدمی نے مشقت برداشت کرتے کرتے اللہ کے پاس جانا ہے۔ اگر

84۔ الانشقاق 6:84

بندے نے مشقت میں نیک کام کیے ہوں گے تو بدلہ اچھا ملے گا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۟ۙ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۟ۙ﴾[85]

اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا اور حساب آسان ہو گا، اور اگر مشقت اٹھائی ہو گی لیکن گناہوں میں اور اللہ کی نافرمانی میں تو بدلہ برا ہو گا:

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۟ۙ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۟ۙ﴾[86]

نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت بندہ موت کو پکارے گا۔

اللہ نے یہاں "عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ" میں یہ بات سمجھائی کہ مشقت تو ہر بندہ برداشت کرتا ہے مثلاً ایک شخص نکاح کرتا ہے تو پیسے خرچ کرتا ہے، اب مشقت اس نے بھی کی ہے اور ایک بندہ زنا کرتا ہے اور پیسے خرچ کرتا ہے تو مشقت اس نے بھی کی ہے لیکن جنہوں نے خدا کی نافرمانی میں مشقت اٹھائی تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے چہروں پر ذلت اور رسوائی چھائی ہو گی۔ یہ لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ محنت بھی کی لیکن خدا کی رضا کو نہ پاسکے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

حضرت عمر اور عیسائی راہب:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ملک شام میں گئے۔ آپ سے ملنے کے لیے ایک عیسائی راہب آیا۔ اپنے مذہب کی عبادات، ریاضت اور محنت و مشقت کی وجہ سے اس کا چہرہ سوکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو رو پڑے۔ کسی نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ کیوں روتے ہیں؟ فرمایا کہ اس کا چہرہ دیکھتا ہوں کہ اس نے کتنی

85۔ الانشقاق 84:7،8

86۔ الانشقاق 84:10،11

محنت و مشقت کی لیکن اللہ کو پھر بھی راضی نہ کر سکا! کیوں کہ اس کا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے، عیسائی ہے، عقائد کو بنیادی دخل ہے اعمال کے قبول ہونے میں۔ اس لیے پوری دنیا میں ہماری تحریک کی بنیاد عقائد ہیں، عقائد میں خلل آ گیا تو اعمال قبول ہوں گے ہی نہیں اور عقائد ٹھیک ہو گئے تو پھر اللہ سے بہت امید ہوتی ہے بخشش کی۔

نیک اعمال کا بدلہ اچھا ہے اور برے اعمال کا بدلہ برا ہے۔ جیسا انسان عمل کرتا ہے اسی کے مطابق انسان کو جزا اور سزا ملتی ہے۔ جو شخص دنیا میں اللہ کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے اللہ قیامت کے دن اس کو عزت دے گا اور جو دنیا میں اللہ کے لیے مشقت برداشت نہیں کرتا تو اللہ قیامت کے دن اس کو ذلیل کر دیں گے۔ اس لیے آدمی اللہ کے لیے مشقت برداشت کرے، اللہ کے لیے باتیں سنے، اللہ کے لیے مار کھائے، اللہ کے لیے تکلیف برداشت کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کی رسوائی سے محفوظ فرمائیں گے۔

﴿نَارًا حَامِيَةً﴾... اس آگ کی صفت "حَامِيَةً" بیان کی ہے جس کا معنی ہے؛ گرم۔ آگ تو ویسے بھی گرم ہوتی ہے پھر اس کو "حَامِيَةً" کیوں فرمایا؟ دراصل اس میں اس آگ کی گرمی کے تسلسل کو بیان کیا ہے کہ یہ آگ ایسی ہو گی جو مسلسل گرم رہے گی، اس کی گرمی میں کمی نہیں آئے گی۔

جہنمیوں کی خوراک؛ گرم پانی اور ضریع

﴿تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝٥ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝٦﴾

کھولتے اور ابلتے ہوئے چشموں سے ان کو پانی پلایا جائے گا۔ قیامت کے دن جو ان کو کھانے کے طور پر ملے گا وہ کانٹے دار جھاڑیاں ہوں گی۔

یہاں سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اہلِ جہنم کے لیے اور کھانے بھی ہیں، کسی جگہ پر ہے کہ ان کو زقوم دیا جائے گا، کسی جگہ ہے کہ ان کو غسلین دیا جائے گا لیکن

یہاں حصر کے ساتھ فرمایا کہ ان کا کھانا صرف ضریع ہو گا، کانٹے دار جھاڑیاں ہی ملیں گی۔ تو باقی مقامات پر تو اور کھانے بھی ثابت ہیں تو یہاں حصر کے ساتھ کیوں فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر یہ مقصود نہیں ہے کہ ضریع کے علاوہ ان کو کوئی اور کھانا نہیں ملے گا بلکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ لذت والا اور فائدہ بخش کھانا ان کو کوئی نہیں ملے گا، جو ملے گا وہ نقصان دہ ہی ہو گا جس طرح کہ ضریع ہے۔ تو یہ بطور مثال بیان فرمایا۔

اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے مختلف درجات ہیں، بعض درجات میں ضریع ملے گا اور بعض میں زقوم ملے گا اور بعض میں غسلین ملے گا۔

دوسرا اس پر سوال یہ ہے کہ جہنم تو آگ کا نام ہے اور آگ تو ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی ہے تو وہاں یہ کانٹوں والے درخت کیسے پیدا ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو اللہ کی قدرت ہے، ہو سکتا ہے کہ اس درخت کی خوراک اللہ آگ ہی بنا دے کہ یہ آگ ہی کی وجہ سے زندہ رہے، یہ تو اللہ کا نظام ہے کہ وہ کسی چیز کی خوراک کیا بناتے ہیں۔

﴿لَّا یُسۡمِنُ وَ لَا یُغۡنِیۡ مِنۡ جُوۡعٍ ؕ﴿۷﴾﴾

نہ اس کھانے سے موٹے تازے ہوں گے اور نہ ہی اس کھانے کی وجہ سے ان کی بھوک ختم ہو گی۔

جنت کی نعمتیں:

﴿وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ ۙ﴿۸﴾ لِّسَعۡیِہَا رَاضِیَۃٌ ۙ﴿۹﴾ فِیۡ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ ۙ﴿۱۰﴾ لَّا تَسۡمَعُ فِیۡہَا لَاغِیَۃً ؕ﴿۱۱﴾﴾

اب یہاں سے جنتیوں کی صفتیں بیان ہو رہی ہیں۔ فرمایا: قیامت کے دن کئی

چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنی محنت پر خوش ہوں گے۔ وہ بلند جنت میں ہوں گے۔ وہاں کوئی لغو اور بے ہودہ بات نہیں سنیں گے۔

مفسرین نے لکھا ہے جنت کی خوبی ہے کہ وہاں شور نہیں ہو گا کیونکہ شور ہونے سے بندے کو تکلیف ہوتی ہے۔

﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝١٢ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝١٣ وَّ أَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۝١٤ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝١٥ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ۝١٦﴾

اس میں چشمے بہتے ہوں گے اور وہاں اونچے اونچے تخت ہوں گے اور پیالے ترتیب سے رکھے ہوں گے اور گاؤ تکیے بچھے ہوں گے اور قالین بچھائے ہوں گے۔

میزبانی کے آداب:

یہ جو ساری باتیں بتائی ہیں میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اللہ رب العزت نے آداب بتائے ہیں کہ جنت میں پینے کے لیے پیالے ترتیب سے رکھے ہوں گے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں پانی پینے کے لیے جگہ ہو وہاں گلاس بھی ہوں، اور استعمال کی وہ چیزیں جو انسان کی ضرورت ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ رکھنا یہ آدابِ معاشرت ہے، اور یہ جنت کی صفات میں سے اللہ نے ایک صفت بیان کی ہے کیونکہ جنت؛ اللہ کی طرف سے اہلِ جنت کے لیے مہمان خانہ ہے: ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝٣٢﴾ [87]

مہمان خانے اور جیل خانے میں فرق:

قرآن کریم نے جو جنت اور جہنم کا ذکر کیا ہے تو یوں فرمایا:

87۔ حٰم السجدۃ 32:41

﴿وَ سِيۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا﴾[88]

کفار کو جہنم کی طرف کھینچا جائے گا، جب کفار جہنم کے قریب آئیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

اور جنت کے بارے میں یوں فرمایا:

﴿وَ سِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَـنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا﴾[89]

﴿وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا﴾ میں واؤ حالیہ ہے یعنی جب اہل جنت آئیں گے تو دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔

اس لیے کہ مہمان کے آنے سے پہلے مہمان خانے کا دروازہ کھلا ہونا یہ قرآن کریم نے ادب بتایا ہے۔ مہمان کھڑا ہو اور تم چابی تلاش کر رہے ہو، دروازہ اسی وقت کھل رہا ہو تو بتاؤ یہ مہمان خانہ ہے یا جیل خانہ ہے؟ جیل کا ماحول یہ ہے کہ جب قیدی آتا ہے اس وقت دروازہ بند ہوتا ہے، چابی لائی جاتی ہے اور دروازہ کھلتا ہے، قیدی کو اندر کرتے ہیں اور پھر دروازہ بند کیا جاتا ہے۔ تو مہمان خانوں کو مہمان خانہ بناؤ، مہمان خانہ کو جیل خانہ نہ بناؤ! مہمان خانہ مہمان کے آنے سے پہلے کھلا ہو، مہمان کی ضرورت مہمان کے آنے سے پہلے موجود ہو، مہمان کو کہنا پڑے کہ بھائی! چائے لاؤ... پانی لاؤ... بھائی! ٹشو مل جائے گا... تو یہ کون سی مہمان نوازی ہے؟ اس لیے مہمان کے آنے سے پہلے اس کی ضروریات کا انتظام کر لینا چاہیے۔

88۔ الزمر 71:39

89۔ الزمر 73:39

اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین:

﴿اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ۝۱۷ وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ۝۱۸ وَ اِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ۝۱۹ وَ اِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ ۝۲۰﴾

یہ لوگ چونکہ قیامت کے منکر تھے تو ان کو ان کے ماحول کی چیزیں ذکر کر کے یہ بات سمجھائی کہ اللہ کے لیے قیامت کو برپا کرنا کیا مشکل ہے؟! فرمایا: کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اسے کیسے بنایا ہے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اسے کس طرح بلند فرمایا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح اسے زمین میں گاڑ دیا ہے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے کس طرح اس کو بچھا دیا ہے۔

یہ چار چیزیں اللہ نے اس لیے ذکر فرمائی ہیں کہ عرب کے ہاں جنگلات یا پہاڑ یا پھر اونٹ ہوتے تھے، سامنے دیکھیں تو اونٹ ہے، اوپر دیکھیں تو آسمان ہے، نیچے دیکھیں تو زمین ہے، دائیں بائیں دیکھیں تو پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اپنے ارد گرد کا ماحول دیکھو! جب یہ سب کچھ اللہ بنا سکتا ہے تو پھر قیامت برپا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟

اور بطورِ خاص اللہ نے اونٹ کا ذکر کیا، عجیب اللہ پاک کا کرم ہے۔ عرب کے علاقے میں ہاتھی ہوتے تو ان کے لیے پالنا مشکل ہوتا اور اونٹ کو پالنا بہت آسان ہوتا ہے، ایک تو اونٹ اپنی خوراک خود لیتا ہے، درخت ہو تو تمہیں کاٹنا نہیں پڑے گا اونٹ خود اس کے پتے کھائے گا، پتے نہیں ہوں گے تو ٹہنیاں کھائے گا، یہ اونٹ کی صفت ہے۔ عرب میں ریگستان ہیں پانی بہت کم ہوتا ہے، کہیں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا، اونٹ کے بدن میں اللہ نے اضافی ٹینکی رکھی ہے، اونٹ اتنا پانی پیتا ہے کہ ایک ہفتے سے بھی زیادہ اس پانی سے گزارہ کر سکتا ہے۔

پھر وہاں سفر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، گرمی بہت سخت ہوتی ہے اور خدا نے

اونٹ کی یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ شام سے لے کر صبح تک پوری رات سفر کر سکتا ہے، علاقہ ریگستان کا ہے جس پر چلنا مشکل ہے، اللہ نے عرب کو اونٹ دیے ہیں جن کے پاؤں کے نیچے ایسی چیز ہے جس سے ان کے لیے ریت پر چلنا بہت آسان ہے۔ پھر اونٹ اتنا بڑا جانور ہے کہ اس پر سوار ہونا بہت مشکل تھا، عام جانور اور انسان کو دیکھیں تو ان میں ایک گھٹنا ہوتا ہے لیکن اونٹ کی ٹانگ میں دو گھٹنے ہوتے ہیں، ایک آگے ہوتا ہے اور ایک پیچھے نکلا ہوا ہوتا ہے، اس پیچھے والے گھٹنے پر پاؤں رکھو اور اونٹ پر چڑھ جاؤ! سیڑھی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

پھر چلنے میں گرنے کا خطرہ ہوتا ہے تو اس کے لیے اللہ نے کوہان بنا دی ہے کہ اس کو پکڑ لو۔ اللہ تعالی نے کتنی آسانیاں پیدا فرمائی ہیں، اور اس کے مزاج میں اللہ تعالی نے ایسی اطاعت رکھی ہے کہ بچہ نہیں بلکہ پانچ سال کی بچی کو نکیل دے دو تو سو اونٹ اس کے پیچھے چلتے جائیں گے۔

منصبِ نبوت:

﴿فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن
تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ
إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾﴾

میرے پیغمبر! آپ نصیحت فرمائیں آپ کا کام نصیحت فرمانا ہے، آپ ان پر کوئی نگران تو مسلط نہیں ہیں کہ ان کی زیادہ فکر کریں۔ ہاں جو روگردانی کرتا ہے اور کفر اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ان سب نے ہمارے پاس ہی آنا ہے اور ہم نے ہی ان سب کا حساب لینا ہے۔

اللہ ہم سب کو آخرت کی فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الفجر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَ الۡفَجۡرِ ۝ وَ لَيَالٍ عَشۡرٍ ۝ وَّ الشَّفۡعِ وَ الۡوَتۡرِ ۝ وَ الَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ ۝﴾

فجر، دس راتوں، جفت اور طاق سے مراد:

﴿وَ الۡفَجۡرِ﴾.... قسم ہے فجر کی۔ اس فجر سے مراد ہر روز کی فجر ہے۔ جب ہر روز صبح صادق ہوتی ہے تو اللہ کی نئی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "الفجر" سے مراد خاص یوم النحر کی فجر ہے یعنی دس ذوالحجہ کی فجر۔ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ہر دن کی رات ہوتی ہے صرف یوم النحر ایک ایسا دن ہے جس کی کوئی رات نہیں ہے، یوم النحر ہوتا ہے دس ذوالحجہ کو اور یوم عرفہ ہے نو ذوالحجہ کو کہ جب عرفات کے میدان میں حاجی وقوف کرتا ہے، اسی کا نام اصل حج ہے، حج کا رکنِ اعظم یہی ہے۔ تو یومِ عرفہ نو ذوالحجہ کا دن ہے۔ اس سے پہلے کی رات یوم عرفہ کی رات ہے اور اس کے بعد کی رات یہ بھی یوم عرفہ کی رات ہے یعنی یوم عرفہ کی دو راتیں ہیں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر انسان یوم عرفہ کے دن کا کوئی وقت میدانِ عرفات میں گزارے تب بھی حج ہو گا اور اگر یوم عرفہ کا دن گزار کر اگلی جو رات ہے صبح صادق سے پہلے پہلے وہاں کچھ قیام کرے تب بھی حج ہو جائے گا۔ تو یومِ عرفہ سے پہلے کی رات بھی یومِ عرفہ کی رات ہے اور اس کے بعد کی رات بھی یوم عرفہ کی رات ہے۔ یوم النحر

ایک ایسا دن ہے جس کی کوئی رات نہیں ہے، اس لیے اس کی بطورِ خاص قسم کھائی ہے کہ "وَالْفَجْرِ" قسم ہے فجر کی۔

﴿وَ لَيَالٍ عَشْرٍ﴾... اور قسم ہے دس راتوں کی۔ عموماً مفسرین ان دس راتوں سے ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں مراد لیتے ہیں۔ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ بعض روایات میں ان کی ہر رات کی عبادت کا اجر لیلۃ القدر کے برابر بتایا گیا ہے اور ہر دن کا اجر سال کے روزوں کے برابر بتایا گیا ہے، اس سے اللہ پچھلی خطاؤں کو معاف فرماتے ہیں۔

﴿وَّ الشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ﴾... قسم ہے جفت اور طاق کی۔ جفت کہتے ہیں جوڑے کو اور طاق کہتے ہیں تنہا کو۔ اب یوم عرفہ؛ نو ذوالحجہ کو دیکھیں تو یہ طاق ہے اور یوم النحر؛ دس ذوالحجہ کو دیکھیں تو یہ جفت ہے، اس لیے بعض حضرات کہتے ہیں کہ نو ذوالحجہ اور دس ذوالحجہ کی قسمیں کھائی ہیں۔

﴿وَ الَّيْلِ اِذَا يَسْرِ﴾... اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔

﴿هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿٥﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں: کیا عقل والوں کے لیے یہ قسمیں کافی نہیں ہیں؟ کہ کتنی بڑی قسمیں ہم نے کھائی ہیں۔

"حِجْر" کا معنی ہوتا ہے "المنع" یعنی روکنا۔ چونکہ عقل انسان کو گناہوں سے اور گندی باتوں سے روکتی ہے اس لیے بسا اوقات عقل کو بھی حجر سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

قومِ عاد کا انجام:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿٧﴾﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یعنی قوم ارم کے ساتھ جو اونچے اونچے ستونوں والی قوم تھی۔

یہ عاد؛ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے سام تھے اور ان کے بیٹے ارم تھے اور ان کے بیٹے عاص تھے اور عاص کے بیٹے عاد تھے۔ تو عاد کا سلسلہ نسب یوں ہے: عاد بن عاص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔ ارم کے دو بیٹے تھے؛ ایک تو عاص تھے اور دوسرے بیٹے عابر تھے اور عابر کے بیٹے تھے ثمود یعنی ثمود بن عابر بن ارم۔ عاد اور ثمود دونوں ارم پر جا کر مل جاتے ہیں۔ عاد یہ عاص کے واسطے سے ارم میں جا کر مل جاتے ہیں اور ثمود، عابر کے واسطے سے ارم میں مل جاتے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِیْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ۝﴾... آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یعنی قوم ارم کے ساتھ۔

قومِ عاد دو ہیں: عادِ اولیٰ اور عاد اخریٰ۔ عادِ اولیٰ کون تھے؟ اور عاد اخریٰ کون تھے؟ نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے ہیں سام اور ان کے بیٹے ہیں ارم۔ پھر ان ارم کے بیٹے ہیں عاص اور ان کے بیٹے ہیں عاد۔ اسی طرح ارم کے دوسرے بیٹے تھے عابر اور عابر کے بیٹے تھے ثمود۔ ارم پر عاد اور ثمود دونوں ملتے ہیں۔ اگر عاد کے سلسلہ کو دیکھیں اور اوپر جائیں تو اوپر ارم ہے اور نیچے آئیں تو عاد ہے۔ تو بسا اوقات قومِ ارم کو "عادِ اولیٰ" کہتے ہیں اور قومِ عاد کو "عادِ اخریٰ" کہتے ہیں۔ عذاب ان دونوں پر آیا تھا لیکن یہاں تصریح کر دی گئی کہ یہاں عاد سے مراد عادِ اولیٰ ہے جو کہ قوم ارم ہے۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ ان کے جسم ستونوں کی طرح تھے، بہت قد کاٹھ تھا، ان جیسے جسموں والے بندے اللہ نے دنیا میں پیدا نہیں کیے۔

قومِ ثمود کی پکڑ:

﴿وَ ثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۪ۙ﴾

اور آپ کے رب سے قومِ ثمود کے ساتھ کیا کیا جنھوں نے وادی قریٰ میں چٹانیں تراشی تھیں۔

یہ لوگ وادی القریٰ میں رہتے تھے۔ "اَلْوَادِ" یہ مخفف ہے وادی القریٰ کا۔ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان میں اپنے مکان بناتے تھے۔ میں نے ان مکانات کو دیکھا ہے۔ بندے کو بہت تعجب ہوتا ہے اور یقین نہیں آتا بغیر مشینوں اور جدید آلات کے ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ غاریں ہیں اور ان میں مکان بنے پڑے ہیں۔ اندر جائیں تو عجیب طرح کا نظام ہے۔ ان کے سونے کے لیے جو بستر ہوتے تھے وہ ایسے تھے جیسے ہمارے ہاں قبریں ہوتی ہیں۔ غار کھودی ہے، غار میں نیچے جگہ بنی ہوئی ہے سونے کے لیے۔ ہماری چارپائی تو اوپر ہوتی ہے لیکن ان کی جگہ نیچے قبر کی طرح کھودی ہے، تقریباً ایک فٹ نیچے جگہ ہوتی تھی، وہاں لیٹنے کی جگہ بناتے تھے۔ یہ نظام تھا اس قوم ثمود کا۔ یہ کتنی پرانی بات ہے لیکن ابھی تک وہاں نشانات موجود ہیں۔

میخوں والے فرعون کا حشر:

﴿وَ فِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ۪ۙ﴾

اور آپ کے رب سے فرعون کے ساتھ کیا کیا جو میخوں والا تھا۔

فرعون بدبخت کی عادت یہ تھی کہ جب کسی کو سزا دیتا تو اس کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں میں میخیں گاڑ دیتا تھا اور سانپ اور بچھو اوپر چھوڑ دیتا تھا سزا کے لیے۔

﴿الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ۪ۙ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ۪ۙ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۚۙ﴾

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی اور بہت فساد برپا کیا پھر خدا نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

عذاب کے ساتھ کوڑے کا لفظ اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ عام طور پر جب کوڑا مارتے ہیں تو ایک جگہ نہیں مارتے بلکہ جسم کے مختلف حصوں پر مارتے ہیں۔ تو بتایا یہ جارہا ہے کہ ان پر مختلف قسموں کا عذاب آیا تھا۔

اللہ کے گھات میں ہونے کا معنیٰ:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ۝۱۴﴾

بے شک تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔

یہ صرف تعبیر ہے سمجھانے کے لیے ورنہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کیسے گھات لگائے ہوئے ہیں۔ آپ نے "القواعد فی العقائد" میں یہ بات پڑھی ہے کہ انسانی عقول پر چونکہ محسوسات اتنے غالب ہیں کہ محسوس والی تعبیر کیے بغیر معقول سمجھ ہی نہیں آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو سمجھانے کے لیے ایسے ذکر کیا جاتا ہے کہ جیسے محسوسات ہوتی ہیں کیونکہ ان کے بغیر بندہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ دنیا میں بندے کو سمجھ آتا ہے کہ جب کسی کو پکڑنا ہو تو بندہ گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے تو دشمن کو پکڑ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی گرفت میں لیتے ہیں جس طرح ان کے شایانِ شان ہے۔ یہ انسان کے علم میں نہیں لیکن سمجھانے کے لیے بتایا ہے کہ جس طرح انسان گھات میں بیٹھا ہو تو فوراً پکڑتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو نظر نہیں آتے لیکن جب گرفت کا ارادہ فرماتے ہیں تو فوراً پکڑ فرما لیتے ہیں۔

انسان کی ناشکری کا بیان:

﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ

رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ ﴿ؕ۱۵﴾ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ فَقَدَرَ عَلَیۡہِ رِزۡقَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ ﴿ۚ۱۶﴾

اللہ تعالیٰ نے یہاں انسان کی دو حالتیں بیان فرمائی ہیں کہ جب اللہ اس کو آزمائش میں مبتلا کریں؛ عزت دے دیں، نعمتیں دے دیں تو انسان کہتا ہے "رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ" کہ میرے رب نے مجھے عزت دی ہے، اور جب اللہ اس کی آزمائش کریں کہ اس کا رزق تنگ کر دیں تو انسان کہہ اٹھتا ہے کہ اللہ نے مجھے رسوا کر دیا۔

پھر انسان اس وقت روتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا، میرا پیسہ ختم کر دیا۔ اگر اللہ کسی کو دولت دیں تو یہ سمجھتا ہے کہ میں دولت کا مستحق تھا، میں عزت کا مستحق تھا اس لیے خدا نے مجھے عزت دی ہے اور اگر دولت نہ دیں تو یہ سمجھتا ہے کہ میں دولت کا مستحق تھا لیکن خدا نے مجھے دولت نہ دے کر رسوا کیا ہے۔ انسان اس آزمائش سے جو سمجھا تھا اس کا نتیجہ دو باتیں ہیں:

نمبر ایک... کہ عزت اور ذلت کا مدار مال پر ہے، مال مقصود بالذات ہے کہ جس کو مال ملا تو اسے عزت مل گئی اور جس کو مال نہیں ملا تو اسے ذلت مل گئی۔

نمبر دو... ان کا خیال تھا کہ ہم اس بات کے مستحق ہیں کہ ہمیں مال ملنا چاہیے۔ اس لیے اگر ملے تو خوش ہوتے ہیں کہ ہم مستحق تھے تو ہمیں مل گیا اور اگر نہ ملے تو اس پر کہتے ہیں کہ ہم مستحق تھے تو ہمیں کیوں نہیں دیا، ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

تو یہ دو بنیادی باتیں ہیں جو انسان کہتا ہے۔

نیکی کے کام:

﴿کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ﴿ۙ۱۷﴾ وَ لَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ﴿ۙ۱۸﴾ وَ تَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا ﴿ۙ۱۹﴾ وَّ تُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿ؕ۲۰﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں: ”کَلَّا“ یہ بات ہر گز نہیں، تمہاری یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مال مقصود بالذات نہیں اور تم اس کے مستحق بھی نہیں ہو۔ یہ تو تمہارے دو جرم تھے ہی کہ جو مقصود بالذات نہیں تھا تم نے اس کو مقصود سمجھ لیا اور یہ کہ تم مستحق نہیں تھے اور تم نے اپنا استحقاق سمجھ لیا۔ ان دو جرموں کے علاوہ تمہارے جرم کچھ اور بھی ہیں۔ وہ کون سے ہیں؟ فرمایا: تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کے کھانے کی ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے محبت بھی بہت زیادہ کرتے ہو!

یہاں یہ بات سمجھیں کہ یتیم کو صرف کھانا کھلانا کافی نہیں بلکہ یتیم کو کھانا کھلانا اور عزت کے ساتھ کھلانا ضروری ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ﴾ بلکہ تم تو یتیم کی عزت بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص کھانا کھلا بھی دے اور عزت نہ کرے تو اس نے قرآن کریم کے حکم پر عمل نہیں کیا، کھانا بھی کھلائیں اور عزت کے ساتھ کھلائیں۔

﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ مسکین کو خود بھی کھانا کھلائیں اور کھانا کھلانے کی ترغیب بھی دیں۔ قرآن کریم میں یتیم اور مسکین اور فقیر کو کھلانے کی بہت ترغیب آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو بندے کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾... ”لَمًّ“ کا معنی ہے ”جَمٌّ“ یعنی تم وراثت کے سارے مال کو خود ہڑپ کر جاتے ہو کہ جن کا استحقاق ہے ان کو نہیں دیتے۔ یہ بھی تمہارا جرم ہے۔

﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾... ”جَمًّا“ سے مراد ہے ”بہت زیادہ“

یعنی تم مال سے بہت زیادہ پیار کرتے ہو، اتنا بھی نہیں کرنا چاہیے کہ حقوق کی رعایت نہ کر سکو۔

کفر کی وجہ سے جہنم اور اعمالِ بد کی وجہ سے ازدیادِ جہنم:

اصل میں یہاں بات چل رہی تھی کفار اور مشرکین کی اور آگے ذکر فرمایا ہے ان کے اعمال کو، کیونکہ ان کا اصل جرم؛ کفر اور شرک ہے، یہ جو جرم بیان فرمائے ہیں ﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾﴾ یہ اس کفر اور شرک کے جرم پر اضافی ہیں۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے- آپ کو یاد ہو گا- کہ جب کفار سے پوچھا جائے گا کہ ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾﴾ کہ تمہیں جہنم میں کس چیز نے ڈالا؟ تو وہ جواب دیں گے: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾﴾ کہ ہم نماز بھی نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلاتے تھے۔ تو کفار نے اپنے اعمال بیان کیے۔

سوال یہ ہے کہ کافر کو جہنم اور جہنم کی سزا کفر کی وجہ سے ملے گی اعمال چھوڑنے کی وجہ سے نہیں ملے گی تو پھر جواب میں انہوں نے اعمال کا ذکر کیوں کیا کہ ہمیں اس لیے سزا مل رہی ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، ان پر تو نماز فرض ہی نہیں ہے، نماز اور صدقات فرض اس پر ہیں جو کلمہ پڑھ چکا ہو، جس نے کلمہ ہی نہیں پڑھا تو اس پر نماز اور زکوٰۃ فرض نہیں، وہ احکام کا مکلف نہیں ہے تو پھر احکام پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو سزا کیوں ملتی ہے؟

وہاں بھی میں نے بات کی تھی اور یہاں پھر سمجھ لیں! ایک ہے عذاب اور ایک ہے امتدادِ عذاب، ایک ہے عذاب اور ایک ہے ازدیادِ عذاب، ایک ہے نفسِ

عذاب اور ایک ہے زیادتی عذاب... کافر اور مشرک کو جہنم میں عذاب ہو گا کفر کی وجہ سے اور اس عذاب میں اضافہ ہو گا بد عملی کی وجہ سے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان مؤمن ہو تو جنت ملتی ہے ایمان کی وجہ سے اور جنت بڑھ جاتی ہے انسان کے اعمال کی وجہ سے، نفسِ ایمان پر تو جنت کا وعدہ ہے اور جب ایمان کے ساتھ اعمال بھی بڑھ جائیں تو جنت بھی بڑھتی جائے گی۔ اسی طرح نفسِ کفر پر جہنم کی وعید ہے اور جب کفر کے بعد اعمالِ بد بڑھ جائیں گے تو جہنم کی سزا بھی بڑھتی جائے گی۔ تو نفسِ جنت ایمان کی بنیاد پر ہے اور جنت بڑی ہونا اور مزید نعمتیں ہونا یہ اعمال کی وجہ سے ہے، اسی طرح نفسِ جہنم یہ کفر کی وجہ سے ہے اور اس میں مزید سزاؤں کا بڑھنا بد اعمالیوں کی وجہ سے ہے۔

قیامت کے دن زمین کا بھونچال:

﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾﴾

فرمایا: "كَلَّا" ہرگز ایسا نہیں! یہاں "كَلَّا" کا معنی یہ ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ یتیم کی عزت کریں گے تو کیا ہو گا آخرت میں تو کچھ ملنا نہیں! مسکین کو کھلائیں گے تو آخرت میں تو کچھ ملنا نہیں! جتنا مال جمع کر سکتے ہیں کر لیں یا کسی کے مال کو ہڑپ کر لیں گے تو کون سا ہماری پکڑ ہو گی کیوں کہ ہم نے تو دوبارہ اٹھنا نہیں، فرمایا: "كَلَّا" تمہاری یہ بات ہرگز درست نہیں!

"دَكًّا" کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو ٹکر مار کر توڑنا۔ فرمایا: جب زمین توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

﴿وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَ جِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾﴾

قیامت کے دن تمہارا پرودگار اور قطاروں میں فرشتے آئیں گے۔ اللہ آئیں گے یہ متشابہات میں سے ہے۔ متشابہات کا معنیٰ اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اللہ کیسے آئیں گے یہ اللہ ہی جانتے ہیں۔ اور جہنم کو گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جہنم کی 70 سے زائد لگامیں ہیں اور ہر لگام پر 70 ہزار سے زائد فرشتے ہوں گے جو اس کو کھینچ کر لائیں گے۔ جہنم کو گھسیٹ کر میدان محشر کے قریب لایا جائے گا۔ اس دن کافر انسان کو سمجھ آجائے گی کہ مجھے دنیا میں کیا کرنا چاہیے تھا اور میں نے کیا کیا! لیکن اس وقت یہ سمجھ آنا بے سود ہو گا، اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہو گا۔

﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾﴾

اس دن وہ کہے گا: اے کاش! میں آج کی زندگی کے لیے کچھ کما لیتا۔ اس دن کا عذاب ایسا اللہ دیں گے کہ اس جیسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور اللہ ایسی گرفت فرمائیں گے کہ اس دن اس طرح کی گرفت کوئی نہیں کر سکتا۔

نفس کی تین اقسام:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾﴾

حساب کتاب کے بعد یہ اعلان ہو گا: اے نفسِ مطمئنہ! - اے وہ انسان جو اطمینان والا ہے اور اللہ کے احکام پر راضی ہے! - اپنے اللہ کی طرف اس طرح لوٹو کہ تم اللہ سے راضی ہو اور اللہ تم سے راضی ہو!

"اِرْجِعِيْ" یعنی واپس لوٹو... کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ نفسِ مطمئنہ آیا بھی وہاں سے ہے اور جائے گا بھی وہاں پہ۔ تو روح جہاں سے آئی ہے وہیں واپس جائے

گی۔

پہلے گزر چکا ہے کہ نفس کی تین قسمیں ہیں:

نفسِ امارہ... نفسِ لوامہ... نفسِ مطمئنہ

فطر تاًہر نفس؛ نفسِ امارہ ہے، ہر ایک کی طبیعت میں خدا نے گناہ کا تقاضا رکھا ہوا ہے۔ جب آدمی مشقت بر داشت کرتا ہے اور گناہوں کو چھوڑ تا ہے، توبہ کرتا ہے تو اس کا نفس؛ نفسِ لوامہ بنتا ہے اور مسلسل نیکیاں کر کے طبیعت پر جبر کر کے گناہوں سے بچتے بچتے ایک وقت آتا ہے کہ نفس؛ مطمئنہ بن جاتا ہے۔

اہل اللہ سے محبت:

﴿فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ﴿۲۹﴾ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾﴾

میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔

﴿فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ﴾ کو ﴿وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ﴾ پر مقدم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دخولِ جنت کا راستہ دخول فی عباد اللہ ہے۔ اگر کوئی شخص جنت میں جانا چاہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں میں -جو جنتی ہیں- شامل ہو جائے۔ بس یہ سب سے آسان ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ أَسۡأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنۡ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنِیۡ إِلَی حُبِّكَ. [90]

یا اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں اور جو آپ سے محبت کریں ان کی محبت مانگتا ہوں اور ان اعمال کی محبت مانگتا ہوں جو آپ کی محبت کے قریب کر دیں۔

اصل تو اللہ کا قرب ہے اور اللہ کے قرب کا ذریعہ نیک اعمال ہیں اور اللہ کی

90۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج8 ص433 رقم الحدیث 16640

محبت اور نیک اعمال کے درمیان ولایت کی محبت کا ذکر کیا "وَحُبَّ مَنۡ یُحِبُّكَ"، اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ تقویٰ کی محبت یہ انسان کو تقویٰ عطا کر دیتی ہے، ولی کی محبت سے انسان بہت جلد اعمالِ صالحہ پر آجاتا ہے۔

اولیاء اللہ کی توہین سے بچنا:

اور آپ نے خود بھی دیکھا ہو گا- اللہ ہمیں ان مواقع سے کبھی نہ گزارے- آپ نے دیکھا ہو گا کہ عام طور پر اہل اللہ کو بکنے والا شخص اعمال سے محروم رہتا ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بات کا اہتمام کیا ہے کہ کبھی اہل اللہ کے خلاف میں نے زبان اور قلم استعمال نہیں کیا۔ اگر مجھے ان کی تحقیق خلافِ شرع بھی محسوس ہوئی تو میں نے اس پر بھی درگزر کیا ہے کہ ان کے پاس بھی کوئی دلیل ہو گی، کسی بنیاد پر یہ بات کرتے ہوں گے، میں نے ایسا طرز اختیار نہیں کیا جس سے ان کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ اس لیے اس بات کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

جنت میں جانے کا سب سے آسان راستہ کون سا ہے؟ اللہ کے بندوں میں شامل ہو جاؤ! ایک آدمی کہیں جاتا ہے، وہ بڑا آدمی ہے اور اس کے ساتھ اس کا ڈرائیور بھی ہے، اس کا سیکرٹری بھی ہے، اس کا گارڈ بھی ہے تو لوگ ڈرائیور، سیکرٹری اور گارڈ کو بھی عزت دیتے ہیں جس طرح آنے والے مہمان کو دیتے ہیں، اس کو بھی وہی کھانا ملتا ہے جو آنے والے مہمان کو ملتا ہے۔ اللہ رب العزت کی غیرت کے خلاف ہے کہ دنیا میں جس سے تعلق ہو اس کے ساتھ آنے والوں کا دنیا والے حیا کریں اور اللہ اولیاء اللہ سے محبت کرنے والوں کو محروم کر دے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اللہ ہم سب کو اہل تقویٰ کی محبت عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَآ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورۃ البلد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾﴾

قسم کے شروع میں ”لَا“ لانے کا مقصد:

﴿لَاۤ اُقۡسِمُ﴾ کے شروع میں جو ”لَا“ ہے یہ کلامِ عرب میں معروف ہے کہ جب بھی ان کے ہاں قسم کھائی جاتی ہے تو قسم کے شروع میں ”لَا“ لگاتے ہیں۔ شروع میں ”لَا“ لانے کا مقصد مخاطب کے خیال کی تردید کرنا ہے کہ تمہارے ذہن میں جو بات ہے یہ غلط ہے اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری بات ٹھیک ہے۔

﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾﴾

اللہ تعالیٰ مشرکین کے ذہن کی نفی فرمارہے ہیں۔ مشرکین کا ذہن یہ تھا کہ ہم جو چاہیں کریں... ہمیں کسی نے پوچھنا نہیں... کسی نے پکڑنا نہیں... قیامت کا دن نہیں ہوگا... فرمایا: ”لَا“ یہ بات نہیں ہے.. ”اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ“ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اس سے مراد شہر مکہ ہے۔ اللہ نے مکہ کی قسم کھائی ہے۔

﴿وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾﴾

یہ ”ہٰذَا الۡبَلَدِ“ کی مزید تعظیم بیان کی ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر

کی، اب یہ شہر ایسا ہے کہ اے پیغمبر! آپ بھی اس شہر میں رہتے ہیں۔ تو اس سے اس مکہ کی عظمت دوگنی ہے۔ ایک مکان اچھا ہے اور دوسرا اس کا مکین اچھا ہے اور عموماً مکان کی قیمت مکین کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ مکہ کی عظمت کو بڑھایا ہے کہ اس میں آپ بھی رہتے ہیں، اور یہ تب ہے جب "حِلٌّ" کا لفظ حلول سے ہو اور اگر یہ لفظ حلال سے ہو تو پھر معنی الگ ہو گا۔ پھر معنی یہ ہو گا کہ آپ کی ذات ایسی ہے کہ مکہ مکرمہ میں کافر آپ کے خون کو حلال سمجھتے ہیں... یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ ہے کہ حرمِ مکہ میں کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے لیکن کچھ وقت کے لیے ہم نے حرمت کا یہ حکم اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہاں قتل کو حلال کر دینا ہے اور یہ فتحِ مکہ کے موقع پر ہوا بھی تھا کہ احکامِ حرم اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کفار کا قتل جائز کر دیا گیا تھا۔

﴿وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۝۳﴾

قسم ہے والد یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اور ان کی اولاد کی۔

مشقت؛ انسانی پیدائش کا جزءلازم

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ۝۴﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا فرمایا ہے۔ یہ عنوان قرآن کریم میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ الانشقاق میں گزرا ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ ۝۶﴾[91]

کہ اے انسان! تم نے اپنے رب تک مشقت اٹھاتے اٹھاتے پہنچ جانا ہے۔

91۔ الانشقاق 6:84

اور یہاں فرمایا: ”لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ“ کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ بات بڑی کھل کر سمجھ آتی ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی مشقت کے بغیر ہو تو اس پر تعجب ہونا چاہیے اور دنیا میں کوئی مشقت میں ہو تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ عین فطرت ہے۔ دنیا میں کسی شخص پر کوئی تکلیف کوئی مشقت نہ آئے تو اس پر تعجب ہونا چاہیے اور اگر تکلیف اور مصیبت آئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دنیا تو نام ہی مشقت کا ہے۔ اس لیے اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو مشقت میں بنایا ہے۔ یہاں ”کَبَدٍ“ کو اللہ نے ظرف بنایا اور انسان کو مظروف بنایا ہے کہ انسان ہے ہی مشقت میں، اس لیے اسے مشقت اٹھانی ہے۔

﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ ۝۵﴾

کیا کافر یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کسی کو بھی قدرت نہیں۔

﴿یَقُوۡلُ اَهۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶﴾

اور یہ کافر بدبخت اتنے ہیں کہ اسلام کی مخالفت میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں مال خرچ کرتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ میں نے بہت زیادہ مال خرچ کیا ہے۔ ”لُبَدًا“ کا معنی ہے وافر مقدار، کہ میں نے بہت مال خرچ کر دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے مال تھوڑا خرچ کیا ہے اور اس تھوڑے کو زیادہ کہہ رہے ہیں اور پھر یہ کون سا کارنامہ کیا ہے انہوں نے پیغمبر کی مخالفت میں مال خرچ کر کے؟!

﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝۷ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ ۝۸ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۝۹ وَ هَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِ ۝۱۰﴾

کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کو کوئی نہیں دیکھ رہا؟! یہ کیسے ہو سکتا ہے تم اللہ سے

مخفی رہو؟ اللہ فرماتے ہیں: کیا ہم نے اسے آنکھیں نہیں دیں؟ اسے زبان نہیں دی؟ اسے دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور اس کو ہم نے دو راستے دکھائے۔

آنکھ؛ نعمتِ خداوندی

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ﴾... اللہ نے پورا جسم انسان کو دیا لیکن بطور خاص اللہ نے اس میں آنکھوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس لیے کہ انسان آنکھوں سے اچھی اور بری جگہیں دیکھتا ہے، سیدھا اور برا راستہ دیکھتا ہے اس لیے بطورِ خاص ان کا ذکر فرمایا اور یہ آنکھیں انسان کے جسم میں اللہ کی نعمتیں ہیں۔ دیکھو! یہ ایک سیکنڈ میں لاکھوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ آنکھوں کی حفاظت کا نظام اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ آنکھ میں یہ پانی ہے تھوڑا سا، یہ خشک ہو جائے تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر وہ پانی نہیں دے سکتیں اور یہ جو آنکھ کی پُتلی ہے یہ جسم کا ایک ایسا حصہ ہے جو ہر انسان کی برابر ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا اور عجیب بات یہ کہ آنکھ کی پُتلی کبھی کسی کی بھی نہیں بڑھتی، انسان کے بدن کے تمام اعضاء آہستہ آہستہ بڑھتے رہتے ہیں لیکن آنکھ کی یہ جو کالی سی گول پُتلی ہے یہ بڑھتی نہیں ہے، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تب بھی اتنی ہوتی ہے اور جب بندہ مرتا ہے تب بھی اتنی ہوتی ہے۔ شروع سے لے کر آخر عمر تک اس کا سائز ایک ہی رہتا ہے، یہ بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ آپ کوئی بچہ دیکھیں تو اس کی پتلی اتنی بڑی ہو گی جتنی بڑوں کی ہوتی ہے، وہ چھوٹی نہیں ہو گی۔ یہ اللہ کا عجیب نظام ہے۔ آنکھ آہستہ آہستہ بڑھتی ہے لیکن اندر کی جو کالی سی گولی ہے وہ اتنی ہی رہے گی۔

آنکھ میں لاتعداد بلب ہیں جن کی وجہ سے روشنی ہوتی ہے اور بندہ دنیا کو دیکھتا ہے اور پھر آنکھ کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی نقصان دہ چیز آنکھ کی طرف آئے تو بند نہیں کرنا پڑتی بلکہ خود بخود بند ہو جاتی ہے یعنی آپ آنکھ میں انگلی ڈالو تو آنکھ خود بخود بند

ہو جائے گی۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نور اللہ مرقدہ بڑی عجیب بات فرماتے تھے، حضرت فرماتے کہ دنیا میں انسان کے جسم کو جو چیز تکلیف دیتی ہو اس کے آنے پر آنکھ خود بخود بند ہو جاتی ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ جو چیز آخرت کو تباہ کرتی ہو وہ آپ کے سامنے آئے اور آنکھ خود بخود بند نہ ہو! اصل میں ہم نے آنکھ سے گناہ کرنے کا مزاج ایسا بنالیا ہے کہ گناہ کی چیز سامنے آئے تو آنکھ بند نہیں ہوتی۔ اگر یہ مزاج نہ بنایا ہوتا تو نامحرم کے سامنے آتے ہی آنکھ خود بخود بند ہو جاتی۔ اس کے بند نہ ہونے کی وجہ ہماری اپنی عادات ہیں کہ ہم نے اس کو گندہ بنایا ہے۔

یہ بات مزید سمجھنی ہو تو دیکھیں کہ قبر کا ثواب و عذاب برحق ہے اور جب ہم یہ بات پیش کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند قبروں کے پاس سے گزرے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری بدک گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس ہوا کہ یہاں عذاب ہو رہا ہے۔[92]

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی قبر کو "قبر" کہتے ہیں۔ جو لوگ اس کے قبر ہونے کے منکر ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہی قبر ہوتی تو کتنے قبرستان ہیں جن میں سے جانور گزرتے ہیں لیکن وہ نہیں بدکتے تو پھر یہ کیوں نہیں بدکتے، ان کو بھی بدکنا چاہیے، اس سے معلوم ہوتا ہے یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا باقی اس قبر میں عذاب و ثواب نہیں ہوتا۔ سوال سمجھ میں آگیا ان لوگوں کا؟ (جی ہاں۔ سامعین) تو اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نہیں تھا کہ جانور بدک گیا، معجزہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چل گیا کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔

92۔ صحیح مسلم، رقم:2867

رہی یہ بات کہ اُس وقت جانور بد کا تھا تو اب کیوں نہیں بدکتے! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً ایک جانور ہے جس نے کبھی ٹرین کو نہیں دیکھا اور آپ اس جانور کو لے جارہے ہوں کہ اچانک ٹرین آجائے تو وہ جانور آپ کو بھی گرا کر دوڑ جائے گا، لیکن وہ جانور جو ٹرین کی پٹری کے پاس رہتے ہیں، روزانہ انجن وہاں سے بولتے ہوئے گزرتا رہتا ہے لیکن ان جانوروں کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح آج جب ہر قبرستان میں عذاب ہی عذاب ہے، جانور وہاں سے گزر کر عادی بنے ہوئے ہیں تو پھر اچانک بدکیں گے کیسے؟ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

زبان اور ہونٹ کی نعمت:

﴿وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ﴾ کیا ہم نے اسے زبان نہیں دی؟ اسے دو ہونٹ نہیں دیے؟

زبان انسان کی تلوار ہے، یہ اچھے کام بھی کرتی ہے اور برے کام بھی کرتی ہے۔ تلوار کی حفاظت کے لیے نیام ہوتی ہے اللہ نے اس زبان کی حفاظت کے لیے دو ہونٹ دیے ہیں۔ آپ اگر زبان کو غلط استعمال پر روکنا چاہیں تو ہونٹ بند کر دیں زبان بولنا بند کر دے گی۔ زبان نے تب بولنا ہے جب ہونٹوں نے کھلنا ہے، ہونٹ نہیں کھلیں گے تو زبان کام نہیں کرے گی۔ تو زبان کو غلط استعمال سے روکنے کے لیے اللہ نے ہمیں ہونٹ عطا فرمائے تاکہ اس کا غلط استعمال کبھی بھی نہ ہو۔ اللہ نے کیسے حفاظت کا انتظام فرمایا! انسان کے دماغ میں ایک سوچ آتی ہے، دماغ اس کو لفظ دیتا ہے اور زبان اس کو ادا کر دیتی ہے، ایک سیکنڈ کا بھی پتا نہیں کوئی کروڑواں حصہ ہو گا! اتنی رفتار سے کام چل رہا ہوتا ہے۔

حق و باطل کی پہچان:

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝١١﴾

ہم نے انسان کو دو راستے دے دیے ہیں؛ جنت والا بھی اور جہنم والا بھی لیکن انسان پھر بھی دین کی گھاٹی سے نہیں گزر سکا۔

﴿الۡعَقَبَةَ﴾... اصل میں کہتے ہیں پہاڑ کے اوپر والی چٹان کو جس پر چڑھ کر انسان دشمن سے بچتا ہے، اگر کوئی مخالف ہو تو چٹان کی چوٹ میں چلے جائیں تو مخالف سے بچ سکتے ہیں اور بسا اوقات دو پہاڑوں کے درمیان جو راستہ ہوتا ہے جسے گھاٹی کہتے ہیں اس کو بھی عقبہ کہتے ہیں۔ اگر دشمن کا خطرہ ہو تو آدمی گھاٹی سے گزر کر سائیڈ پر نکل جاتا ہے اور دشمن سے بچ جاتا ہے۔ یہاں اللہ نے دین اسلام کو "عقبہ" فرمایا ہے کہ جس طرح چٹان یا گھاٹی دشمن سے بچاتی ہے، دین اسلام بھی انسان کو جہنم سے بچاتا ہے۔

چند امورِ خیر:

﴿وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡكِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ﴿۱۶﴾﴾

اور تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ عقبہ کیا ہے جس کی بات ہم نے کی ہے؟ غلام آزاد کرنا، فاقے کے دن کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، ایسا یتیم جو رشتہ دار بھی ہو اس کی خدمت کرنا یا کسی خاک آلود مسکین کے ساتھ تعاون کرنا۔

"یَتِیۡمًا" کے ساتھ "ذَا مَقۡرَبَةٍ" کی بات اس لیے فرمائی کہ یتیم بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو تو اس کو دینے پر اللہ دوہرا اجر دیتے ہیں؛ ایک یتیم کا پیٹ بھرنے کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

صبر اور صلہ رحمی کی تلقین:

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ﴿۱۷﴾﴾

صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ انسان یہ کام کر لے کہ غلام آزاد کر دے، مسکین کو کھانا کھلا دے، یتیم کا اکرام کر لے بلکہ ان کاموں کے باوجود اس کو اہلِ ایمان کے زمرے میں داخل ہونا ضروری ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر یہ اعمال قبول نہیں ہوتے۔ اس لیے فرمایا اس شخص کو چاہیے کہ ایمان والوں میں شامل ہو جائے اور یہ ایمان والے ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں کہ جب تکلیف آ جائے تو برداشت کیا کرو، ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں کہ محبت اور شفقت سے رہا کرو!

دائیں ہاتھ والے اور بائیں ہاتھ والے:

﴿أُولَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَيۡمَنَةِ ۝١٨﴾

فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جو دائیں ہاتھ والے ہیں یعنی ان کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔

﴿وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِـَٔايَٰتِنَا هُمۡ أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَشۡـَٔمَةِ ۝١٩ عَلَيۡهِمۡ نَارٞ مُّؤۡصَدَةُۢ ۝٢٠﴾

اور جو لوگ ہماری آیات کا انکار کرنے والے ہیں وہ بائیں ہاتھ والے ہیں یعنی ان کو اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملے گا۔ ان کے اوپر آگ ہو گی جس کو بند کر دیا جائے گا یعنی کافروں کو جہنم میں ڈالیں گے اور جہنم کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اب یہ کبھی بھی جہنم سے نہیں نکل سکتے، ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الشمس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ۝١ وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝٢ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝٣﴾

گیارہ قسمیں:

یہاں اللہ رب العزت نے گیارہ قسمیں کھا کر یہ مضمون سمجھایا ہے اور قرآن کریم میں اس سے زیادہ کسی اور مضمون کو سمجھانے کے لیے اتنی قسمیں نہیں اٹھائی گئیں۔

﴿وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ۝١﴾

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی۔ یہ جو واؤ عاطفہ ہے اس کے بعد "ضُحٰهَا" اس شمس کا وصف ہے تو یہ وصف بصورت عطف بیان ہو رہا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ یار اس بندے کو دیکھو اور اس کا قلم دیکھو اور اس کی زبان دیکھو! اب یہ اس کا وصف بصورت عطف بیان ہو رہا ہوتا ہے۔

فرمایا: سورج کو دیکھو اور سورج کی روشنی کو دیکھو! ترجمہ کرتے ہوئے یہ لہجہ میں اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ بسا اوقات بندے کو الجھن ہوتی ہے کہ جب سورج کی قسم کھالی تو اب روشنی کی قسم کیوں کھائی ہے؟ تو میں بارہا یہ بات سمجھاتا ہوں کہ آپ محاورات میں بات کیا کریں پھر دیکھیں قرآن کیسے سمجھ میں آتا ہے؟! محاورات کو ذہن

سے ہٹا دو تو پھر قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ ”وَالشَّمۡسِ وَضُحٰىهَا“قسم ہے سورج کی اور سورج کی روشنی کی! یعنی سورج کو دیکھو.. سورج کا چڑھنا دیکھو.. سورج کی روشنیاں دیکھو۔

﴿وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۪ۙ﴾

اور قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے بعد آئے۔ عام طور پہ چاند سورج کے غروب ہونے کے کافی دیر بعد نظر آتا ہے لیکن بطورِ خاص جو چودھویں کا چاند ہوتا ہے وہ سورج کے غروب ہونے کے فوراً بعد نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو اس جملہ سے مقصود یہ ہے کہ جب چاند درجہ کمال پر ہو۔

﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۪ۙ﴾

اور قسم ہے دن کی جب وہ زمین کو روشن کر کے رکھ دے۔ یہاں ”هَا“ ضمیر سے مراد زمین ہے جس کا پہلے ذکر نہیں ہوا لیکن عرب کے محاورات میں بھی ہے اور ہمارے محاورات میں بھی ہے کہ بعض چیزوں کا ذکر زبان سے نہیں ہوتا لیکن ذہنوں میں ہوتا ہے جس کو معہودِ ذہنی کہتے ہیں۔

﴿وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰىهَا ۪ۙ﴾

اور قسم ہے رات کی جب وہ سورج کی روشنی پر چھا جائے اور اسے چھپا لے۔

﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۪ۙ﴾

اور قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے آسمان کو بنایا۔

﴿وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰىهَا ۪ۙ﴾

اور قسم ہے زمین کی اور اس ذات کی جس نے زمین کو بنایا۔

﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۪ۙ﴾

اور قسم ہے انسان کی اور اس ذات کی جس نے انسان کو صحیح طرح بنا دیا۔

یہ کل گیارہ قسمیں بنتی ہیں۔ عام مفسرین کے ہاں یہ قسمیں سات ہیں اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ گیارہ قسمیں ہیں۔ عام مفسرین ان جملوں "مَا بَنٰىهَا" اور "وَ مَا طَحٰىهَا" میں "مَا" کو مصدریہ کہتے ہیں تو سات قسمیں بنا لیتے ہیں اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ "مَا" بمعنی "مَنْ" لے کر ذات کی قسم مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں گیارہ قسمیں بن جاتی ہیں۔ اگر "مَا" بمعنی "مَنْ" ہو اور ذات ہو تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایک استدلال ہے کیونکہ مصنوع سے استدلال ہوتا ہے صانع کے وجود پر۔ تو پہلے مخلوق کا ذکر کیا ہے جس سے خدا کی ذات پر استدلال ہو سکتا ہے۔

انسان کی فطرت میں تقویٰ اور فجور کی آمیزش:

تو اللہ نے گیارہ قسمیں کھا کر فرمایا:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ﴿۸﴾﴾

کہ اللہ نے انسان کی ذات میں گناہ کا تقاضا بھی رکھا ہے اور گناہ کو کنٹرول کرنے کی طاقت بھی اس کے مزاج میں رکھی ہے۔

کامیاب انسان:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾﴾

وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کی اصلاح کر دی اور وہ شخص برباد ہو گیا جس نے اپنے نفس کو تباہ کر دیا یعنی اس کی اصلاح نہ کر سکا۔

قومِ ثمود کی سرکشی کا انجام:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۱﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾ فَقَالَ لَهُمْ

رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْیٰهَا ﴿۱۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾﴾

آگے مثال دی ہے کہ ایسا شخص گزرا تھا جس نے اپنے نفس کو تباہ کیا تھا۔ فرمایا: قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے نبی کو جھٹلایا، جب ان میں ایک بدبخت اونٹنی کو مارنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اللہ کے رسول نے کہا کہ یہ اونٹنی اللہ کی ہے، اس کا اور اس کے پانی پینے کا پورا پورا خیال رکھنا! ﴿فَكَذَّبُوْهُ﴾ پھر بھی انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اس اونٹنی کو کاٹ کے رکھ دیا-اس کے پاؤں کاٹے- ﴿فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا﴾ ان کے رب نے ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے مسلسل عذاب برسایا، ﴿فَسَوّٰىهَا﴾ اور سب کو برابر کر کے رکھ دیا۔ یہ عذاب ایسا تھا جو مردوں، بچوں، بوڑھوں، عورتوں سب پر آیا۔

﴿وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا﴾

اور اللہ انجام سے نہیں ڈرتے۔ دنیا کے بادشاہ کسی کو عذاب دیں تو ڈرتے ہیں کہ ہمارے خلاف بغاوت نہ ہو اور اللہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس لیے کہ اللہ کو بغاوت کا خطرہ نہیں۔ خدا کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے۔ اس پر کئی بار میں تقریر کر چکا ہوں اور آپ سن بھی چکے ہیں۔

یہاں ایک اہم باتیں سمجھ لیں:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا﴾

اللہ نے بندے میں گناہ کا تقاضا بھی رکھا ہے اور گناہ سے بچنے کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔

اللہ نے یہاں "فجور" کو "تقویٰ" پر مقدم کیا یعنی گناہ کو نیکی پر مقدم کیا

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ ہوتا ہی تب ہے جب گناہ کا تقاضا ہو اور اگر انسان میں گناہ کا تقاضا ہی نہ ہو تو پھر کنٹرول کی طاقت کی ضرورت ہی نہیں۔پہلے گناہ کا تقاضا ہو گا تو پھر کنٹرول کی طاقت بھی ہو گی اس لیے فجور کو مقدم کیا لیکن مقصود گناہ کرنا نہیں بلکہ گناہ سے بچنا ہے۔جب مقصود کی بات آئی تو ﴿مَنْ زَكّٰىهَا﴾ کو مقدم کیا اور ﴿مَنْ دَسّٰىهَا﴾ کو مؤخر کیا کہ وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کی اصلاح کی اور وہ تباہ ہوا جس نے اپنے نفس کو مٹی میں ملا دیا، نفس کی اصلاح نہ کر سکا۔جب مقصد کی بات آئی تو پھر ﴿مَنْ زَكّٰىهَا﴾ کو مقدم کیا اور ﴿مَنْ دَسّٰىهَا﴾ کو مؤخر کیا۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ الَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾ وَ النَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾﴾

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب وہ روشن ہو جائے اور قسم ہے اس اللہ کی جس نے مرد کو پیدا کیا اور عورت کو پیدا کیا۔

انسانی کوشش کا تنوع:

﴿اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ۙ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ۙ﴿۶﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ؕ﴿۷﴾﴾

تمہاری کوشش مختلف ہے یعنی تمہارے اعمال مختلف ہیں؛ کسی کے اعمال نیک ہیں، کسی کے اعمال بد ہیں۔ جو شخص اللہ کے رستے میں مال دے اور اللہ سے ڈرے اور سب سے اچھی بات کی تصدیق کرے۔ سب سے اچھی بات سے مراد دینِ اسلام ہے جس کو ماننے اور عمل کرنے پر جنت کا وعدہ ہے۔

نیکی اور بدی کا نتیجہ:

﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ؕ﴿۷﴾﴾

تو ہم اس بندے کو سامان دے دیتے ہیں راحت کی چیز کے لیے۔

﴿وَ اَمَّا مَنۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۝۸ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰﴾

اور جو شخص بخل کرے اور بے پرواہی اختیار کرے اور اسلام کی تکذیب کرے، اسلام کو جھٹلائے تو ہم اس کو سامان دے دیتے ہیں مشکل اور تکلیف دہ چیز کے لیے۔

"نُيَسِّرُ" کا معنی ہوتا ہے اسباب دینا۔ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صدقات دے، تقویٰ اختیار کرے اور دینِ اسلام کی تصدیق کرے، یہ تین کام کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے اسباب عطا فرما دیتے ہیں کہ اس کے لیے دین کا کام کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے ... اور جو شخص بخل کرے، یتیموں اور غریبوں کی پرواہ نہ کرے اور دینِ اسلام کی تکذیب کرے تو اللہ اسے ایسے اسباب دیتے ہیں جن کی وجہ سے اس کے لیے کفر اور فسق پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

انسان جیسی محنت کرتا ہے اسی کے مطابق اللہ اس کو اسباب عطا فرماتے ہیں۔ جو انسان مسلسل نیکی کے راستے کی تلاش کرے تو اللہ ایسے اسباب دے گا کہ نیکی کرنا آسان ہو جائے گا اور جو چوبیس گھنٹے گناہ سوچے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے اسباب دے گا کہ گناہ کرنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔ یہ انسان کی محنت کی وجہ سے ہے۔ جیسی محنت کرتا ہے اللہ اس کو دنیا میں اس کا رزلٹ دے دیتے ہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے۔

شریعت بنے گی طبیعت لیکن کب؟

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾ پر یہاں ایک بات سمجھیں۔ اب قواعد کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں "فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى" نہ کہا جاتا بلکہ اللہ فرماتے "فَسَنُيَسِّرُ لَهٗ

الْيُسْرٰی'' کہ جو شخص صدقات دیتا ہے، تقویٰ اختیار کرتا ہے اور دینِ اسلام کی تصدیق کرتا ہے تو ہم اس کے لیے شریعت پر چلنا آسان کر دیتے ہیں۔ انسان؛ ذات ہے اور آسانی یا مشکل؛ صفت ہے۔ آسان ہونا اور مشکل ہونا کسی ذات کی صفت نہیں ہے کہ یہ بندہ مشکل ہے اور یہ بندہ آسان ہے، آسان ہونا یا مشکل ہونا یہ بندہ کی صفت تو نہیں ہو سکتی نا! آسان ہونا یا مشکل ہونا یہ عمل کی صفت ہوتی ہے کہ یہ عمل مشکل ہے یا یہ عمل آسان ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ ہم اس بندے کے لیے عمل کو آسان کر دیتے ہیں تو یہ بات ٹھیک ہوتی، ہم اس بندے کے لیے شریعت پر عمل کرنا مشکل بنا دیتے ہیں تو یہ بات ٹھیک ہوتی... لیکن اللہ نے یہاں یہ فرمایا: ہم اس بندے کو آسان کر دیتے ہیں شریعت پر عمل کے لیے اور ہم اس بندے کو مشکل بنا دیتے ہیں شریعت پر عمل کے لیے۔ حالانکہ آسان یا مشکل ہونا یہ عمل کی صفت ہے یہ بندے کی ذات کی صفت نہیں۔ تو یہاں یہی بتانا مقصود ہے کہ جب بندہ اب تین چیزوں کا قصد کرتا ہے اور ان پر محنت کرتا ہے تو اللہ اس کی طبیعت ایسی بنا دیتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان تین برائیوں کے لیے محنت کرتا ہے تو اللہ اس کی طبیعت ایسی بنا دیتے ہیں کہ اس کے لیے شریعت پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

''الْيُسْرٰی'' سے مراد جنت ہے کیونکہ جنت نیک اعمال سے ملتی ہے اور ''الْعُسْرٰی'' سے مراد جہنم ہے اور جہنم اعمال بد سے ملتی ہے۔ اللہ پاک ہمارا مزاج بھی ایسا فرمادے کہ ہمارے لیے شریعت پر چلنا آسان ہو جائے۔ آمین

﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ﴿۱۱﴾﴾

آج جس شخص کے پاس مال ہے اور وہ بخل کرتا ہے تو جب یہ جہنم میں داخل ہو گا تو یہ مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿١٢﴾﴾

ہمارے ذمہ سمجھانا ہے۔ اس لیے سمجھاتے ہیں۔

﴿وَإِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿١٣﴾﴾

اور دنیا اور آخرت ہمارے قبضے میں ہیں۔ جو انسان نیک اعمال کرتا ہے اس کو جنت دے دیں گے اور جو برے اعمال کرتا ہے اس کو جہنم دے دیں گے۔

اشقیٰ اور اتقیٰ کے انجام میں فرق:

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿١٤﴾ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٦﴾﴾

میں نے تمہیں بھڑکنے والی آگ سے خبر دار کر دیا ہے جس میں بد بخت ہی داخل ہو گا، جس نے دینِ حق کو جھٹلایا تھا اور اس سے اعراض کیا تھا۔

یہاں ایک بات سمجھیں!

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾﴾

اور وہ شخص جو متقی ہے وہ اس آگ میں داخل ہونے سے بچا لیا جائے گا۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں دیتا ہے تاکہ اس کا مال پاکیزہ ہو جائے۔

صحابہ کرام محفوظ ہیں:

اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین محفوظ ہیں۔ محفوظ کا معنی کہ وہ گناہ نہیں کرتے اگر گناہ کر لیتے ہیں تو اللہ ان کے نامہ اعمال میں رہنے نہیں دیتا، اس لیے وہ جہنم میں بھی داخل نہیں ہوں گے۔ صحابی کبھی بھی جہنم میں داخل نہیں ہو گا۔ میں آپ کو یہ بات سمجھا چکا ہوں اعتراضات اور جوابات کے ساتھ -شاید آپ کو یاد ہو گا- کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور صحابی محفوظ ہوتا

ہے، نبی سے اللہ گناہ ہونے نہیں دیتے اور صحابی سے ہو جاتا ہے لیکن اللہ نامہ اعمال میں رہنے نہیں دیتے۔ صحابہ عذاب سے بھی محفوظ ہیں اور بد عملی سے بھی محفوظ ہیں۔

حضرت سعد اور قبر کا جھٹکا (توجیہات)

اس پر اشکالات تھے کہ صحابہ کرام کے کتنے واقعات ہیں کہ جن کو قبر کی تکلیف ہوئی ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ قبر میں گئے تو قبر نے ان کو دبایا، پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں اترے اور ان کے لیے دعائیں مانگیں تو ان کی قبر کھل گئی۔ تکلیف تو ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم یہ کیسے مان لیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو عذاب نہیں ہوتا۔ اس سوال کے جوابات آپ کے ذہن میں ہوں گے۔ میں نے ایک جواب یہ عرض کیا تھا کہ عذاب کہتے ہیں: ”اِیْلَامُ الْحَيِّ عَلٰی سَبِیْلِ الْھُوَانِ“ کو کہ زندہ کو تکلیف دینا ذلت کے لیے، اور جب ذلیل کرنا مقصود نہ ہو تو اس کو عذاب کہتے ہی نہیں۔ باقی جو صورتِ عذاب ہے تو یہ کیوں ہوئی؟ اس کا میں نے جواب یہ دیا تھا کہ یہ جو صحابہ کرام کے بارے میں ہے کہ ان کو عذاب نہیں ہو گا تو اس سے مراد برزخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جہنم ہے اور کوئی صحابی جہنم میں داخل ہو گا اس کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

اور قبر کے جھٹکے اس کے خلاف نہیں ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں صحابہ کو عذاب نہیں ہو گا تو اس سے مراد جہنم کا عذاب ہے اور یہ جو قبر ہے یہ جہنم نہیں ہے، اس میں عرضِ نار ہوتا ہے دخولِ نار نہیں ہوتا۔

ایک جواب شاید آپ کو یاد ہو گا یہ تھا کہ یہ جو موت سے لے کر حشر تک کی زندگی ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ دنیا کا تتمہ ہے اور آخرت کا مقدمہ ہے۔ یہ نہ تو پوری آخرت ہے اور نہ ہی پوری دنیا ہے، من وجہٍ یہ دنیا ہے اور من وجہٍ یہ آخرت ہے اور مؤمن کو دنیا میں تکلیف کا آجانا یہ ایمان کے خلاف نہیں ہے تو چونکہ من وجہٍ یہ دنیا

ہے اس لیے اس میں تکلیف کا آجانا ایمان کے خلاف نہیں ہے۔

﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ﴿۱۹﴾

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾﴾

متقی وہ شخص ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں دیتا ہے تاکہ اس کا مال پاکیزہ ہو جائے۔ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں کہ جس کا وہ بدلہ اتار رہا ہو بلکہ یہ شخص صرف اپنے رب کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہے جس کی اونچی شان ہے۔

﴿وَلَسَوْفَ یَرْضٰى ﴿۲۱﴾﴾

عنقریب یہ شخص راضی ہو جائے گا۔ اللہ اس کو راضی کر دیں گے۔ روایات میں آتا ہے کہ اس سے مراد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ آیات ان کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں سات ایسے غلام صحابہ کرام جن کو کفار تکلیفیں دیتے تھے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مال خرچ کر کے ان کو آزاد کروا دیا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد کہتے ہیں: تم کمزور آدمی کو آزاد کرتے ہو کسی طاقت ور کو خرید کر آزاد کرو جو تمہارے مشکل وقت میں کام آئے گا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اپنی ذات کے لیے آزاد نہیں کرتا صرف اللہ کی رضا کے لیے آزاد کرتا ہوں۔

اللہ ہم سب کو اپنی آخرت اور رضا کے لیے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ الضحیٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾﴾

شانِ نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے ایک دو راتیں تہجد کے لیے نہیں اٹھ سکے تو ابو لہب کی بیوی ام جمیل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جملے کسے کہ ان کے خدا نے ان کو چھوڑ دیا ہے تو اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ دنوں کے لیے وحی نہیں آئی تو ابو لہب کی اس بیوی نے کہا کہ ان کو ان کے ساتھی نے چھوڑ دیا ہے تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔

تاخیرِ وحی کے واقعات کئی بار پیش آئے ہیں۔ ایک بار جب مشرکینِ مکہ نے یا یہود نے تین سوال کیے تھے کہ روح کیا چیز ہے؟ وہ کون نوجوان تھے جو غار میں چلے گئے تھے؟ اور وہ کون شخص ہے جس نے مشرق اور مغرب پر حکومت کی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کا جواب کل بتاؤں گا۔ چونکہ ان شاء اللہ نہیں کہا تھا اس لیے سترہ دن تک وحی نہیں آئی۔ اس پر بھی مشرکین نے شور مچایا تھا کہ دیکھو! ان کے خدا نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح ابتدا میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تین سال تک وحی بند رہی جسے فترت وحی کا زمانہ کہتے ہیں۔ تو خلاصہ سب کا ایک ہی ہے کہ کچھ دنوں کے لیے وحی نہیں آئی تو اس پر ان لوگوں نے شور مچایا تھا۔

چاشت اور رات کی قسم کھانے کی وجہ:

﴿وَالضُّحٰى ۝١ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝٢ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝٣﴾

قسم ہے سورج کی دھوپ چڑھنے کی اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔

نہ ہی آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی آپ کا رب آپ سے بیزار ہوا ہے۔

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝٤﴾

آپ کی بعد والی حالت پہلی والی حالت سے بہتر ہے۔

اللہ رب العزت آپ کی ہر بعد والی حالت کو پہلے والی حالت سے بہتر بناتے ہیں، جب اللہ چھوڑ دیں گے تو بعد والی حالت پہلے والی حالت سے بدتر ہو گی لیکن اللہ نے نبوت کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ آپ کو چھوڑ دیں؟! تو اللہ رب العزت نے قسمیں کھا کر یہ بات سمجھائی ہے۔

یہاں ایک بات تو یہ سمجھیں کہ یہاں قسم سورج کے نکلتے وقت کی روشنی کی ہے اور قسم رات کے چھا جانے کی ہے، سورج نکلتا ہے تو شروع میں روشنی کم ہوتی ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، رات آہستہ آہستہ پھیلتی ہے اور پھر چھا جاتی ہے۔ اللہ نے یہ قسمیں کھا کر فرمایا:

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝٤﴾

آپ کی ہر بعد والی حالت پہلے والی حالت سے مزید بہتر ہوتی ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی شروع میں کم ہوتی ہے پھر زیادہ ہوتی جاتی ہے، رات کی تاریکی شروع

میں کم ہوتی ہے پھر زیادہ ہو جاتی ہے۔ تو سورج کا کمال دن کو خوب روشن ہونا ہے اور رات کا کمال خوب اندھیرا ہونا ہے، اس طرح آپ کی بعد والی حالت پہلے والی حالت سے مزید بہتر ہوتی ہے، کم نہیں ہوتی۔ تو یوں قسمیں کھا کر اللہ رب العزت نے بات سمجھائی ہے۔

آخرت کے دنیا سے بہتر ہونے کا معنیٰ:

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴﴾

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بہتر ہے۔ دنیا میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے اور آخرت میں اعزاز اس سے زیادہ ہو گا۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بعد والی حالت پہلے والی حالت سے بڑھ کر ہے۔ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن ہے.. ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی ہے تو جوانی؛ بچپن سے بڑھ کر ہے۔ جوانی کے بعد بڑھاپا ہے تو یہ بڑھاپا؛ جوانی سے بڑھ کر ہے۔ اعلان نبوت نہیں ہوا تھا پھر اعلان نبوت ہوا۔ تو اعلانِ نبوت ہونے کی زندگی اعلانِ نبوت نہ ہونے سے زیادہ بڑھ کر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی زندگی میں تھے تو فتوحات کم تھیں اور جب مدینہ میں گئے تو فتوحات بڑھ گئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی؛ مکی زندگی سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح دنیا میں عبادت بھی ہے اور مشقت بھی ہے اور موت کے بعد مشقت نہیں صرف انعامات ہیں تو آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بڑھ کر ہے۔

جب ان سب چیزوں کا موازنہ کریں گے تو پھر یہاں سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیات وہ ہے جو دنیا میں ہے اور ایک

حیات وہ ہے جو برزخ میں ہے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیاوی حیات عالمِ ارواح کی حیات سے اعلیٰ ہے تو عالمِ برزخ کی حیات؛ عالمِ دنیا کی حیات سے اعلیٰ ہے اور عالمِ آخرت کی حیات؛ عالمِ برزخ کی حیات سے مزید اعلیٰ ہے۔ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ عالمِ ارواح کی جو حیات ہے تو اس کے ساتھ دنیاوالا جسد نہیں اور دنیا کی جو حیات ہے اس میں روح مبارک بھی ہے اور جسد مبارک بھی ہے تو حیات بڑھ گئی ہے، اسی طرح جو برزخ کی حیات ہے وہ دنیا کی حیات سے مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ دنیا کی حیات میں مشقتیں ہیں اور برزخ کی حیات میں کوئی مشقت نہیں ہے، اور برزخ میں جسم کی حیات بھی ہے اور روح کی حیات بھی ہے اور حشر کے بعد کی جو حیات ہے وہ عالمِ برزخ کی حیات سے بھی بڑھ کر ہے۔ عالمِ برزخ کی حیات حشر پر ختم ہو جائے گی اور حشر کے بعد والی جو زندگی ہے وہ نہ ختم ہونے والی ہے۔ تو عالمِ برزخ کی حیات کی جو مدت ہے اس نے عالمِ حشر پر ختم ہو جانا ہے پھر ایک اگلی زندگی شروع ہونی ہے جو ابدی ہے۔ تو ابدی زندگی یہ غیر ابدی زندگی سے اعلیٰ ہوتی ہے، اس لیے وہ حیات اس حیات سے بھی اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس کو ذہن نشین فرمالیں۔

عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں ہیں۔ کوئی شخص وہاں روضہ مبارک پر سلام بھیجے اور آہستہ آواز سے کہے تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن لیتے ہیں اور دنیا کی حیات میں یوں نہیں ہے۔ دنیا کی حیات میں کوئی شخص آہستہ سے آواز دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں سنتے، تھوڑا سا اونچی بات کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن لیتے ہیں اور برزخ میں کوئی آہستہ بھی کہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن لیتے ہیں۔ اس کا معنی ہو گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سماع برزخ کا ہے وہ دنیا کے سماع سے اعلیٰ ہے اور اس کو بڑے آرام سے عقلی انداز میں سمجھایا جا سکتا ہے۔

جو لوگ سماع فی القبر کا انکار کرتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کے گھر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا تو صحابی نے جواب دیا لیکن آہستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سلام کیا انہوں پھر جواب دیا لیکن آہستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا نہیں، آپ نے تیسری بار جب سلام فرمایا تو انہوں نے جواب دیا لیکن آہستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آنے لگے کہ شاید وہ گھر میں نہیں ہیں تو وہ صحابی باہر نکل کر آ گئے۔ انہوں نے کہا" یارسول اللہ! آپ نے سلام فرمایا تھا، میں نے سنا تھا اور میں نے جواب آہستہ دیا تھا اس لیے کہ آپ کا سلام ہمارے لیے بہت بڑی دعا ہے، تو میں چاہتا تھا کہ یہ دعا آپ کی بار بار ہو اس لیے میں آہستہ سے جواب دے رہا تھا کہ آپ جواب نہ سنیں اور پھر سلام کریں۔ [93]

اس روایت سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں کہ دیکھو! درمیان میں دیوار حائل تھی اور صحابی نے آہستہ جواب دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا اور موت کے بعد ایک دیوار باہر کی ہے، ایک دیوار اندر قبر کی ہے اور ایک دیوار برزخ کی ہے۔ تو تین دیواریں حائل ہیں تو پھر کیسے سنیں گے؟

ہم نے کہا کہ یہ جو آپ دلیل پیش کرتے ہیں یہ خود دلیلِ سماع ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں۔ دیکھو درمیان میں دیوار حائل تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام فرمایا تو صحابی نے سن لیا نا؟! (جی ہاں۔ سامعین) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں سماع تو ہے نا! اور صحابی نے آہستہ کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا، اس کا مطلب کہ سماع ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ آہستہ ہو تو نہیں سنتے اور اونچا ہو تو سنتے

93۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج7 ص287 رقم الحدیث 15069

ہیں۔ اس سے سماع کا انکار تو نہیں ہو رہا۔

آگے رہا یہ مسئلہ کہ یہاں آہستہ جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا اور قبر پر آہستہ کہیں تو پھر بھی سن لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اصالۃ اور براہِ راست سماع ہوتا ہے جسم کا اور جسم کے واسطہ سے سماع ہوتا ہے روح کا، اور قبر میں براہِ راست سماع ہوتا ہے روح کا اور روح کے واسطہ سے ہوتا ہے جسم کا۔ اب ظاہر ہے کہ جسم کا سماع کمزور ہے اور روح کا سماع زیادہ ہے، اور پھر قبر میں جو روح کی پرواز ہے وہ اتنی بڑھی ہوتی ہوتی ہے کہ بہت آہستہ کہو تو بھی سن لیتی ہے کیونکہ پرواز بڑھ جاتی ہے۔ اور پرواز کیسے بڑھتی ہے؟ اس کو ذرا سمجھ لیں۔

روح اور جسم کے تین تعلقات:

دنیا میں روح اور جسم کا تعلق تین طرح کا ہے:

1: تعلقِ تصرف

2: تعلقِ تدبیر

3: تعلقِ حیات

تعلقِ تصرف کا معنی روح کا جسم کے ساتھ وہ تعلق جس کی وجہ سے جسم از خود اپنا کام اپنے اختیار سے کرتا ہے جیسے اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، جاگنا... یہ کام ہوتے ہیں۔

اور تعلقِ تدبیر؛ جس تعلق سے جسم کے کام غیر اختیاری طریقے سے خود بخود ہوتے ہیں جس طرح روح اور جسم کے تعلق سے ہم چاہیں نہ چاہیں کھانا ہضم ہو رہا ہے، ہم چاہیں نہ چاہیں خون کی گردش ہو رہی ہے، ہم چاہیں نہ چاہیں نبض چل رہی ہے تو یہ تدبیر کا تعلق ہے۔ پورے جسم کا جو نظام ہے خود بخود چل رہا ہے، ہمارے اختیار کے بغیر چل رہا ہے۔

اور روح اور جسم ایک کا تعلق وہ ہے کہ جس سے جسم کو حیات ملتی ہے۔ جب آدمی جاگ رہا ہوتا ہے تو روح اور جسم کے تینوں تعلق باقی رہتے ہیں؛ تعلقِ تصرف، تعلقِ تدبیر اور تعلقِ حیات۔ روح کی رفتار بہت کم ہوتی ہے، روح دور جاتی ہی نہیں اور جب آدمی سو جاتا ہے تو روح کا تعلقِ تصرف ختم ہو جاتا ہے تو دو تعلق رہتے ہیں۔ اب روح کی پرواز بڑھ جاتی ہے۔ اب جب آدمی سوتا ہے تو کسی کی روح مکہ چلی جاتی ہے.. کسی کی مدینہ چلی جاتی ہے.. کسی کی کہاں.. کسی کی کہاں.. جیسی روح ہوتی ہے ویسی جگہ پر چلی جاتی ہے۔

لیکن جب انسان جاگ رہا ہو اور جاگتے ہوئے کہے کہ یار میں نے ابھی مکہ مکرمہ دیکھا ہے تو لوگ اسے کہیں گے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے! یہاں بیٹھ کر تو مکہ نظر نہیں آتا۔ اور اگر سونے والا کہے کہ میں دورانِ سبق سو گیا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کعبہ کی زیارت کر رہا ہوں، کعبہ کا طواف کر رہا ہوں تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ کعبہ کا طواف جسم نہیں کر رہا بلکہ روح کر رہی ہے۔ صرف ایک تعلقِ تصرف کم ہوا ہے تو روح کی پرواز کتنی بڑھ گئی ہے!

اور جب آدمی پر موت آتی ہے اور قبر میں چلا جاتا ہے تو تعلقِ تدبیر بھی ختم ہو جاتا ہے، تعلقِ حیات بھی ختم ہو جاتا ہے موت جو آ گئی ہے! اب روح الگ ہے اور جسم الگ ہے لیکن جب دوبارہ روح کا اعادہ ہوتا ہے تو تعلقِ حیات ہو جاتا ہے، تعلقِ تدبیر ختم ہو جاتا ہے۔ اب قبر مبارک میں جو روح اور جسم کا تعلق ہے تو تعلقِ تصرف اور تعلقِ تدبیر کے بغیر ہے۔ تو جب تعلقِ تصرف ختم ہو جائے تو روح کی پرواز اتنی بڑھتی ہے اور جب روح کا تعلقِ تدبیر بھی ختم ہو جائے اب بتاؤ روح کی پرواز کتنی ہو گی؟

اب مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر ہو اور ہم یہاں سے

سلام کریں اور روح مدینہ منورہ میں سن لے یہ عقل کے خلاف نہیں ہے، عقل اس کی نفی نہیں کرتی لیکن چونکہ شرع کی اس پر دلیل نہیں ہے اس لیے ہم اس کے قائل نہیں ہوتے، ہم قائل اس بات کے ہیں کہ روضہ مبارک پر پڑھیں تو خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھیں تو فرشتے پہنچاتے ہیں حالانکہ دور سے سماع پر عقل مخالف نہیں ہے۔ جتنا شریعت سے ثابت ہے ہم اتنا مانتے ہیں اور جو ثابت نہیں وہ نہیں مانتے! اسی کا نام اعتدال ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کب راضی ہوں گے؟

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝٥﴾

آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذًا لَّا أَرْضٰى وَوَاحِدٌ مِنْ أُمَّتِيْ فِي النَّارِ.[94]

میرا ایک امتی بھی جہنم میں ہوا تو میں راضی نہیں ہوں گا۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے بارے میں اللہ میری شفاعت کو قبول فرمائیں گے۔ اللہ فرمائیں گے "رَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ؟" کیا آپ راضی ہو گئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے: "يَا رَبِّ رَضِيْتُ" ہاں اللہ میں راضی ہو گیا ہوں، میں خوش ہو گیا ہوں۔[95]

پیغمبر پاک پر نعمتِ خداوندی:

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝٦﴾

94۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج31 ص192

95۔ الجامع لاحکام القرآن القرطبی: ج2 ص3335

اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے کہ میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ ہم نے تو ہمیشہ آپ کی مدد کی ہے، یہ جو لوگ باتیں کر رہے ہیں یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ فرمایا: کیا آپ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا پھر اللہ نے آپ کو ٹھکانا دیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت آپ علیہ السلام کے دادا نے کی، وہ فوت ہوئے تو چچا ابو طالب نے کی۔ اب دیکھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ایمان سے محروم ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اللہ نے اس قدر ان کے دل میں ڈال دی کہ سائے کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور بہت خیال رکھا۔

﴿وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿٧﴾﴾

آپ شریعت سے ناواقف تھے، بے خبر تھے، اللہ نے آپ کو شریعت کا راستہ دکھا دیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، جب تک اعلانِ نبوت نہیں ہوا شریعت آپ کے علم میں نہیں تھی، اللہ نے بعد میں دی ہے۔

﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿٨﴾﴾

آپ نادار تھے، آپ کے پاس مال نہیں تھا تو اللہ نے غنی فرمادیا۔

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿٩﴾ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿١٠﴾ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿١١﴾﴾

اب آپ یتیم پر سختی نہ کریں، سائل کو نہ ڈانٹیں! اور اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا کریں۔

تین احسانات اور تین اہم احکامات:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یہاں تین حکم فرمائے ہیں اور اس

سے پہلے اللہ نے تین احسانات یاد کرائے ہیں:

- پہلا حکم دیا... "فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ" کہ آپ نے یتیم پر سختی نہیں کرنی! اس لیے اللہ نے ماضی یاد دلایا، فرمایا: "اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی" جب سامنے کوئی یتیم آئے تو اپنی یتیمی کو اپنے ذہن میں رکھیں! پھر یتیم پر سختی نہ کرنا بہت آسان ہو گا۔
- دوسرا حکم دیا.... "وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ" کہ جب کوئی مانگنے والا آئے تو اسے جھڑ کنا مت!

اس حکم کا تعلق "وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی" اور "وَ وَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰی" دونوں کے ساتھ ہے کہ دیکھیں آپ کے پاس شریعت کا علم نہیں تھا اور اللہ نے دیا ہے، آپ کے پاس مال نہیں تھا خدا نے دیا ہے۔ اب "وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ" اگر کوئی سائل آپ کے پاس شریعت کا مسئلہ پوچھنے کے لیے آئے تو ڈانٹیں مت بلکہ اسے مسئلہ سمجھائیں، پہلے آپ کو بھی مسائل نہیں آتے تھے ہم نے بتادیے ہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص مانگنے کے لیے آئے، مال کا سوال کرے تو "فَلَا تَنْهَرْ" اسے بھی مت ڈانٹیں، اس کو مال دیں، کیونکہ آپ کے پاس بھی مال نہیں تھا ہم نے آپ کو مال دیا ہے۔ تو "وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ" کا تعلق دونوں کے ساتھ ہے۔

- تیسرا حکم دیا... "وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"... آپ اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار فرمائیں، جو اللہ نے نعمتیں آپ کو دی ہیں ان کا آپ زبان سے تذکرہ بھی کریں۔

اس حکم کا تعلق پوری سورت کے ساتھ ہے کہ جتنی نعمتیں ہم نے آپ کو دی ہیں، ان سب نعمتوں کا اظہار آپ اپنی زبان سے کریں اور بیان کریں۔ جب اللہ کسی کو

دولت عطا فرمائیں تو اس پر دولت کے آثار نظر آنا اللہ کو پسند ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ بندہ میری نعمت کا اظہار کرے۔

اس سورۃ الضحیٰ سے لے کر سورۃ الناس تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے۔ تکبیر کے الفاظ ہیں: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاللہُ اَکۡبَرُ" اس تکبیر کو سورت شروع میں پڑھ لیں یا سورت کے آخر میں پڑھ لیں دونوں طرح سے ثابت ہے۔ آپ سب ایک مرتبہ پڑھ لیں۔ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاللہُ اَکۡبَرُ"

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَآ أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورۃ الم نشرح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۙ﴿۲﴾﴾

اس سورت مبارکہ میں اللہ رب العزت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی نعمتوں کا اظہار فرمارہے ہیں۔ سورۃ الضحیٰ سے لے کر آخر تک جو سورتیں ہیں۔ تقریباً بائیس ہیں۔ ان تمام سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا ذکر ہے، درمیان میں کچھ قیامت کا ذکر بھی ہے لیکن اصل ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا ہے۔ جب قرآن مجید شروع ہوا تو:

﴿الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚ فِیۡہِ﴾

وہاں قرآن کی عظمت بیان کی اور جہاں قرآن ختم ہوا ہے تو وہاں صاحبِ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کا آغاز ہوا تو وہاں قرآن کی عظمت کا بیان تھا اور جہاں قرآن ختم ہو رہا ہے تو وہاں صاحبِ قرآن کی عظمت کا بیان ہے۔ فرمایا:

شرحِ صدر کا معنی:

﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ﴿۱﴾﴾

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟!

اس کے دو معنی ہیں:

نمبر 1: جو شقِ صدر ہوا تھا؛ باضابطہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا گیا، قلب مبارک کو باہر نکالا گیا اور زمزم کے پانی سے دھو کر علوم ومعرفت سے اس کو بھر دیا گیا۔

نمبر 2: ہم نے آپ کو علوم کی وسعت عطا کی ہے اور مخالفین کی مخالفت کو برداشت کرنے کا تحمل دیا ہے۔ ہم نے آپ کا سینہ بڑا کر دیا ہے۔

”آپ کا بوجھ اتار دیا“ کا معنیٰ:

﴿وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۝ الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۝﴾

ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ اتار دیا ہے وہ بوجھ جس نے آپ کی پشت کو جھکا کے رکھ دیا تھا۔

اس کا ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے تھے اور بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا کام فرما لیتے کہ آپ سمجھتے کہ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا تو اس پر آپ کو بہت زیادہ افسوس ہوتا، اتنا افسوس ہوتا کہ گویا مجھ سے خطا ہو گئی ہے۔ اللہ رب العزت نے تسلی دی ہے کہ نہ ان باتوں کا آپ سے مواخذہ ہے اور نہ ان پر آپ کی پکڑ ہے۔ آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ میں جب حساسیت پیدا ہو گی یہ آیت پھر سمجھ آئے گی کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے! بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ کہتا ہے کہ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا، یار میں نے کر لیا! حالانکہ آدمی اپنے ذوق سے اس کو ٹھیک سمجھ رہا ہوتا ہے اور پھر اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

دوسرا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ چونکہ پورے عالَم کے نبی تھے اور یہ ایسا بڑا بوجھ تھا کہ جب آپ سوچتے تو کانپ جاتے حتیٰ کہ جوانی میں بڑھاپے کے آثار نظر آتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کو کس چیز نے بوڑھا کیا؟ فرمایا کہ

سورت ھود نے۔ سورت ھود کی کون سی آیت؟ فرمایا: "فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ"[96]

اب اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوچتے کہ میں پوری دنیا کا نبی ہوں، پوری دنیا کو سنبھالنا ہے، پوری دنیا کو دعوت دینی ہے اور تنہا مکہ میں ہوں، ساتھ گھر کے بندے بھی نہیں ہیں، خاندان کے بھی نہیں ہیں، جان کے دشمن ہیں تو پوری دنیا میں کیسے پہنچوں گا، فرمایا:

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣﴾

ہم نے آپ کو اتنا بڑا دل دیا ہے کہ آپ کے لیے تحمل آسان ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ جس بوجھ نے آپ کی کمر کو توڑ دینا تھا ہم نے اس بوجھ سے بھی آپ کو بچا لیا۔ آپ کا دل اتنا بڑا ہو گیا کہ مشکل آپ کو مشکل محسوس نہیں ہوتی۔

ایکسیڈنٹ کا واقعہ:

جب دل بہت بڑا ہوتا ہے تو پھر مشکلیں مشکل محسوس نہیں ہوتیں، بندہ مشکلات میں بھی ہنس رہا ہوتا ہے، کھیل رہا ہوتا ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ انجوائے کر رہا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایک تو ایکسیڈنٹ؛ حادثے بہت ہوئے ہیں، آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ ایک بار یہ ہماری سڑک بن رہی تھی اور میں خود گاڑی چلا رہا تھا۔ مولانا شمس الرحمٰن صاحب ہمارے کراچی کے امیر ہیں، ان کا نکاح تھا لاہور میں، مجھے کہا کہ استاد جی میری بڑی خواہش ہے کہ نکاح آپ پڑھائیں! میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

میں خود سرف گاڑی لے گیا، ساتھ لڑکا بیٹھا ہوا تھا، مجھے بخار بھی تھا اور گاڑی بھی چلا رہا تھا۔ واپسی پر مغرب کے بعد سخت بارش ہوئی اور اندھیرا بھی تھا۔ گاڑی کی لائٹوں میں بھی دیکھنا مشکل تھا۔ تو پیچھے ایک پُل ہے "پُل مانگنی" وہاں سے میں آیا تو

96۔ تفسیر الدر المنثور: ج3 ص576 تفسیر سورۃ ھود

جیسے ہی میں نے کراس کیا تو میں نے پوچھا کہ کون سی جگہ ہے؟ لڑکا کہتا ہے کہ استاد جی! یہ 84 چک ہے - یہ ہمارے 87 کے ساتھ والا - ہم قریب آ گئے ہیں۔ تو میں نے سمجھا کہ دسواں میل [چک 87 کے بالکل قریب ایک پُل کا نام] ہو گا، اسی طرح کا پل تھا۔ آگے روڈ ٹوٹا ہوا تھا، جب میں نے اس طرف گاڑی موڑی اور سیدھی لانے لگا تو تقریباً دو فٹ کی گہرائی کھودی ہوئی تھی، اسی سپیڈ سے گاڑی سیدھی اندر گئی، گاڑی بڑی تھی پھر ایسے اوپر اٹھی پھر نیچے گری، گاڑی الٹی ہو گئی، اب ظاہر ہے کہ پٹرول گرنا بھی شروع ہو گیا اور بارش بھی ہو رہی تھی، شیشہ ٹوٹا تو میں وہاں سے باہر نکلا، لوگ دوڑے کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہو گا۔ باہر نکلا تو میں ہنس رہا تھا۔

اب ان لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ یار ہم آئے کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہو گا اور یہ ہنس رہا ہے! میں نے کہا کہ بس گاڑی بند کرو، بارش ہو رہی تھی اس لیے بارش سے آگ نہیں لگی۔ اس کے بعد میں نے فون کیا اور رینٹ کی گاڑی منگوائی۔ میں نے کہا کہ میں مرکز جاتا ہوں، گاڑی صبح لے آنا۔ مرکز گاڑی لے آئے۔ میں نے پٹیاں لگائیں، کپڑے سیٹ کیے اور ٹھیک تھا۔ میں طلبہ میں آ گیا، میں نے کہا جب اللہ نے بچا لیا تو اب کیا رونا دھونا!

ہم نے آپ کا نام بلند کر دیا:

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾﴾

اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا نام بلند کر دیا ہے۔

جہاں اللہ کا نام ہو گا وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی ہو گا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

إِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتَ مَعِي.[97]

میرے ساتھ آپ کا بھی تذکرہ کیا جائے گا، ہمیشہ آپ کا نام لیا جائے گا۔

ایک تکلیف اور دو راحتیں:

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝۶﴾

میرے پیغمبر! اگر آپ پر مشکلات ہیں تو مشکلات کے بعد آسانیاں بھی ہیں، ہم مشکل دیں گے تو مشکل کے بعد آسانی بھی دیں گے۔

یہ آپ نے پڑھا ہو گا "الْعُسْرِ" پر الف لام تعریف کا ہے جس سے عسر کا لفظ معرفہ بنا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ معرف باللام کا اگر تکرار ہو تو اس دوسرے لفظ سے مراد ایک چیز یعنی وہی پہلے والی چیز ہوتی ہے اور اگر نکرہ کا تکرار ہو تو اس سے مراد دو چیزیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یہاں ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝۶﴾ میں "الْعُسْرِ" معرفہ ہے اور تکرار کے ساتھ ہے اور "یُسْرًا" نکرہ ہے اور یہ بھی تکرار کے ساتھ آیا ہے، اس کا معنی کہ ایک "عُسر" پر اللہ دو "یُسر" دیں گے، ایک تنگی پر اللہ دو آسانیاں دیں گے۔ آپ نے نور الانوار میں یہ شعر پڑھا ہو گا:

اِذَا اشْتَدَّتْ بِكَ الْبَلْوٰی فَفَكِّرْ فِيْ اَلَمْ نَشْرَحْ

فَعُسْرٌ بَيْنَ يُسْرَيْنِ اِذَا فَكَّرْتَهٗ فَافْرَحْ[98]

کہ جب پریشانیاں اور مصیبتیں تمہیں گھیر لیں تو سورۃ الم نشرح میں غور کیا کرو! اس میں دو یسر کے درمیان ایک عسر ہے، کیا مطلب کہ ایک مصیبت پر اللہ دو خوشیاں دیتے ہیں، جب اس کو پڑھو گے، اس میں غور کرو گے تو خوش ہو جاؤ گے!

97۔ صحیح ابن حبان: ص944 کتاب الزکاۃ باب فی ذکر نعم المنعم رقم الحدیث 3382

98۔ نور الانوار: ص90

لیکن یہ بات سمجھ لیں کہ یہاں "الْعُسْرِ" سے مراد عام عسر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسر ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف ہے اللہ ہر تکلیف پر کم از کم دو آسانیاں دیں گے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی ہے کہ مشکلات ختم ہو جائیں گی اور آسانیاں شروع ہو جائیں گی۔ اگر کسی بندے کو مشکلات کے بعد راحت نہ ملے، مشکلات ہی ملیں تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس آیت کے خلاف ہے کیونکہ یہ ہر فرد کے لیے نہیں ہے بلکہ خالصتاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ اللہ اپنے کرم سے ایسا ہی کرتے ہیں کہ جب کوئی تکلیف آئے اور بندہ ڈٹ جائے اور برداشت کرے تو اللہ اس کے بعد آسانیاں پیدا فرما دیتے ہیں لیکن اصلاً یہ وعدہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔

رجوع الی اللہ؛ کام بڑھانے کا ذریعہ

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾

جب آپ عبادات سے فارغ ہو جائیں -ایسی عبادات جسے تبلیغ کہتے ہیں- پھر آپ ذاتی عبادات میں مشغول ہو جائیں، اور اپنے اللہ کی طرف متوجہ رہیں۔

عبادات دو قسم کی ہیں؛ بعض وہ ہیں کہ جن سے اجر تو ملتا ہے لیکن مقصود اس سے دوسروں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے اور بعض عبادات وہ ہیں کہ جن سے مقصود اپنے آپ کو نفع پہنچانا ہوتا ہے۔ مثلاً میں ابھی آپ کو سبق پڑھا رہا ہوں، آپ کا مقصد بھی اجر ہے اور میرا مقصد بھی اجر ہے تو سب کا مقصود ثواب ہی ہے لیکن سبق پڑھانے سے آپ کو سمجھانا مقصود ہے خود سمجھنا مقصود نہیں ہے۔ ایک شخص مصلیٰ پر امام بنتا ہے اس کا مقصد اپنی نماز نہیں بلکہ دوسروں کو جماعت کرانا ہوتا ہے، قاری صاحب درسگاہ میں بیٹھتے ہیں تو ان کا مقصد قرآن کو خود پڑھنا نہیں بلکہ بچوں کو پڑھانا ہوتا ہے۔

تو بعض عبادات وہ ہیں کہ جن سے مقصود دوسروں کو نفع ہوتا ہے اور فرض سے پہلے جو ہم سنتیں پڑھتے ہیں تو ان سے مقصود اپنی ذات ہوتی ہے، جب رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں تو اس کا نفع اپنی ذات کو دینا مقصود ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت اپنے پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہے ہیں کہ جب آپ ان عبادات سے فارغ ہو جائیں جن کا مقصد امت کو نفع دینا ہے تو اب اُن عبادات میں مشغول ہو جائیں جن کا مقصد اپنی ذات کو نفع دینا ہے، جب دعوت اور تبلیغ سے آپ فارغ ہو جائیں تو پھر ذکر کریں، پھر نوافل پڑھیں، پھر تلاوت کریں، پھر غور و فکر کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ حکم پیغمبر کو ہوتا ہے یہی حکم پیغمبر کے وارث کو بھی ہے۔ علماء کو چاہیے کہ کچھ وقت ایسا نکالیں کہ جو خالص اپنی ذات کے لیے ہو، اس میں ذکر کا اہتمام کریں، تلاوت کا اہتمام کریں، تہجد کا اہتمام کریں خالص اپنی ذات کے لیے۔ میں اسی لیے روتا ہوں کہ علماء کو ذکر دوسروں سے زیادہ کرنا ضروری ہے، علماء کے لیے تہجد دوسروں سے زیادہ ضروری ہے۔

عبادات کی دو قسمیں:

قرآن کریم میں اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ عبادات جن سے دوسروں کو نفع پہنچانا مقصود ہوتا ہے ان کے ساتھ ہے "فَرَغْتَ" کہ جب آپ ان سے فارغ ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عبادات جن کا مقصد اپنی ذات کو نفع پہنچانا ہے ان سے بندہ کبھی فارغ نہیں ہوتا اور جن سے مقصد دوسروں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے ان سے بندہ فارغ ہو جاتا ہے۔ سبق پڑھانے کا تو خاص وقت ہو گا، تقریر کا خاص وقت ہو گا اور تصنیف کا خاص وقت ہو گا لیکن اپنی ذات کے لیے اللہ اللہ کرنے کے لیے کوئی خاص وقت نہیں ہو گا! اس لیے کوشش کر کے ہمیں اس میں مشغول رہنا چاہیے۔

خود کو تھکا دیں!

اور پھر لفظ "فَانْصَبْ" یہ نصب سے ہے، "فَانْصَبْ" کا معنی ہے ایسے مشغول ہوں کہ آپ تھکاوٹ محسوس کریں۔ اتنا ذکر نہیں جس پر طبیعت خوش ہو بلکہ اتنا ذکر کریں کہ تھکاوٹ محسوس ہو، اتنے نوافل نہیں جن سے ہشاش بشاش ہوں بلکہ اتنے نوافل پڑھیں جن سے جسم کو تھکاوٹ محسوس ہو۔

اب ہم خود اندازہ کریں کہ ہم کتنا ذکر کرتے ہیں؟ ہم تلاوت کتنی کرتے ہیں؟ ہم تہجد کتنی پڑھتے ہیں؟ اس لیے ہم تمام یہ نیت کریں کہ موت تک تہجد نہیں چھوڑیں گے... اوابین، اشراق نہیں چھوڑیں گے، تلاوت کریں گے؛ یہ مزاج بنالیں۔ ہمارے جتنے مشائخ ہیں ہم سب کی قدر کرتے ہیں اور بہت عزت کی نگاہ سے ان کے فرمودات کو دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن ہر کسی کا اپنا ذوق ہوتا ہے۔ میرا اپنا ذوق یہ ہے کہ مسنون اعمال کا اہتمام کروں، بس مسنون اعمال پر زور دوں۔

مصیبت کے وقت کی دعا:

مجھ سے اکثر ساتھی پوچھتے ہیں کہ ہم مصیبت میں کیا پڑھیں؟ میں کہتا ہوں کہ "یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ" اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہی پڑھتے تھے اس لیے آپ بھی یہی پڑھیں۔ اسی طرح اگر کوئی تکلیف ہوگئی ہو تو یہ پڑھیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ [99]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھتے تھے۔ آپ بھی یہ پڑھیں۔ جو مسنون چیزیں ہیں ان کا اہتمام کریں۔ مجھے لوگ کہتے ہیں جی! ہمارے لیے دعا کرو۔ میں کہتا

99۔ سنن ابن ماجۃ، رقم:3869

ہوں کہ فرض نماز کے بعد آپ خود اپنے لیے دعا کیا کرو، جب فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے تو بس اسی کا اہتمام کرو، اس کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جی! میرا مسئلہ ہے اس کے لیے آپ استخارہ کریں۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی! کام آپ کا ہے اور استخارہ ہم کریں، آپ خود استخارہ کر لیں۔ اور استخارے والے لوگ بھی عجیب تماشے ہیں، اُس لڑکی کی تصویر بھی دیں گے کہ اس کو ذرا دیکھ لو اس سے میں نے شادی کرنی ہے! -اللہ حفاظت فرمائے- بس ان خرافات سے بچو! یقین کرو کہ اس سے کچھ بھی نہیں ہوتا، وقتی خواہشات پوری ہوتی ہیں.. وقتی شہوتیں پوری ہوتی ہیں.. وقتی طور پر دو چار روپے مل جاتے ہیں اور انجام اس کا ذلت ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ التین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾ وَ طُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ ہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾﴾

انجیر، زیتون، طورِ سینین اور مکہ مکرمہ کی قسم:

اللہ رب العزت نے یہاں چار قسمیں کھائی ہیں:

[1] انجیر کے درخت کی قسم، [2] زیتون کے درخت کی قسم، [3] طورِ سینین کی قسم، [4] مکہ مکرمہ کی قسم۔

ان قسموں سے یا تو خاص انہی درختوں کی قسمیں مراد ہیں یا ان شہروں کی قسمیں مراد ہیں جہاں یہ درخت اگتے ہیں اور وہ علاقہ شام ہے جہاں پر زیتون بھی ہوتا ہے اور انجیر بھی ہوتا ہے۔ "طور" تو پہاڑ کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہمکلام ہوئے تھے اور سینین یا سیناء اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ طور پہاڑ ہے۔ ﴿ہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ﴾ سے مراد شہر مکہ مکرمہ ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور اپنی ابتدائی زندگی یہاں گزاری ہے۔ یہ قسمیں کھا کر مضمون بیان فرمایا۔

انسان اللہ کی قدرت کا حسین شاہکار:

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾﴾

ہم نے انسان کو دنیا کی سب سے اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾

اس کے بعد ہم انسان کو دنیا کی بدترین حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے،نیک اعمال کیے تو ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔

پہلے تو اللہ نے چار قسمیں کھا کر انسان کے حسن صورت کو بیان کیا ہے کہ ہم نے اس کو شکل کتنی اچھی عطا کی ہے! ایک حدیث پاک میں ہے:

"خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ." [100]

اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ یہ متشابہات میں سے ہے۔ بعض حضرات اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی صفات کا کچھ حصہ انسان کو عطا فرمایا ہے۔

آیت کے دو مطلب:

اس آیت کے دو مطلب ہیں:

[1]: "الانسان" سے مراد کافر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کافر ہے ہم اس کی بعد کی زندگی کو بدترین بنا دیتے ہیں، ہم نے اس کی شکل وصورت بہت اچھی بنائی ہے لیکن جب وہ ایمان اور عملِ صالح کو اختیار نہیں کرتا تو اس کی ظاہری شکل تو بڑھاپے میں ویسے ہی بدتر ہو جاتی ہے اور اس کی موت کے بعد کی زندگی اس سے بھی بدتر بنا دیتے ہیں، ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ہاں جو ایمان والے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں تو ان کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

ظاہری شکل تو ان کی بھی تبدیل ہو جاتی ہے، بڑھاپے میں شکل وصورت جوانی والی

100۔ صحیح البخاری، رقم: 6227

نہیں رہتی لیکن اس کا اثر صرف دنیا پر ہو گا، انجام بہر حال ان کا اچھا ہے ﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ کیونکہ ایمان اور نیک اعمال ان کے موجود ہیں، ظاہری شکل اچھی نہیں بھی رہی تو پھر بھی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس صورت نے تو ختم ہونا ہی ہے، کافر کی بھی اور مؤمن کی بھی لیکن کافر کا آخرت کا انجام بہت برا ہو گا اور مؤمن کو آخرت میں ایسی شکل وصورت ملے گی کہ جس کا دنیا میں کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جس طرح حدیث پاک میں ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے جس کا نام ہے؛ سُوق الصُّوَر تصویروں والا بازار، اس میں صرف تصویریں لٹکی ہوئی ہیں، جنتی اس بازار میں جائیں گے سیر کے لیے تو جی چاہے گا کہ بال ایسے ہوں تو بال ویسے ہی بن جائیں گے، شکل ایسی ہو تو ویسی بن جائے گی، ڈیزائن ایسے ہو تو ویسے ہی بن جائے گا۔ جیسے حجاموں کی دکانوں پر آپ نے دیکھا ہو گا کہ بالوں کی کٹنگ کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جنتی جو شکل چاہیں گے ویسی بن جائے گی اور جب گھر جائیں گے تو بیگم پہچان بھی لے گی کہ یہ وہی ہے، ایسا نہیں ہو گا کہ بیگم کو پتا ہی نہ چلے کہ یہ میرے گھر میں کون آ گیا! وہاں سب پہچان لیں گے کہ یہ وہی ہے اللہ ایسی صورت پیدا فرما دیں گے۔ ایک معنی تو یہ ہے۔

[2]: اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو بہت خوب صورت شکل میں پیدا فرماتے ہیں لیکن جوانی کے بعد شکل بگڑتی ہے، بڑھاپے کی طرف آتے ہیں تو جوانی والی شکل وصورت باقی نہیں بنتی، اعضاء میں وہ طاقت نہیں رہتی، کمزور ہو جاتے ہیں، جسم میں ضعف آ جاتا ہے، بدترین سی حالت انسان کی ہو جاتی ہے، انسان دوسروں کے سہاروں پر ہوتا ہے، چلنے کا محتاج ہوتا ہے، پیشاب پاخانہ کرنے میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، بسا اوقات ناک اور آنکھوں کو خود صاف نہیں کر سکتا، بسا اوقات اپنے منہ پر لگے پانی کو صاف نہیں کر سکتا ایسی حالت ہو جاتی ہے لیکن اگر ایمان

اور اعمالِ صالحہ ہوں تو اللہ اس کے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے ایسے افراد اس کو عطا فرما دیتے ہیں جو اس کی خدمت کرنے کو سعادت سمجھتے ہیں اور یہ بندہ بدتر حالت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

ہمارے حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمہ اللہ نے اپنی آخری عمر کے چودہ سال بستر پر گزارے ہیں فالج کی وجہ سے لیکن اللہ نے خدام کی ایسی فوج عطا فرمائی تھی کہ جو ہر وقت حضرت کی خدمت میں لگے رہتے تھے اور ہر بندہ خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا، کبھی ناک کے ساتھ ٹشو کو لگاتے تو اس کو اٹھانے والے کئی لوگ ہوتے تھے۔ بندہ جب اپنی جوانی کو اللہ پر لٹاتا ہے تو پھر اللہ بڑھاپے میں ایسے افراد عطا فرما دیتے ہیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ میرے ساتھ پھرنے والے یہ جوان خوب صورت لڑکے آپ دیکھتے ہو لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اختر نے اپنی اٹھارہ سالہ جوانی اپنے ستر سالہ بوڑھے شیخ پر فدا کی ہے، اس کا صلہ یہ ہے کہ خدا نے مجھے بڑھاپے میں یہ نوجوان دے دیے ہیں۔ ہم آدمی کی جوانی کی قربانیاں نہیں دیکھتے اس لیے اس کے بڑھاپے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔

”تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہوئی تو تجھے تین طلاق!“

آپ نے یہ واقعہ سنا ہو گا جو اس مقام پر مفسرین لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو ابو جعفر منصور کا وزیر تھا، اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا۔ بعض لوگ بیوی سے پیار ضرورت سے زیادہ کرتے ہیں، بیوی سے پیار تو ہونا چاہیے لیکن ضرورت سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت پیار کرتا تھا تو ایک بار چاندنی رات میں یہ بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا، اس نے پیار کی مستی میں اپنی بیوی سے کہہ دیا:

أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا إِنْ لَّمْ تَكُوْنِيْ أَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ

کہ اگر تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہیں تو تجھے تین طلاق۔

یہ کہا تو بیوی فوراً اٹھ کر پردے میں چلی گئی کہ تو نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ اس نے تو مذاق میں کہا تھا لیکن طلاق مذاق میں بھی ہو جاتی ہے۔ رات اس نے بڑی مشکل اور بے چینی سے تڑپ تڑپ کر گزاری۔ صبح خلیفہ ابو جعفر منصور سے کہا کہ میں تو رات یہ کام کر بیٹھا ہوں۔ خلیفہ نے فقہائے شہر کو بلایا اور یہ مسئلہ پوچھا۔ تمام نے فتویٰ دیا کہ تمہاری بیوی کو تین طلاق ہو گئی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد وہاں موجود تھے جو بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تو خلیفہ نے پوچھا کہ آپ کیوں نہیں بولتے؟ تو انہوں نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ﴾ اللہ کا فیصلہ ہے کہ انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت بنایا ہے۔ تو ان کی بیوی چاند سے زیادہ خوب صورت ہے اس لیے میری رائے پر طلاق نہیں ہوئی۔ باقی فقہاء نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ ابو جعفر منصور نے کہا کہ جاؤ! طلاق نہیں ہوئی، تمہاری بیوی تمہارے لیے حلال ہے۔[101]

بیوی سے پیار کرنا جائز ہے لیکن اتنا نہ کریں کہ اس میں نمازیں چلی جائیں، تلاوت چلی جائے اور سب اعمال ختم ہو جائیں۔ بس حدود میں رہ کر پیار کرنا چاہیے۔

﴿فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ﴿۷﴾﴾

اس کے بعد کون سی چیز ہے جو تمہیں قیامت کی تکذیب پر مجبور کرتی ہے؟

﴿اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾﴾

کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ اس کی بات تم نہیں مانتے!

حدیث پاک میں کہ جب تم یہ سورت پڑھو اور ﴿اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ

101۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2 ص3344

الۡحٰکِمِیۡنَ﴾ پر پہنچو تو ''بَلٰی وَأَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰاهِدِیۡنَ'' کہا کرو![102]

یعنی اللہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دینا چاہیے کہ ''کیوں نہیں! اللہ احکم الحاکمین ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ احکم الحاکمین ہے۔'' آپ بھی پڑھ لیں!

انسان کے اعمال میں کوئی چھوٹی موٹی کوتاہی ہو بھی جائے تب بھی اپنی زبان پر حق کو جاری رکھو، حق کی تائید کرتے رہو تو اللہ اس پر بھی نواز دیتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

102۔ شرح السنۃ: ج2 ص233 کتاب الصلاۃ باب مایقول فی الرکوع والسجود

سورۃ العلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾

قرآن کریم کی پہلی نازل ہونے والی آیات:

سورۃ العلق کی یہ پہلی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم کی سورۃ النمل میں جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے یہ بالاتفاق قرآن کا حصہ ہے:

﴿اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿ۙ۳۰﴾﴾[103]

اس کے علاوہ جو "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" ہے تو اس کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کا حصہ ہے اور دو سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے، یہ لا علی التعیین قرآن کا حصہ ہے یہ ہر سورت کا حصہ نہیں ہے۔ جب تراویح میں قرآن مجید پڑھیں تو ہمارے بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس سورت العلق کے شروع میں جہراً پڑھ لیں، کیوں کہ قرآن

103۔ النمل 30:27

کریم کے پورے ختم کے لیے کسی سورت کے شروع میں بسم اللہ کا جہراً پڑھنا ضروری ہے۔ اگر کسی ایک رکعت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھیں گے تو مقتدی قرآن کریم تو سنیں گے لیکن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا سماع نہیں ہو گا۔ کسی رکعت میں یہ پڑھ لیں تاکہ پورے قرآن کا سماع ہو جائے۔ اب کس سورت کے شروع میں پڑھیں تو میں نے عرض کیا کہ بعض مشائخ کا معمول یہ تھا کہ وہ سورۃ العلق کے شروع میں پڑھتے تھے۔

شانِ نزول:

نبوت کے اعلان سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی راتیں غار میں رہتے تھے، خلوت آپ کو محبوب ہو گئی تھی، ہر وقت آپ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ دنیا سے کٹ کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا اور اسی میں غور و فکر کرتے رہنا یہ آپ کی عبادت تھی۔ ایک دن اچانک جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور کہا "اِقْرَاْ" کہ آپ پڑھیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا أَنَا بقارئ " میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا تھا؟ اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھے کہ کوئی لکھی ہوئی چیز ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ پڑھو! تو لکھی ہوئی چیز تو میں نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے فرمایا: "مَا أَنَا بقارئ" میں کیسے پڑھوں، میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سینے کے ساتھ ملا کر دبایا، اتنا دبایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی محسوس کی۔ پھر کہا: "اِقْرَاْ" کہ آپ پڑھیں! ارشاد فرمایا: " مَا أَنَا بقارئ" میں کیسے پڑھوں، میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر کہا: "اِقْرَاْ" کہ پڑھیں! تین بار دبایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: " مَا أَنَا بقارئ" کہ پڑھا ہوا نہیں ہوں تو پھر جبرائیل امین نے یہ پانچوں آیتیں پڑھیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں آیات کا

تلفظ فرمایا۔

صفتِ رب؛ جامع الصفات

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾﴾

پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے آپ کو پیدا کیا۔

دیکھیں! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ صفتِ رب؛ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے کہ جو تمام صفات کو جامع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلی وحی میں صفتِ رب بیان فرمائی ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ ہے اور قرآن کریم کی سب سے آخری سورت ﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ ہے۔ عالمِ ارواح کا سوال ”اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ“ تھا اور عالمِ برزخ کا سوال ”مَنۡ رَّبُّكَ“ ہو گا! تو ان تمام مقامات میں صفتِ رب کو ذکر کیا ہے کیونکہ یہ صفتِ رب تمام صفات کو جامع ہے۔ اس لیے بعض مقامات میں صفت رب پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

انسان کی پیدائش:

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾﴾

پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

اللہ کی صفات میں سب سے بڑی صفت؛ صفتِ خلق ہے کہ اللہ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ چونکہ اللہ نے اپنے احکامات کا پابند انسان کو بنانا ہے اس لیے پیدائش میں انسان کا ذکر کیا کہ اللہ نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا فرمایا ہے۔

یہاں ”علق“ کا ذکر کیوں کیا؟ اس لیے کہ انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل ہیں۔ سب سے پہلے خوراک ہے، پھر خوراک سے نطفہ بنتا ہے اور نطفے کے بعد

پھر علق ہے، علق کے بعد پھر مضغہ: جما ہوا گوشت ہے، پھر اس کے اوپر ہڈی چڑھتی ہے، پھر روح آتی ہے، پھر انسان بنتا ہے۔ تو پیدائش کے مراحل میں "علق" ایک درمیانی حالت ہے تو اس کا یہاں ذکر اس لیے کر دیا تاکہ اس سے ابتدا اور انتہا کی حالتوں کی طرف اشارہ ہو جائے۔

﴿اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ﴿۳﴾﴾

پھر دوبارہ فرمایا اور تاکید سے فرمایا کہ پڑھیں! آپ کا رب بڑا ہی کریم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرما رہے تھے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تو فرمایا کہ آپ کا رب کریم ہے، آپ نہیں پڑھے ہوئے تو پھر کیا ہوا؟! آپ کا رب کریم ہے اور کریم ہوتا ہی وہ ہے "اَلَّذِیۡ یُعۡطِیۡ بِدُوۡنِ الۡاِسۡتِحۡقَاقِ" جو بغیر استحقاق کے دیتا ہے۔

قلم؛ تعلیم کا ایک اہم ذریعہ

﴿الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾﴾

جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جس کو انسان جانتا بھی نہیں تھا۔

اللہ نے پہلے ﴿الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ﴾ فرمایا، پھر ﴿عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ﴾ فرمایا، حالانکہ ﴿عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ﴾ کے بعد ﴿عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ﴾ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انسان وہی چیز سیکھتا ہے جو پہلے سے نہ جانتا ہو تو دوبارہ "عَلَّمَ" کیوں فرمایا؟ یہ بتانے کے لیے کہ سیکھنے کا ذریعہ صرف قلم ہی نہیں ہے بلکہ بعضوں کو اللہ تعالیٰ علم دیتے ہیں بذریعہ قلم کہ وہ لکھی ہوئی چیز کو دیکھ کر پڑھ لیتے ہیں اور بعضوں کو علم دیتے ہیں بدونِ القلم کہ وہ لکھے ہوئے سے نہیں سیکھتے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو صدری علوم عطا فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کسی اور ذریعے سے علوم عطا فرما

دیتے ہیں۔

حضرت مولانا رومی رحمہ اللہ اس بات کو یوں سمجھاتے ہیں کہ اہلِ تقویٰ کا علم کبھی ختم نہیں ہوتا، فرمایا کہ جس طرح گھڑے کا پیندا توڑ کر اس گھڑے کو سمندر کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو گھڑے میں پانی کبھی ختم نہیں ہوتا بالکل اسی طرح اہلِ تقویٰ کا دل چونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اس لیے وہاں سے علوم نکلتے رہتے ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتے۔

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝٦ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝٧ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝٨﴾

فرمایا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ انسان بہت سرکش ہے، حدِ آدمیت سے نکل جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے بارے میں یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے تمہیں دنیا میں کسی فرد کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم نے اللہ کی طرف تو لوٹ کر جانا ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھنا! ایک تو یہ ہے کہ انسان کے پاس ایسے اسباب ہوں کہ انسان؛ انسان کا محتاج نہ ہو، یہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان؛ خدا کا محتاج نہ ہو، یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ انسان حدِ آدمیت سے نکل جاتا ہے، کیوں کہ وہ خود کو مستغنی سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کی کیا ضرورت ہے!

دو باتیں سمجھنا! ایک یہ کہ اپنی ذات کی حد تک تھوڑا بہت کام کرنے میں ایک بندے کو دوسرے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اپنی ذات سے بڑھ کر جب آپ تحریک اور کاز کی بات کریں گے تو پھر آپ کو ایک کی نہیں پھر ہر کسی کی ضرورت پڑتی ہے، پھر روابط.. پھر تعلق.. پھر جوڑ.. یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے، جنہوں نے کام نہیں کرنا ان کو تو کوئی ضرورت نہیں ہے اور جنہوں نے کام کرنا ہے ان کو تو ضرورت ہے، ان کو تو حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

ابو جہل کی دشمنی:

﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝﴾

کیا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا ہے جو بندے کو منع کرتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

ابو جہل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا کہ میرے سامنے نمازیں نہ پڑھو! میرے سامنے سجدے نہ کیا کرو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہاں چھوڑ سکتے تھے! ایک بار ابو جہل آیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سجدہ فرما رہے تھے، ابو جہل کی خواہش تھی کہ میں نماز کے دوران کوئی ایسی حرکت کروں کہ آپ نماز چھوڑ دیں۔ جب یہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ کسی نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ مجھے آگے خندق نظر آ رہی ہے آگ کی اور اس میں کوئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنم کی آگ تھی اور وہ صورتیں ملائکہ تھے، اگر یہ آگے آتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی کر کے رکھ دیتے۔

ابو جہل کا انجام بد:

﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾

آپ یہ بتائیں کہ اگر وہ نماز پڑھنے والا شخص ہدایت پر ہو، صرف ہدایت پر ہی نہ ہو بلکہ وہ دوسروں کو تقویٰ کا حکم بھی دیتا ہو - یہاں "اَوْ" بمعنی "بَلْ" ہے - یعنی تقویٰ کی بات بھی کرتا ہو تو کیا پھر بھی تم اس کو روکو گے؟ اور پھر یہ دیکھو کہ روکنے والا شخص کون ہے؟ یہ روکنے والا شخص جھٹلاتا بھی ہے اور خود روگردانی بھی کرتا ہے۔

﴿اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝﴾

کیا اسے یہ معلوم نہیں کہ اللہ اس کو دیکھ رہے ہیں؟! ﴿كَلَّا﴾ اس کو ایسا ہر گز نہیں کرنا چاہیے، ﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ﴾ اور اگر یہ باز نہ آیا اور ایسا کام کر لیا تو ہم اس کی پیشانی سے گھسیٹ کر لے آئیں گے - اور پیشانی بھی کیسی ہے ؟- ایک جھوٹے آدمی کی پیشانی ہے جو کہ گنہگار ہے۔

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٩﴾﴾ السجدة ۩

اس بندے کو چاہیے کہ اپنی مجلس والوں کو بلاؤ، ہم اپنی پیادہ فوج ملائکہ کو بلائیں گے۔ اے پیغمبر! ﴿كَلَّا﴾ آپ ان کی بات کو ہر گز نہ مانیں، بس آپ سجدہ کریں اور میرا قرب حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات سمجھائی ہے کہ اہلِ باطل جتنا بھی زور لگائیں ان کی پروانہ کریں، بس آپ خدا کی عبادات میں لگے رہیں۔ یہ پہلے کئی بار آچکا ہے کہ جب اللہ یہ ذکر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کو تنگ کرتے ہیں، یہ آپ کو ستاتے ہیں تو آخر میں یہ بات ارشاد فرماتے ہیں: "فَسَبِّحْ" کہ آپ تسبیح کریں اور یہاں فرمایا: "وَاسْجُدْ" کہ سجدہ کریں۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھا دے۔

میں آپ سے بار بار کہتا ہوں کہ مخالفین جتنی بھی کوشش کریں اس کا حل جواب دینا نہیں ہے، اس کا حل رجوع الی اللہ ہے، اس کا حل عبادات میں مشغولیت ہے، اس سے انسان بالکل بدل جاتا ہے، ماحول بالکل ساز گار ہو جاتا ہے، انسان کے قلب کو بڑی تسلی ہوتی ہے جب انسان جوابات دینے کے بجائے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، رجوع الی اللہ کرتا ہے اور زبان محفوظ کرتا ہے۔ جب یہ آیت پڑھیں تو اس موقع پر سجدہ کرنا چاہیے؛ پڑھنے والے کو بھی اور سننے والے کو بھی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورة القدر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ؕ﴿۲﴾ لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ؕ﴿۳﴾﴾

شانِ نزول:

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک عابد کا ذکر کیا جو ساری رات عبادت میں مشغول رہتا اور دن کو جہاد کرتا تھا۔ اس نے مسلسل ایک ہزار مہینے اسی طرح گزار دیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم اس کے مقام کو کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ اس پر یہ سورت مبارکہ نازل ہوئی کہ اس امت کا شرف یہ ہے کہ اس امت کو اللہ نے ایک رات ایسی عطا فرمائی ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔[104]

فرمایا: ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا اور آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟! لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

"قدر" کا معنی ہوتا ہے شرف اور عزت یا "قدر" کا معنی ہوتا ہے تقدیر۔

104۔ التفسیر المظہری: ج10 ص310 تفسیر سورۃ القدر

لیلۃ القدر کا پہلا معنیٰ:

اگر پہلا معنیٰ ہو تو لیلۃ القدر سے مراد ہے شرف، عزت اور عظمت والی رات۔ چونکہ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے اس لیے یہ عزت اور عظمت والی رات ہے۔ یہ رات رمضان المبارک کی آخری دس راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے اور ان میں بھی زیادہ ترجیح اس بات کو ہے کہ طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے؛ اکیس، تئیس، پچیس، ستائیس اور انتیس۔

کیا پہلی امتوں میں بھی امر بالمعروف تھا؟

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم آج تک یہ سنتے آرہے ہیں کہ یہ امت پہلی امتوں کی بہ نسبت افضل ہے ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کہ یہ امت بہترین امت ہے، خیر امت ہے اور اس امت کے خیر امت ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[105] کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو پہلی امتوں میں بھی تھا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ رب العزت نے ایک فرشتے کو- غالباً جبرائیل علیہ السلام تھے- ان کو بھیجا کہ جاکر فلاں بستی کو تباہ کردو! جبرائیل امین آئے، دیکھا کہ ایک شخص عبادت کر رہا تھا، جبرائیل امین نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

إِنَّ فِيهِ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ

اس میں ایک ایسا بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے برابر آپ کی نافرمانی نہیں کی تو کیا اس کے ہوتے ہوئے تباہ کردوں؟

قَالَ: اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ لِي سَاعَةً قَطُّ.

105۔ آل عمران 110:3

فرمایا کہ پہلے اس کو تباہ کرو اور پھر اس بستی کو تباہ کرو، اس لیے کہ یہ ہماری نافرمانی کو ہوتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس کے چہرے پر بل تک نہیں آتا۔[106]

اگر امر بالمعروف نہیں تھا تو اس کو تباہ کیوں کیا ہے؟

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کے تحت لکھتے ہیں کہ اس امت کی وجہِ فضیلت یہ ہے کہ اس میں ایسا امر بالمعروف ہے کہ جس کو رد کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی اس امت کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو رد کر دے تو پھر اس کی پشت پر جہاد کی طاقت موجود ہے اور پہلی امتوں میں عام طور پر یہ نہیں تھا، بس خاص خاص امتوں میں تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی امت میں جہاد تھا، عام نبیوں کی امتوں میں جہاد نہیں تھا، اس امت کی دعوت چونکہ مقرون بالجہاد ہے اس لیے یہ امت تمام امتوں سے افضل ہے۔

﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝٣﴾ ... لیلۃ القدر ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس پر بھی اعتراض ہے کہ ہزار مہینوں کے تراسی سال بنتے ہیں۔ تو تراسی سالوں میں سے ہر سال میں لیلۃ القدر بھی آئی ہو گی، تو پھر یہ ایک رات ان تراسی سالوں سے کیسے بڑھ جائے گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تراسی سال وہ مراد ہیں کہ جن میں لیلۃ القدر نہ ہو، یہ لیلۃ القدر ان ایک ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔

لیلۃ القدر کا دوسرا معنی:

"لیلۃ القدر" کو لیلۃ القدر کہنے کی ایک وجہ تو یہ تھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "لیلۃ القدر" تقدیر سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے سال میں جو جو احکام اور

106۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج5 ص376 رقم الحدیث 7661

اعمال کسی کی تقدیر میں ہوتے ہیں اللہ رب العزت اس رات میں ان احکامات کو لوحِ محفوظ سے نقل کرواکے ملائکہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔

اس پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ یہاں دوروایتوں میں تعارض ہے کہ عام طور پر ہم سنتے ہیں کہ لیلۃ البراءۃ جسے ہم شبِ براءت کہتے ہیں یعنی پندرھویں شعبان کی رات، اس رات میں آئندہ سال ہونے والے تمام احوال اللہ رب العزت فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں؛ کون اچھا ہے، کون برا ہے، کس نے مرنا ہے، کس نے جینا ہے، کس کو کتنا رزق ملنا ہے!

اس کا جواب یہ ہے کہ لیلۃ البراءۃ؛ پندرھویں شعبان کو اللہ تعالیٰ اجمالی فیصلہ فرماتے ہیں کہ پورے سال میں کیا ہونا ہے اور لیلۃ القدر میں لوحِ محفوظ سے نقل کروا کر جس جس فرشتے کے ذمہ جو جو کام ہوتے ہیں ان کے حوالے کیا جاتا ہے۔ تو اجمالی فیصلے شبِ براءت میں ہوتے ہیں اور تفصیلی طور پر لکھ کر فرشتوں کے حوالے لیلۃ القدر میں کیے جاتے ہیں۔

قرآن محفوظ ہے:

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم محفوظ ہے۔ تورات، زبور اور انجیل محفوظ نہیں ہیں، ان میں تحریف ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس اس کی دلیل ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ [107] ہے۔ یہاں "الذِّكْرَ" سے مراد قرآن کریم ہے کہ قرآن کریم نازل بھی اللہ نے فرمایا ہے اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی اللہ نے کیا ہے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ "الذِّكْرَ" سے مراد قرآن کریم نہیں ہے کیونکہ جس طرح الذکر قرآن کریم کو کہتے ہیں اسی طرح تورات، زبور اور انجیل کو بھی کہتے ہیں، تو

107۔ الحجر 9:15

اس پر کیا دلیل ہے کہ الذکر سے مراد قرآن کریم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے باب تفعیل: نَزَّلَ یُنَزِّلُ تَنْزِیْلًا اور ایک ہے باب افعال: اَنْزَلَ یُنْزِلُ اِنْزَالًا۔ باب تفعیل میں تدریج ہے، جب تھوڑا تھوڑا کوئی کام کریں تو باب تفعیل ہوتا ہے، جب "نَزَّلْنَا" ہو تو اس کا معنی ہے کہ ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا اور جب "اَنْزَلْنَا" ہو تو اس کا معنی ہے کہ ایک ہی مرتبہ سب کو نازل کیا ہے۔ تو اللہ نے ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ﴾ فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الذکر سے مراد قرآن کریم ہے، چونکہ باقی کتابیں تھوڑی تھوڑی نہیں بلکہ یکبارگی نازل ہوئی ہیں اس لیے وہ مراد نہیں ہیں۔

نزولِ قرآن دوبار ہوا ہے:

اس پر پھر سوال ہوتا ہے کہ اس سورت میں ہے ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾۔ جس طرح تورات، انجیل اور زبور کے لیے "اَنْزَلْنَا" آیا ہے اسی طرح قرآن کریم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے۔ ایک مرتبہ لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اور دوسری مرتبہ آسمانِ دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر۔ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ میں یہ نزولِ اوّلی مراد ہے یعنی لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اور ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ﴾ میں نزولِ ثانوی ہے یعنی آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر۔

﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵﴾

"مِنْ كُلِّ اَمْرٍ" کا تعلق "سَلٰمٌ" کے ساتھ ہے یا "تَنَزَّلُ" کے ساتھ ہے۔

دونوں صورتوں میں معنی الگ الگ ہو گا۔ اگر ''مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ''کا تعلق ''تَنَزَّلُ'' کے ساتھ ہو تو ''مِنۡ'' بمعنی با ہو گا۔ معنی یہ ہو گا کہ فرشتے اور روح القدس اس رات میں اللہ کے حکم کے ساتھ اترتے ہیں۔ ''کُلِّ اَمۡرٍ'' سے مراد خیر کے کام ہیں یعنی تمام امورِ خیر کو لے کر آسمان سے اترتے ہیں۔ چنانچہ جن بندوں کو عبادات میں مشغول دیکھتے ہیں تو ان کے لیے سلامتی کی دعائیں کرتے ہیں۔

اگر ''مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ''کا تعلق ''سَلٰمٌ'' کے ساتھ ہو تو پھر ''امر'' سے مراد امرِ شر ہو گا کہ یہ رات امورِ شر سے محفوظ ہے صبحِ صادق کے طلوع ہونے تک۔

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَآ أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورۃ البیّنۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ
حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾﴾

اہلِ کتاب اور مشرکین کی ہٹ دھرمی:

دورِ جاہلیت کے کفار خواہ وہ اہلِ کتاب؛ یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین؛ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے کفر میں اتنے سخت ہیں کہ بہت بڑی دلیل آنے تک یہ اپنے کفر سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے اور عجیب بات یہ کہ بہت بڑی دلیل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات آئی ہے اس کے باوجود بعض لوگ کلمہ حق قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا کفر اتنا سخت تھا کہ عام اور چھوٹے دلائل سے یہ کلمہ نہ پڑھتے بلکہ بہت بڑی دلیل آتی تب یہ کلمہ پڑھتے لیکن بعض بدبخت ایسے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بڑی دلیل آنے کے باوجود بھی کلمہ نہیں پڑھ رہے۔

فرمایا: اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس بہت بڑی واضح دلیل نہ آتی۔ وہ دلیل اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتے ہیں۔

کتبِ قیمہ سے مراد:

﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣﴾

ان صحیفوں میں ایسے احکام درج ہیں جو مضبوط اور معتدل ہیں۔

"کُتُبٌ"... کتاب کی جمع ہے اور یہاں کتاب سے مراد لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے مراد احکام ہیں۔ کیوں کہ اگر کتاب سے مراد معروف لکھی ہوئی کتاب ہو تو "فِيْهَا" میں ھَا سے مراد صحف ہیں جو کہ صحیفہ کی جمع ہے اور صحیفہ بھی لکھی ہوئی کتاب کو کہتے ہیں۔ پھر "فِيْهَا" کہنے کا کوئی معنی نہ ہوتا! اس لیے کتب سے مراد احکام ہیں۔ یہ ایسے ہے جس طرح قرآن کریم میں ہے: ﴿لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٦٨﴾[108] کہ اگر اللہ کا حکم طے شدہ نہ ہوتا تو تم پر عذاب آجاتا۔ یہاں بھی کتاب سے مراد حکم ہے۔

شریعت محمدیہ اعتدال کا نام ہے:

﴿قَيِّمَةٌ﴾... سے مراد ہے معتدل اور مستحکم۔ معنی ہو گا کہ ان صحیفوں میں ایسے احکام درج ہیں جن میں اعتدال بھی ہے اور استحکام بھی۔ مطلب یہ کہ ان احکام میں افراط و تفریط بھی نہیں ہے اور ان احکام میں کمزوری بھی نہیں ہے۔ احکام مضبوط بھی ہیں اور معتدل بھی۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہماری شریعت؛ شریعتِ معتدلہ ہے۔

☼ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا

108۔ الانفال 68:8

☼ ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾[109]

ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے۔

☼ ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾[110]

یہ قرآن ایسا راستہ دکھاتا ہے جو مستقیم ہے۔

اہلِ کتاب کے اختلاف کی وجہ:

﴿وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾

اور اہل کتاب نے اس وقت آپس میں اختلاف کیا جب ان کے پاس روشن دلیل آپہنچی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق تھے کہ آخر زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ اس بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ تورات اور انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور آمد کا ذکر موجود تھا اور یہ لوگ ایسی بشارتیں سناتے بھی تھے۔ مزید یہ کہ جب ان کا مقابلہ مشرکین سے ہوتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر دعائیں مانگتے تھے کہ اے اللہ! جو آخری نبی آنے والے ہیں ان کی برکت سے ہمیں مخالفین پر فتح عطا فرما! لیکن جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان لوگوں نے اختلافات شروع کر دیے۔ کچھ لوگوں نے تو مانا لیکن اکثر لوگوں نے نہ مانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے لگے۔

﴿وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَ

109۔ البقرۃ 143:2

110۔ الاسراء 9:17

يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴿٥﴾﴾

حالانکہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں اور ہر باطل سے الگ رہتے ہوئے عبادت کو خالص اللہ کے لیے رکھیں، نماز کی پابندی کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور یہی مستقیم اور معتدل امت کا طریقہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے بارے میں تو بات سمجھ آتی ہے کہ ان کو حکم تھا کہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور عبادت خالص اللہ کے لیے کریں کیونکہ ان کے پاس تورات اور انجیل کتابیں موجود تھیں اور ان میں یہ احکامات درج تھے لیکن مشرکین کے لیے یہ حکم کہاں تھا کہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور عبادت خالص اللہ کے لیے کریں؟! اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ ملتِ ابراہیمی پر ہونے کے دعویدار تھے اور ابراہیم علیہ السلام تو یہ سارے کام کرتے تھے۔ جب وہ خود کو ملتِ ابراہیمی پر عمل پیرا کہتے تھے تو گویا انہیں بھی حکم ہے کہ وہی کام کریں جو ابراہیم علیہ السلام نے کیے تھے۔

اہلِ کتاب اور مشرکین کا انجام:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿٧﴾﴾

یہاں ایمان والوں کا اور کافروں کا تقابل بیان کیا ہے۔ فرمایا: اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، یہ بدترین مخلوق ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو یہ بہترین مخلوق ہیں۔

جنت کی نعمتیں:

﴿جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸﴾

ان ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کا بدلہ اللہ کے ہاں وہ باغات ہیں جو ہمیشہ رہنے والے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو گا اور یہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ سب انعامات اس شخص کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتا ہو۔

حدیث پاک میں ہے اللہ رب العزت اہلِ جنت سے فرمائیں گے: "يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ" وہ جنتی جواب دیں گے: "لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ" اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں! آپ کی فرمانبرداری کے لیے حاضر ہیں اور تمام بھلائیاں آپ ہی کے اختیار میں ہیں۔ اللہ رب العزت فرمائیں گے: "هَلْ رَضِيْتُمْ ؟" کہ جو میں نے تمہیں نعمتیں دی ہیں کیا تم راضی ہو؟ جنتی کہیں گے: "رَضِيْنَا" یا اللہ! ہم خوش ہیں، آپ نے ہمیں سب کچھ دیا ہے تو پھر راضی کیوں نہ ہوں؟ تو اللہ فرمائیں گے کہ میں تمہیں اس سے بڑی چیز دیتا ہوں۔ عرض کریں گے: اے اللہ! اس سے بڑی چیز کیا ہے؟ اس وقت اللہ فرمائیں گے کہ میں تم سب سے راضی ہوں اب تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ اللہ رب العزت یہ نعمت ہم سب کو عطا فرمائیں۔ (آمین) اور یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو دنیا میں دی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گئے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الزلزال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۙ﴿۲﴾ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰی لَهَا ؕ﴿۵﴾﴾

احوالِ قیامت:

زلزلہ زمین میں دو مرتبہ ہو گا؛ ایک نفخۂ اولیٰ کے وقت اور ایک نفخۂ ثانیہ کے وقت۔ نفخ کا معنی ہوتا ہے پھونک مارنا۔ ایک مرتبہ جب اسرافیل علیہ السلام صور میں پھونک ماریں گے تو زمین میں بھونچال آ جائے گا، زلزلہ ہو گا، پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے، آسمان کے ستارے گر جائیں گے اور دنیا میں سب مر جائیں گے۔ پھر دوبارہ صور میں پھونکیں گے تو پھر زلزلہ آئے گا، پھر مردے اٹھ جائیں گے، زمین کے دفینے باہر نکل آئیں گے۔ یہ دوسرا زلزلہ ہو گا اور یہاں ﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا﴾ میں یہی دوسرا زلزلہ مراد ہے۔

فرمایا: جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور زمین اپنے اندر کے خزانے باہر نکال دے گی۔ اس وقت انسان کہے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا ہے؟ اس دن زمین اپنے اندر کی

ساری باتیں بتائے گی۔ اس لیے کہ اللہ نے اسے یہی حکم فرمایا ہو گا۔

زمین یہ بتائے گی کہ مجھ پر فلاں نے فلاں گناہ کیا، فلاں نے فلاں نیک کام کیا۔ زمین دفینے بھی باہر نکالے گی اور اپنے اوپر ہونے والے نیک اور برے کام بتائے گی۔ اس لیے حدیث پاک میں ہے:

"اِذَا تَابَ الْعَبْدُ أَنْسَى اللّٰهُ الْحَفَظَةَ ذُنُوبَهٗ وَأَنْسٰى ذٰلِكَ جَوَارِحَهٗ وَمَعَالِمَهٗ مِنَ الْأَرْضِ" کہ جب بندہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ وہ گناہ فرشتوں کو بھلا دیتے ہیں اور اس کے اعضاء کو بھلا دیتے ہیں اور اس زمین پر جس پر اس نے گناہ کیا تھا اس زمین کو بھی بھلا دیں گے، "حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِنَ اللّٰهِ بِذَنْبٍ" یہ بندہ اللہ کے ساتھ قیامت کے دن ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کے خلاف کوئی گواہی دینے والا نہیں ہو گا۔[111]

اللہ رب العزت ہم سب کو ایسا ہی بنا دے۔ آمین

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝۶﴾

اس دن لوگ کئی گروہوں میں بٹ جائیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

کچھ گروہ ایمان والوں کے ہوں گے اور کچھ کافروں کے ہوں گے۔ کافر اپنے اعمال کا نتیجہ جہنم دیکھیں گے اور مؤمن اپنے اعمال کا نتیجہ جنت دیکھیں گے۔

نیکی اور برائی کا بدلہ یقینی ہے:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾

111۔ کنز العمال: ج4 ص87 رقم 10175

جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا یعنی اس کا بدلہ اسے ملے گا اور ذرہ برابر بھی گناہ کیا ہوگا وہ بھی اسے دیکھے گا۔

یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ خیر سے وہ مراد ہے جو خیر مقبول بھی ہو یعنی اس سے مراد ایسی نیکی ہے جو صحیح عقیدہ کے ساتھ ہو، باطل عقیدے کے ساتھ کی گئی نیکی کو اللہ ہرگز قبول نہیں کرتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے۔ پھر صحیح عقیدے کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ خیر ایسی ہو کہ جسے آدمی وہاں تک لے کر بھی پہنچے، ایسا نہ ہو کہ کفر کر بیٹھے اور ساری خیر کو ضائع کر دے۔ اسی طرح اگر دنیا میں شر یعنی کوئی گناہ کیا ہے اور بعد میں توبہ کر لی تو یہ شر قیامت کے دن نہیں دیکھے گا کیونکہ یہ شر قیامت تک پہنچا ہی نہیں بلکہ پہلے معاف ہو گیا ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت زلزال کو نصف قرآن فرمایا کہ یہ آدھا قرآن ہے اور سورت اخلاص کو تہائی قرآن فرمایا، سورت کافرون کو ربع قرآن فرمایا۔[112]

دین کا خلاصہ:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾

یہاں ایک بات سمجھیں۔ میں بارہا آپ کو سمجھاتا ہوں کہ دین خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں:

نمبر 1 ... ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو کچھ دیں وہ لے لو۔

112۔ جامع الترمذی، رقم: 2893

نمبر 2... ﴿وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ اور جس چیز سے منع فرما دیں اس سے رک جاؤ۔

پیغمبر جو چیز دیں اس کا نام ''خیر'' ہے اور جس چیز سے منع کر دیں اس کا نام ''شر'' ہے۔ پیغمبر کی صفات کا خلاصہ بھی دو صفتیں ہیں؛ بشیر اور نذیر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشیر الی الخیر ہیں اور نذیر من الشر ہیں۔ یہ دو ہی صفتیں کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد دائمی ٹھکانے دو ہی ہیں؛ ایک جنت اور دوسرا جہنم۔ خیر والے جنت میں جائیں گے اور شر والے جہنم میں جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی جہنم سے حفاظت فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورة العٰدیٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ الۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾﴾

گھوڑوں کی قسمیں:

اس سورت میں اللہ پاک نے قسمیں کھائی ہیں گھوڑوں کی اور ان سے مراد لڑائی والے گھوڑے ہیں جو جہاد اور غیر جہاد میں استعمال ہوتے ہیں، خاص جہاد میں استعمال ہونے والے گھوڑے مراد نہیں ہیں بلکہ مراد مطلق لڑائی میں استعمال ہونے والے گھوڑے مراد ہیں۔ عرب چونکہ لڑائی اور جنگ وجدل کے عادی تھے اس لیے اس مناسبت سے انہیں سمجھانے کے لیے قسمیں کھائی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ الۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾﴾ قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ ﴿فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾﴾ قدحًا کہتے ہیں ٹاپ کو، گھوڑے اپنے ٹاپ کو جب سخت زمین پر ماریں تو اس سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں خصوصاً جب اس کے نیچے لوہے کی کڑیاں لگائی گئی ہوں تو اور آگ نکلتی ہے۔ فرمایا: قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ٹاپ مار کر آگ نکالتے ہیں۔

﴿فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾﴾ اور ان گھوڑوں کی قسم جو صبح کے وقت تباہ

وبرباد کر دیتے ہیں، تاراج کرتے ہیں۔ عرب کے ہاں عادت تھی کہ رات کے وقت حملہ نہیں کرتے تھے، جب صبح ہوتی تو پھر حملہ کرتے، رات کی تاریکی میں حملے کو بزدلی سمجھتے تھے اور صبح کے حملے کو شجاعت اور دلیری سمجھتے تھے۔

﴿فَاَثَرۡنَ بِهٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾﴾ قسم ہے ان گھوڑوں کی جو غبار اڑاتے ہیں اور دشمن کی جماعتوں میں گھس جاتے ہیں۔ ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾﴾ گھوڑوں کی قسمیں کھا کر اب فرمایا کہ انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

"كَنُوۡدٌ" کا معنی ہے کہ نعمتیں ملیں تو بھول جائے اور مصیبتیں ہمیشہ یاد رکھے، خوشی کا تذکرہ نہ کرے اور شر کا تذکرہ کرے۔ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

انسانی خصلت مال سے محبت:

اس پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ "انسان" کا لفظ تو نیک اور برے سب کو شامل ہے، کفار کو بھی شامل ہے، مسلمانوں کو بھی شامل ہے، انبیاء علیہم السلام کو بھی شامل ہے تو کیا اس حکم میں العیاذ باللہ انبیاء علیہم السلام اور نیک لوگ بھی شامل ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "اِنَّ الۡاِنۡسَانَ" سے مراد کافر شخص ہے کہ کافر کی خصلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ناشکرا ہوتا ہے، مال سے ضرورت سے زیادہ پیار کرتا ہے، حضرات انبیاء علیہم السلام اور نیک صالح مؤمنین اس سے ہرگز مراد نہیں!

عام مسلمانوں کو چاہیے کہ کافروں کی اس خصلت سے بچیں۔ اگر کوئی مسلمان ہو اور یہ کافرانہ خصلتیں اس میں ہوں تو اسے ان سے بچنے کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔ ﴿وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيۡدٌ ۚ﴿۷﴾﴾ اور ناشکرا ہونے پر خود گواہ ہے۔ اس کا عمل بتاتا ہے کہ یہ ایسا کرتا ہے۔

حیات فی القبر:

﴿وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝ اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۝﴾

انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ جس دن قبروں میں پڑے مردوں کو زندہ کیا جائے گا۔

اس پر یہ شبہ نہ کریں کہ یہ آیت حیات فی القبر کے خلاف ہے! اس لیے کہ ایک ہوتی ہے حیات ظاہری اور ایک ہوتی ہے حیاتِ مخفی۔ قبر میں میت کو جو حیات ملتی ہے وہ حیات مخفی ہوتی ہے۔ حیات مخفی کا معنی یہ ہے کہ روح اور جسم کے تعلق سے اتنی حیات ہوتی ہے "قَدْرَ مَا یَتَلَذَّذُ وَیَتَأَلَّمُ" جس سے قبر والا جسم لذت بھی محسوس کرے اور تکلیف بھی محسوس کرے، بس اتنی سی حیات کے ہم قائل ہیں، اس سے زیادہ حیات کے ہم قائل نہیں ہیں اور وہ حیات بہت مخفی ہوتی ہے۔

جیسے دیکھو! بال میں حیات موجود ہے اور یہ اتنی کمزور حیات ہے کہ بال کو کاٹ لیں تب بھی درد نہیں ہوتا لیکن اتنی حیات ہے جس سے بال بڑھتا رہتا ہے۔ اب بال میں حیات ہے لیکن بہت کمزور ہے۔ اس کے اوپر آدمی کا رخسار ہے، اس میں بھی حیات ہے لیکن حیات اتنی ہے کہ کاٹیں تو درد ہوتا ہے لیکن اگر اس پر کوئی مٹی وغیرہ لگ جائے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس کے اوپر آنکھ کی پتلی کی حیات ہے، اس میں مٹی پڑے تو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ حیات مزید حساس ہے لیکن ہوا آنکھ کو لگ جائے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے اوپر دماغ ہے، دماغ کی حیات اتنی حساس ہے کہ ہلکی سی ہوا لگے تو بھی موت کا خطرہ ہوتا ہے۔

حیات کی قسمیں ہیں نا! اسی طرح کافر کی حیات ہے، پھر اس کے اوپر مؤمن کی حیات ہے، پھر شہید کی حیات ہے، پھر نبی کی حیات ہے۔ یہ حیات کے درجات ہیں، اس کا معنی یہ نہیں کہ حیات کا انکار کیا جائے! قیامت کے دن جو حیات ملے گی وہ ظاہری

اور کھلی ہوئی حیات ہوگی اور قبر میں جو حیات ملتی ہے وہ مخفی اور چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ قیامت کے دن ظاہری حیات ملنے سے قبر والی چھپی ہوئی حیات کی نفی نہیں ہوتی۔

﴿وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ﴿١٠﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿١١﴾﴾

اور جو کچھ سینوں میں ہے اسے ظاہر کیا جائے گا۔ بیشک ان کا رب ان باتوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ جو اللہ قسم کھاتے ہیں کسی چیز کی تو اللہ اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ اس چیز کی قسم کھائیں اور اس کی نہ کھائیں بلکہ اللہ مخلوق کی قسم کھانا چاہے یں تو کھا سکتے ہیں، ہاں البتہ انسان مخلوق کی قسم نہیں کھا سکتا، ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾[113] اس لیے کہ اللہ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے ہیں البتہ مخلوق سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا ہے۔

قسم اور مقسم بہ میں مناسبت:

ہاں البتہ جب کسی چیز کی قسم کھاتے ہیں تو قسم کو مقام قسم سے مناسبت بہت ہوتی ہے۔ یہاں گھوڑوں کی قسم کیوں کھائی ہے؟ یہ بتانے کے لیے کہ گھوڑوں کو تھوڑا سا اناج، تھوڑا سا کھانا، تھوڑا سا پانی انسان دیتا ہے اور گھوڑا جان کی بازی لگا دیتا ہے اپنے مالک کے لیے اور انسان کو اللہ رب العزت سب کچھ دیتے ہیں لیکن انسان خواہشات تک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ تو اللہ رب العزت نے یہاں پر گھوڑوں کی قسمیں اس لیے اٹھائی ہیں کہ اے انسان! تم ان گھوڑوں کو دیکھتے تو تمہیں کچھ عبرت حاصل ہو جاتی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

113۔ الانبیاء 23:21

سورۃ القارعۃ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿اَلۡقَارِعَةُ ۝۱ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۲ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۳﴾

قارعہ کا معنیٰ:

قیامت ایسی ہو گی جو ہلا کے رکھ دے گی اور تمہیں پتا ہے کہ ہلا کے رکھ دینے والی وہ کون سی چیز ہے؟ تمہیں اس کا تھوڑا سا احساس بھی ہے کہ وہ کیا چیز ہو گی؟

انسان؛ بکھرے ہوئے پتنگے

﴿يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝۴﴾

اس دن انسان ایسے بکھر رہے ہوں گے جیسے پروانے ہوتے ہیں۔

پروانے کو ایک تو سمجھ نہیں آتی کہ میں نے جانا کہاں ہے! کبھی اِدھر کبھی اُدھر ٹکریں مارتا ہے اور بہت پریشان ہوتا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے اس کے بعد یہ پروانے نکلتے ہیں اور عموماً جہاں پر روشنی ہو وہاں جمع ہو جاتے ہیں، پریشان بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی ہوتے ہیں۔

اسی طرح قیامت کے دن انسان پریشان بھی ہو گا اور کمزور بھی ہو گا۔ اللہ کریم رحم فرمائیں۔

پہاڑ؛ دھنکی ہوئی روئی

﴿وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾﴾

اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگین روئی ہوتی ہے۔

عِھْن کہتے ہیں رنگین روئی کو اور منفوش کا معنی ہوتا ہے دھنکی ہوئی۔ پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور وہ قیامت کے دن اڑتے پھریں گے۔ ان کو رنگین دھنکی ہوئی اون سے تشبیہ دی کیونکہ اسے دھنکا جائے تو وہ اڑنے لگتی ہے۔

آخرت؛ عیش کی جگہ یا عذاب کا مقام

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾﴾

جس آدمی کا میزان وزنی ہو گا تو وہ عیش والی زندگی میں ہو گا اور جس کا میزان ہلکا ہو گا تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہو گا۔ تمہیں کیا پتا کہ ہاویہ کیا ہے؟ وہ تو جلا کر رکھ دینے والی سخت قسم کی آگ ہے۔

وزنِ اعمال دو مرتبہ ہو گا:

وزنِ اعمال قیامت کے دن دو مرتبہ ہو گا۔

[۱]: ایک ہو گا وزنِ اعمال کافر کا اور مؤمن کا۔ مؤمن کا وزنِ اعمال ایسا ہو گا کہ میزان بھاری ہو گا اور کافر کا وزنِ اعمال ایسا ہو گا کہ میزان ہلکا ہو گا۔ اس وزنِ اعمال کی وجہ سے کافر الگ ہو جائیں گے اور مؤمن الگ ہو جائیں گے۔

[۲]: اس کے بعد مؤمنین کا وزنِ اعمال دوبارہ ہو گا۔ اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ ان کی نیکیاں کتنی ہیں اور گناہ کتنے ہیں۔

اور یہ ذہن میں رکھ لیں کہ قیامت کے دن جو وزن ہو گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کو تولا جائے گا، گننے کی روایات نہیں ہیں۔ وہاں اعمال گنے نہیں جائیں گے کہ کتنے کیے ہیں بلکہ اعمال کو دیکھا جائے گا کہ کیسے کیے ہیں؟ اگر ایک آدمی نے دو رکعات پڑھی ہیں اور اخلاص بہت زیادہ ہے تو ان دو کا وزن دو سو رکعات سے بھی زیادہ ہو گا، یہ میں مثال دے رہا ہوں ورنہ کتنا زیادہ ہو گا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، اور جن میں اخلاص بہت کم ہو تو ان کا وزن کم ہو گا۔ اس پر تفصیلی بات میں سورۃ الملک کی آیت ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ میں کر چکا ہوں آپ کو یاد ہو گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ التکاثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾﴾

مال پر فخر کا انجام:

کافر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہمارے پاس مال بہت ہے، ہمارے پاس دولت بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: تم کو فخر کرنے نے غافل کر کے رکھ دیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ جاتے ہو!

یہاں ”التَّكَاثُرُ“ سے مراد کثرت نہیں ہے بلکہ کثرت پر فخر کرنا ہے۔

﴿كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾﴾

یہ جو تم مال کو قابلِ فخر سمجھتے ہو اور آخرت کو قابلِ غفلت سمجھتے ہو تو فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ ایسا ہرگز نہیں ہے یعنی مال قابلِ فخر چیز نہیں ہے، ﴿سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ جب تم مرو گے تو عنقریب تمہیں سمجھ آئے گی کہ دولت قابل فخر نہیں ہے، ﴿ثُمَّ كَلَّا﴾ پھر سنو! یہ جو تمہاری سوچ ہے کہ دولت قابلِ فخر چیز ہے تمہاری یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ﴿سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ جب تم موت کے بعد دوبارہ اٹھو گے پھر تمہیں سمجھ آجائے گی کہ یہ مال قابلِ فخر چیز نہیں ہے۔ تو پہلے ﴿سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ سے مراد مرتے وقت

پتا چلنا ہے اور دوسرے ﴿سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ سے مراد مر کر دوبارہ اٹھتے وقت پتا چلنا ہے۔ اب تکرار نہیں ہو گا کلام میں۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝٥﴾

اگر تمہارا خیال ہے کہ تم جو مال جمع کرتے ہو، کماتے ہو؛ اس کا کوئی حساب نہیں ہو گا تو تمہاری یہ رائے بالکل غلط ہے۔ اگر تم دیکھ لو اور تمہیں یقینی علم آ جائے تو تم ایسی باتیں کبھی نہ کرو، پھر تمہیں یہ چیزیں غفلت میں نہیں ڈالیں گی۔

﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝٧﴾

تم یقیناً جہنم کو دیکھو گے، پھر یقیناً تم اسے اپنی یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔

﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨﴾

پھر قیامت کے دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

سورۃ التکاثر کی فضیلت یہ ہے کہ اس کی تلاوت کرنے پر ایک ہزار آیتیں پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

یقین کے تین درجات:

یقین کے تین درجے ہوتے ہیں؛ ایک ہوتا ہے علم الیقین، ایک ہوتا ہے عین الیقین اور ایک ہوتا ہے حق الیقین۔

(1): علم الیقین کا معنی ہے کہ کوئی بتائے اور ہم مان لیں۔

(2): عین الیقین کا معنی ہے کہ دیکھیں اور مان لیں۔

(3): حق الیقین کا معنی ہے کہ تجربہ کریں اور مان لیں۔

سب سے اوپر کا مقام حق الیقین ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے دو کا تو تذکرہ کیا لیکن حق الیقین کا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کو عین الیقین ہو گا تو ان کو حق

الیقین بھی ہو گا۔ تو یہاں جو فرمایا﴿لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ﴾ کہ تم نے جہنم کو دیکھنا ہے تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے جہنم میں داخل ہونا ہے، کیونکہ جہنم کو مؤمن بھی دیکھے گا اور کافر بھی دیکھے گا لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل صرف کافر ہو گا۔ جب وہاں جائے گا تو اسے حق الیقین بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس لیے یہاں پر حق الیقین کا ذکر نہیں ہے، ورنہ یقین کے تین درجے ہوتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ العصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪﴿۳﴾﴾

کامیابی کا راز:

یہاں پر اللہ رب العزت نے قسم کھائی ہے زمانے کی کیونکہ اسی زمانے میں انسان خسارے اور نقصان میں رہتا ہے۔ زمانے کی قسم کھا کر فرمایا: کامیاب انسان وہی ہو گا جس کا عقیدہ ٹھیک ہو، اعمال سنت کے مطابق ہوں، حق کی تلقین کرتا ہو اور صبر کی تلقین کرتا ہو۔

اب دیکھیں! اللہ نے ”زمانہ“ مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ اس کی مناسبت مضمونِ قسم کے ساتھ یہ ہے کہ انسان کی تباہی اور انسان کی آبادی اسی زمانہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اس مدت میں چاہیں تو نیک اعمال کریں اور خود کو آباد کریں اور اللہ کو خوش کریں اور آخرت کی تیاری کر لیں اور چاہیں تو اسی زمانے میں گناہ کریں اور اپنے آپ کو برباد کریں۔

اب دو چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی جان سے ہے اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے نہیں ہے۔ ﴿اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا

﴿الصّٰلِحٰتِ﴾ کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے کہ اپنا عقیدہ ٹھیک ہو اور اپنے اعمال سنت کے مطابق ہوں۔ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ ہے کہ دوسروں کو حق کی تلقین کریں اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ تو کچھ کام ہر بندے کے ذمے ہیں اور کچھ کام بقدرِ طاقت بندے کے ذمہ ہیں۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا معنی:

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ اس کے کئی معانی ہیں۔

[۱]: یہاں حق سے مراد ہے ایمان اور اعمالِ صالحہ اور صبر سے مراد ہے گناہوں سے بچنا۔ اب حکم یہ ہو گا کہ وہ امر بالمعروف بھی کرتے ہیں اور نہی عن المنکر بھی کرتے ہیں۔

[۲]: دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ عقائد میں فساد آتا ہے شبہات کی وجہ سے اور اعمال میں فساد آتا ہے خواہشات کی وجہ سے۔ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ کا معنی ہے کہ یہ لوگ شبہات کو دور کرتے ہیں اور ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کا معنی کہ خواہشات کی اصلاح کرتے ہیں۔ شبہات کے ازالے کا تعلق علم سے ہے اور خواہشات کی اصلاح کا تعلق عمل سے ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ علمی اصلاح بھی کرتے ہیں اور عملی اصلاح بھی کرتے ہیں، اور علمی و عملی اصلاح یہ عوام کا کام نہیں ہے... یہ علماء کا کام ہے، اس لیے علماء کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ شبہات کا رد کیسے کرنا ہے اور خواہشات کی اصلاح کیسے کرنی ہے۔ اس کا علماء کو بطورِ خاص خیال رکھنا چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ الھمزہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾﴾

عیب جوئی اور طعنہ زنی دو بری خصلتیں:

ہَمز کا معنی ہوتا ہے پیٹھ پیچھے کسی کے عیب بیان کرنا اور لَمز کا معنی ہوتا ہے آمنے سامنے کسی کو طعنہ دینا۔ یہاں تین جرم بیان فرمائے ہیں۔

فرمایا: تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو دوسروں میں عیب نکالتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں۔

بعض اعتبار سے کسی کے عیب بیان کرنا، کسی کی غیبت کرنا بڑا جرم ہے اور بعض اعتبار سے طعنہ دینا بڑا جرم ہے۔ غیبت کرنا اس لیے بڑا جرم ہے کہ غیبت تو غیر موجودگی میں ہوتی ہے۔ جب آدمی کسی کی غیبت کرتا ہے تو اس کو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا اس لیے بندہ اس میں لگا رہتا ہے اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے؛ اس حساب سے یہ بڑا گناہ ہے۔ اور جب کسی کو کوئی طعنہ دیں تو طعنہ دینے والا شخص چونکہ سامنے ہوتا ہے اس لیے وہ اپنا دفاع بھی کرتا ہے اس لیے یہ گناہ زیادہ بڑھتا نہیں ہے، بس ایک حد تک آ کے ختم ہو ہی جاتا ہے۔

اور بعض مرتبہ کسی کو طعنہ دینا بڑا جرم ہوتا ہے کیوں کہ جس کو طعنہ دیا

جائے تو یہ اس کی توہین ہوتی ہے اور کسی کی توہین کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

مال سے حد درجہ محبت:

﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۝۲ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝۳﴾

یہ وہ شخص ہے جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا!

اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ مدرسے کے پیسے آئے تو ان پر یہ بات فٹ کریں، آدمی دکان پر بیٹھا ہو اور شام کو پیسے گنے تو اس پر فٹ کریں، کہیں سے کوئی ہدیہ یا صدقہ ملے اور اس کو گنیں تو اس پر فٹ کریں... یہ معنی نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ ایسا شخص ہے کہ جو اپنے مال پر فخر کرتا ہے اور گن گن کر اپنے آپ کو خوش کرتا ہے کہ میرے پاس اتنے لاکھ ہو گئے، اتنے کروڑ ہو گئے، گن گن کر بتاتا ہے اور یہ شخص مال کی محبت میں اتنا منہمک ہے کہ سمجھتا ہے کہ میری ہر مشکل مال و دولت سے حل ہو گی، موت سے غافل ہو کر زندگی کے منصوبے یوں بنا رہا ہے کہ گویا اس کا مال بھی ہمیشہ رہے گا اور یہ خود بھی ہمیشہ رہے گا، اس پر کبھی موت آئے گی ہی نہیں۔ فرمایا:

حُطمہ کیا ہے:

﴿کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۝۴ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷﴾

یہ بات اس کی بالکل غلط ہے کہ اس نے اور اس کے مال نے ہمیشہ رہنا ہے بلکہ اس کو ایسی آگ میں پھینکیں گے کہ جو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔ توڑ پھوڑ کرنے والی آگ کون سی ہے؟ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے اور یہ سیدھی دل پر پہنچتی ہے۔

یہ جو فرمایا کہ یہ آگ سیدھی دل پر پہنچتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے دنیا میں جو آگ ہے اگر وہ انسان کو لگے تو وہ بھی دل پر جاتی ہے اور جو جہنم کی آگ ہے وہ بھی دل پر جاتی ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیا کی آگ جب جسم کو لگے تو دل پر پہنچنے سے پہلے ہی انسان مر جاتا ہے تو دل جلانے کی تکلیف اس کو محسوس نہیں ہوتی لیکن جہنم کی آگ ایسی ہوگی کہ آدمی کا جسم جلا کر دل کو جلائے گی اور بندہ زندہ ہوگا اور دل جلنے کے درد کو محسوس کرے گا۔ تو جہنم کی آگ کا معاملہ دنیا کی آگ سے مختلف ہوگا کہ انسان زندہ بھی ہوگا اور دل کو جلتا ہوا دیکھے گا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

﴿إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾﴾

ان کو اس آگ میں بند کر دیا جائے گا اور بڑے بڑے ستون ہوں گے جہاں سے یہ لوگ باہر نہیں نکل سکیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الفیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾﴾

واقعہ اصحاب فیل:

اصحاب فیل کا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت والے سال کا پیش آیا تھا۔ سورۃ البروج میں پہلے بات گزر چکی ہے کہ یمن کا آخری بادشاہ یوسف ذونواس تھا جو قوم حِمیَر کا تھا۔ اس نے اس وقت کے جو اہلِ حق تھے یعنی نصاریٰ ان پر بہت ظلم وستم کیا تھا۔ خندقیں کھدوا کر ان میں آگ بھری اور ان لوگوں کو اس آگ میں جھونک دیا۔ بارہ ہزار یا اس سے بھی زائد بندے اس نے جلائے تھے۔ ان کا اپنا انجام یہ ہوا کہ خندقوں کی آگ خندقوں سے باہر نکل کر پھیلی اور اس نے خندق پر موجود سپاہیوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ ملکِ یمن پر ارباط اور ابرہہ نے قبضہ کیا، ذونواس کو شکست دی، وہ بھاگ کر دریا کی طرف گیا اور دریا میں غرق ہو کر مرا۔ یہ واقعہ آپ کے علم میں ہے۔

ان مظلوم عیسائیوں میں سے دو آدمی ذونواس کی گرفت سے بچ کر ملک شام نکل گئے قیصر کے پاس اور اسے جا کر کہا کہ حِمیَر کے بادشاہ ذونواس نے نصاریٰ پر ظلم کیا ہے، آپ اس سے انتقام لیں۔ قیصر نے حبشہ کے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ ذونواس بادشاہ

سے انتقام لو! ملکِ یمن حبشہ سے قریب پڑتا تھا۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ابرہہ اورا رباط -یہ اس کے دو جرنیل تھے- ان کو بھیجا یمن پر حملے کے لیے تو انہوں نے جا کر پورے یمن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پھر ان کی آپس میں بھی لڑائی ہوئی، ارباط مارا گیا اور ابرہہ بچ گیا۔ اس ابرہہ کو نجاشی بادشاہ نے یمن کا حاکم بنا دیا۔

اب چونکہ یہ تھا نصرانی اور اس کا مکہ سے تو تعلق تھا نہیں تو اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب مجھے اپنی سلطنت ملی ہے، اپنی حکومت ملی ہے، اپنی طاقت ملی ہے تو میں یہاں پر ایک ایسا کنیسہ بناؤں گا کہ لوگ مکہ میں بیت اللہ کے بجائے یہاں اس کنیسہ میں عبادت کریں۔ اس نے پھر ایک بہت بڑا عبادت خانہ بنایا جو اتنا اونچا تھا کہ نیچے کھڑے ہو کر اس عبادت خانے کی بلندی پر نظر ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ ہیرے جواہرات سب کچھ اس پہ لگا دیا۔

یمن میں جو لوگ رہتے تھے وہ اس سے نفرت کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ لوگ مکہ میں جائیں اور بیت اللہ کی زیارت کریں۔ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسافر قبیلہ نے کنیسہ کے قریب آگ جلائی اور آگ کنیسہ کو لگ گئی اور اسے کافی نقصان پہنچا۔ بعض روایات میں ہے اس سے نفرت کرتے ہوئے کسی نے اس کنیسہ میں پاخانہ کر دیا۔ جب ابرہہ کو پتا چلا تو اس نے کہا کہ میں مکہ جاؤں گا اور بیت اللہ کو گرا کے رکھ دوں گا۔ اب ابرہہ بیت اللہ کو گرانے کے لیے نکلا تو جو عرب تھے راستے میں ذُونفر انہوں نے مقابلہ کیا۔ یمن میں تھے، انہوں نے اپنے عرب قبائل کو اکٹھا کیا، مقابلہ کیا لیکن وہ بیچ میں ہی ختم ہو گئے۔

پھر یہ آگے نکلا تو راستے میں ایک قبیلہ تھا قبیلہ خثعم، اس کا سردار تھا نفیل بن حبیب۔ انہوں نے مقابلہ کیا، وہ بھی گرفتار ہو گئے۔ پھر یہ طائف گئے انہوں نے ان سے معاہدہ کر لیا کہ تم ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بالآخر یہ

مکہ پہنچے اور انہوں نے سب سے پہلے جو ان کے اونٹ تھے ان پر قبضہ کر لیا۔ جناب عبد المطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔ اس ابرہہ کا ایک سفیر اندر گیا حناطہ حِمیُری تو اس نے مکہ والوں سے بات کی۔ مکہ والوں نے کہا کہ ہمارے بڑے سردار ہیں عبد المطلب آپ ان سے بات کریں۔ عبد المطلب سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہمارے اونٹ دے دو، باقی تم جانو اور کعبے کا خدا جانے۔

حناطہ حِمیُری نے کہا کہ چلو تم بات کرو ابرہہ سے۔ بات کرنے کے لیے گئے۔ کہتے ہیں کہ عبد المطلب بہت وجیہ آدمی تھے، قد آور آدمی تھے۔ ان کو ابرہہ نے دیکھا تو اپنے شاہی تخت سے نیچے اتر آیا، ان کے ساتھ بیٹھا، پوچھا: کیسے آئے؟ ابرہہ نے کہا کہ ہمارے آنے کا مقصد تو کعبہ گرانا ہے۔ عبد المطلب نے کہا کہ میں کعبہ کے لیے بات کرنے نہیں آیا ہوں، میں تو اونٹ مانگنے کے لیے آیا ہوں۔ تو ابرہہ نے کہا کہ میرے دل میں جو تمہاری عزت تھی وہ اس بات سے ختم ہو گئی، میرا خیال یہ تھا کہ تم اپنے عبادت خانے کی بات کرو گے، تم عبادت خانے کے بجائے اونٹوں کی بات کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بہر حال وہ تو کعبہ جانے اور اس کا رب جانے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ ہمارے اونٹ واپس کر دو! ابرہہ نے اونٹ واپس دے دیے۔ عبد المطلب واپس چلے گئے۔

واپس جا کر انہوں نے کعبہ کو پکڑ کر دعائیں مانگیں اور ان کو یقین تھا کہ یہ لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد دعائیں مانگیں اور قریش کے جتنے لوگ تھے وہ پہاڑوں پر چڑھ گئے منظر دیکھنے کے لیے۔ ابرہہ کے ہاتھی کا نام تھا محمود جو بڑا ہاتھی تھا، سات آٹھ ہاتھی اور بھی اس کے ساتھ تھے۔ جب یہ مکہ میں داخل ہونے لگے تو ہاتھی نے اٹھنے سے انکار کر دیا اور بعض کہتے ہیں کہ نفیل بن حبیب نے اس ہاتھی کے کان میں کہا تھا کہ دیکھو! یہ اللہ کا گھر ہے ادھر نہ جانا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

اب ہاتھی کو واپس لاتے تو وہ چلتا، سیدھا چلاتے تو نہیں چلتا تھا، اٹھنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہو رہا تھا، بہت کچھ کیا جیسے ہاتھی کو مارتے ہیں، کڑے ڈالتے ہیں لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔ پھر مجبور کیا اس کے ناک میں کڑا ڈال کر تیار کیا، کھینچا پھر بھی آگے نہیں گیا۔

خیر وہ تو نہیں اٹھا، باقی ہاتھی اٹھے اور ان لوگوں نے کعبہ کا جونہی رخ کیا تو اللہ رب العزت نے چھوٹے چھوٹے پرندوں سے جو بہت چھوٹے تھے اور سرخ رنگ کے ان کے پنجے تھے، ہر ایک کے پاس تین کنکریاں ہوتیں اور وہ کنکریاں ایسی تھیں جو تر مٹی کو آگ پر پکانے سے تیار ہوتی ہیں، ایک چونچ میں ایک دائیں پنجے میں اور ایک بائیں پنجے میں۔ جس کے سر پر لگتی اس کے اوپر سے داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور پورا جسم بھوسے کی طرح ہو جاتا تھا۔ ابرہہ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا۔ اس کا جسم گلنا شروع ہو گیا تو اس کے جسم کا ایک ایک حصہ گل گل کر سڑ سڑ کر گرتا رہا اور بالآخر یہ مر گیا۔

یمن کا دارالحکومت ہے صنعاء اور وہاں پر یہ کلیسا ہے۔ اس کو میں نے خود دیکھا ہے۔ اس طرح عجیب تباہ شدہ جگہ ہے کہ آدمی کو دیکھ عبرت ہوتی ہے۔ تھوڑی سی جگہ ہے، کنویں کی طرح ہے اور کوئی مخلوق وہاں آباد نہیں۔ ایک اجڑا ہوا سا محلہ ہے اور وہاں اس کے آثار ونشان پڑے ہیں۔ اس کے باہر ایک جنگلا لگا ہوا ہے، اس کو بند کیا ہوا ہے، بس یہ جگہ تھی۔

ہاتھی والوں کا انجام:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝١﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو نہیں دیکھا لیکن اگر واقعہ ایسا

یقینی ہو کہ لوگوں نے اس کو دیکھا ہو اور اس کا مشاہدہ بھی کیا ہو تو اس کے علم یقینی کو کبھی لفظِ رؤیت سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح مستقبل میں ہونے والے واقعات جن کا وقوع یقینی ہو تو انہیں بھی ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دو آدمیوں کو مکہ مکرمہ میں خود دیکھا، وہ آنکھوں سے نابینا اور پاؤں سے لنگڑے تھے اور اللہ کے عذاب کو بھگت رہے تھے۔ یہ اصحاب الفیل میں سے تھے۔

﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝٢ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝٣﴾

کیا اللہ نے ان کی ساری تدبیروں کو خاک میں نہیں ملا دیا تھا؟! اور ان پر مختلف قسم کے پرندے بھیجے تھے۔

"ابابیل" کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے۔ پرندوں کے جھنڈ کو ابابیل کہا گیا ہے۔ یہ پرندوں کی کوئی قسم تھی جو اللہ نے ان پر بھیجی تھی۔ ایک خاص قسم کا پرندہ جسے ہم اپنی زبان میں ابابیل کہتے ہیں یہ وہ نہیں تھے۔

﴿تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝٤﴾

یہ پرندے ان پر پتھر کے کنکر پھینک رہے تھے۔ "سِجِّيْلٍ" کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مُعَرَّب ہے سنگِ گل سے۔

﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝٥﴾

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔

عام بھوسہ نہیں بلکہ وہ بھوسہ جو کھایا ہوا ہوتا ہے، اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ القریش

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾﴾

قریش کی عظمت اس واقعہ فیل کے بعد پوری دنیا میں مشہور ہو گئی کہ یہ بہت نیک ہیں، عظمت والے ہیں، عزت والے ہیں، ہر کوئی ان کا احترام کرتا تھا۔ یہ لوگ سردیوں میں اور گرمیوں میں سفر کرتے تھے تجارت کے لیے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ یمن گرم علاقہ ہے اور شام ٹھنڈا ہے تو یہ سردیوں میں یمن جاتے اور گرمیوں میں شام جاتے اور کعبے کی عظمت کی وجہ سے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ قافلوں پہ ڈاکے پڑتے لیکن انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ تو اللہ پاک نے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ تم ان نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

﴿لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾﴾

قریش کے مانوس ہو جانے کی وجہ سے یعنی گرمی اور سردی کے سفر سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے۔

اس کا محذوف کیا ہے؟ "اَہۡلَکۡنَا اَصۡحٰبَ الۡفِیۡلِ" ہم نے ان ہاتھی والوں کو تباہ کیا تھا قریشیوں کی وجہ سے، جب وہ تباہ ہوئے تو قریش کو مزید عزت ملی۔

﴿فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ

اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

اس لیے ان کو چاہیے کہ اس گھر؛ بیت اللہ کے رب کی عبادت کریں جس رب نے ان کو بھوک میں کھلایا اور جس نے خوف سے ان کو امن دیا۔

عبادت کے لیے دو اہم چیزیں:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں:

1: فقر وفاقہ نہ ہو۔

2: بدامنی نہ ہو۔

امن ہو اور پیٹ میں خوراک ہو تو عبادت کرنے کا آدمی کو لطف آتا ہے۔

دو نعمتیں بہت اہم ہیں اور خصوصاً اپنے ملک پاکستان کے لیے دعا کیا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں دونوں چیزیں عطا فرمائیں! اللہ معیشت میں کسی کا محتاج نہ بنائیں اور اللہ امن میں غیر کا محتاج نہ بنائیں۔ اللہ ہمارے ملک پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورة الماعون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧﴾

یہ سورت بھی کفار کے رد میں ہے اور اس میں ان کے جرائم کو بیان کیا گیا ہے فرمایا: کیا آپ نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غافل ہیں- یعنی جو نماز پڑھتے ہی نہیں، اگر کبھی پڑھتے ہیں تو- دکھاوا کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔

"ماعون" کہتے ہیں بہت چھوٹی سی چیز کو جو عام طور پڑوسی ایک دوسرے سے عاریۃً لیتے رہتے ہیں اور زکوٰۃ کو ماعون اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مال کا چالیسواں حصہ یعنی سو روپے کے مقابلے میں اڑھائی روپے ہوتے ہیں جو بالکل تھوڑے ہوتے ہیں، اس لیے زکوٰۃ کو ماعون کہتے ہیں۔ تو یہ صفتیں کفار کی ہیں۔ مسلمان کو یہ صفتیں اختیار نہیں کرنی چاہییں اور ان سے بچنا چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الکوثر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَؕ‏ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡؕ‏ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝۳﴾

شانِ نزول:

عاص بن وائل ایک کافر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے جناب قاسم جب فوت ہوئے تو عاص بن وائل نے طعنہ دیا، کہا کہ محمد کی نرینہ اولاد فوت ہو گئی، اب ان کا مشن چلانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ بس جونہی یہ فوت ہوں گے ان کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس پر سورۃ الکوثر نازل ہوئی۔

فرمایا: اے پیغمبر! ہم نے آپ کو کوثر؛ خیرِ کثیر دی ہے۔

"الکوثر" کا معنی:

"الکوثر" کے چھبیس معانی ہیں اور سارے معانی اس "خیرِ کثیر" پر صادق آتے ہیں۔ اکثر مفسرین اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ "ہم نے آپ کو حوضِ کوثر عطا کیا۔" حوضِ کوثر میدانِ حشر میں ایک حوض ہو گا۔ کوثر؛ جنت کی ایک نہر ہے، وہاں سے دو پرنالے اس حوض میں گرتے ہیں۔ اس سے ایمان والوں کو پانی پلایا جائے گا۔ اس کی لمبائی ایک مہینے کی مسافت کے برابر ہے۔ پانی اس حوض کا دودھ سے زیادہ سفید ہو گا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہو گا۔ پانی پینے کے لیے برتنوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گی کہ

ستاروں کی تعداد سے بھی زیادہ اور جو شخص اس سے پانی پی لے گا تو جنت میں داخل ہونے تک اس کو پھر پیاس نہیں لگے گی۔ اللہ ہم سب کو یہ عطا فرمادیں۔ آمین

اور بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ اس حوض پر آئیں گے تو فرشتے ان کو ہٹا کر پیچھے کر دیں گے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ یہ تو میرے ساتھی ہیں، ان کو آنے دو، "فَيُقَالُ لِي: إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ"[114]

فرشتے کہیں گے: آپ کو نہیں پتا کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کون سی خرافات کی تھیں! یہ آپ کے ساتھی نہیں ہیں۔

اس کے بارے میں بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بہت سخت وعید ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان اور اعمال کی نفی کرتی ہے... حالانکہ اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا معنی یہ نہیں کہ "یہ میرے صحابہ ہیں" بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ یہ میری امت کے لوگ ہیں، یہ تو میرے ساتھی ہیں۔ فرشتے کہیں گے کہ نہیں! آپ کو نہیں پتا، یہ بدعتی لوگ ہیں۔ رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے فرمائیں گے کہ یہ میرے ساتھی ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے کہ وضو کرنے والے کے اعضائے وضو روشن ہوتے ہیں۔ تو اعضائے وضو کے روشن ہونے سے معلوم ہو گا کہ یہ آپ کے امتی اور آپ کے ساتھی ہیں لیکن بدعات کی وجہ سے ان کو پیچھے ہٹا دیا جائے گا۔ لہذا اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر رد نہیں ہوتا۔

اور صحیح بخاری کی جو روایت ہے:

114۔ مسند احمد: ج2 ص518 رقم الحدیث 2096

مُرۡتَدِّينَ عَلٰى أَعۡقَابِهِمۡ.[115]

کہ یہ لوگ وہ تھے جو مرتد ہو گئے تھے۔

اب یہاں صلہ "عَلٰی" ہے، "عَنۡ" نہیں ہے۔ اگر "عَنۡ" ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ایمان لائے تھے پھر ایمان سے پھر گئے تھے۔ لیکن یہاں "عَلٰی" ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ ایمان میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بظاہر ایمان والوں میں شامل تھے، حقیقت میں نہیں۔ تو جیسے آئے تھے ویسے ہی پلٹ گئے تھے۔ اگر ان الفاظ پر غور کریں تو پھر کوئی بھی اشکال نہیں رہتا۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۝٢﴾

آپ اس نعمت کے شکر میں اللہ کی نماز پڑھیں اور قربانی دیں۔

عموماً "نحر" کا تعلق ہوتا ہے اونٹ کی قربانی پر۔ عرب چونکہ اونٹ کی قربانی زیادہ کرتے تھے اس لیے "وَانۡحَرۡ" کا لفظ استعمال کیا ورنہ نحر کا لفظ اونٹ کی قربانی پر بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسرے جانوروں کی قربانی پر بھی ہو جاتا ہے۔

"وَانۡحَرۡ" کا ایک معنی حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے یہ کیا ہے کہ آدمی نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھے۔[116]

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡأَبۡتَرُ ۝٣﴾

"شَانِئَكَ" کا معنی ہوتا ہے عیب لگانے والا، بغض رکھنے والا۔ فرمایا: یہ جو آپ سے بغض رکھتے ہیں نا تو مقطوع النسل یہی ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے اگرچہ آپ کے مخالفین کی جسمانی اولاد بھی ہو لیکن ان

115۔ صحیح البخاری، رقم:3349

116۔ سنن الاثرم بحوالہ التمہید لابن عبد البر: ج8 ص164

کا نام نہیں ہو گا، ان کا تذکرہ نہیں ہو گا، ان کا کام نہیں چلے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد تو فوت ہو گئی لیکن روحانی اولاد تو ہے، قیامت تک جو شخص کلمہ پڑھے گا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی بیٹا ہے اور آپ کی مذکر جسمانی اولاد نہ بھی ہو تو بیٹی سے تو آپ کی اولاد چلی ہے نا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی رہے گا اور اولاد سے جو مقصود ہوتا ہے وہ مشن بھی آپ کا ان شاء اللہ چلتا رہے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝﴾

شانِ نزول:

عاص بن وائل، اسود بن عبد المطلب، ولید بن مغیرہ اور امیہ بن خلف یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک وفد لے کر آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم معاہدہ کر لیتے ہیں کہ آپ ایک سال تک ہمارے خداؤں کی عبادت کریں اور ایک سال تک ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں۔ اس سے باہمی لڑائی اور جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝﴾

کہہ دیجیے! اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور میں آئندہ بھی ان کی عبادت نہیں کرنے والا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم ان کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

دو جملوں کے تکرار کی وجہ:

﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵﴾

یہاں یہ جملے تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اس لیے مفسرین حضرات نے اس کی مختلف تفسیریں بیان کی ہے:

[۱]: ایک تو اس کی تفسیر یہ ہے کہ پہلے جملے ﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳﴾ کا معنی یہ ہے کہ میں فی الحال ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور تم بھی فی الحال اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی عبادت میں کرتا ہوں... اور دوسرے جملے ﴿وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵﴾ کا معنی یہ ہے میں آئندہ بھی ان کی عبادت نہیں کروں گا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ ہی آئندہ تم اس کی عبادت کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اس تفسیر کے مطابق ایک جملے کا تعلق حال سے ہے اور دوسرے کا تعلق مستقبل سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ موحد ہوتے ہوئے بندہ مشرک نہیں ہو سکتا اور مشرک ہوتے ہوئے موحد نہیں ہو سکتا۔ یہ میں اس لیے وضاحت کر رہا ہوں کہ شاید کسی کے ذہن میں آئے کہ یہ جو فرمایا کہ "میں نے عبادت کی ہے نہ کروں گا تمہارے معبودوں کی" یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے اور یہ جو فرمایا کہ "تم نہ میرے رب کی عبادت کرتے ہو نہ کرو گے" تو یہ کیسے فرمادیا؟ کیونکہ ان میں سے کتنے مشرک تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے! اس کا جواب یہ ہے کہ تم جب تک مشرک ہو اور مشرک ہو کر میرے رب کی عبادت کرو تو اس عبادت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، موحد؛ موحد ہوتے ہوئے مشرک

نہیں ہو سکتا اور مشرک؛ مشرک ہوتے ہوئے موحد نہیں ہو سکتا۔

[۲]: اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ "مَا" کبھی موصولہ ہوتا ہے جو بمعنی "اَلَّذِیۡ" کے ہوتا ہے اور کبھی "مَا" مصدریہ ہوتا ہے کہ جس فعل پر داخل ہو اسے مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہاں جو پہلا جملہ ہے ﴿لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾﴾ اس میں "مَا" موصولہ ہے، اس صورت میں معنی یہ بنتا ہے کہ میں نہیں عبادت کرتا ان کی جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم نہیں عبادت کرتے اس خدا کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں، اور دوسرے جملے ﴿وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾﴾ میں "مَا" مصدریہ ہے۔

معنی ہو گا کہ میری عبادت کا طریقہ وہ نہیں ہے جو تمہاری عبادت کا طریقہ ہے اور تمہاری عبادت کا طریقہ وہ نہیں ہے جو میری عبادت کا طریقہ ہے۔ تو پہلے سے مراد معبودوں کا اختلاف ہے کہ میرا معبود الگ ہے اور تمہارا معبود الگ ہے... اور دوسرے سے مراد طریقہ عبادت کا اختلاف ہے کہ تمہارا طریقہ عبادت الگ ہے اور میرا طریقہ عبادت الگ ہے، اور کلمہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللہِ" اس کی عملی تفسیر بنتا ہے۔ عبادت کے لیے بھی دو چیزیں ہوتی ہیں؛ ایک حکم خدا اور دوسرا طریقہ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ معبود اور طریقہ عبادت دونوں الگ الگ ہیں۔

[۳]: اور تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس میں تاکید مقصود ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں... میں پھر کہتا ہوں کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

تو یہاں تکرار؛ تاکید کے لیے ہے۔

اہلِ باطل سے براءت کا اعلان:

﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾

تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ یہاں دین سے مراد یا تو "جزا" ہے کہ تمہارے عقیدے اور عمل کی جزا تمہیں ملے گی اور میرے عقائد اور اعمال کی جزا مجھے ملے گی... یا دین کا معنی عقیدہ اور نظریہ ہے کہ تم اپنے دین پر ہو اور میں اپنے دین پر ہوں، میری وجہ سے اگر تم اپنا دین نہیں بدلتے تو تمہاری وجہ سے میں اپنا دین بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

دین اور مذہب میں فرق:

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ اصل میں دین اور مذہب میں فرق ہوتا ہے۔ دین کہتے ہیں منصوصات کو اور مذہب کہتے ہیں اجتہادیات کو۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں؛ مذاہب اربعہ، مذہب ابی حنیفہ... ادیانِ اربعہ نہیں کہتے اور دینِ ابی حنیفہ بھی نہیں کہتے۔ جب یہ بات سمجھ آئے گی تو یہ اشکال ختم ہو جائے گا کہ جی انہوں نے دین کے چار ٹکڑے کر دیے ہیں؛ ایک دین ابو حنیفہ کا ہے، ایک دین شافعی کا ہے، ایک دین مالک کا ہے اور ایک دین امام احمد بن حنبل کا ہے -رحمہم اللہ- جبکہ قرآن کہتا ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾[117] کہ دین ایک ہی ہے اور انہوں نے دین کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہم نے کہا کہ دین چار نہیں ہیں، دین ایک ہی ہے البتہ مذاہب چار ہیں۔ دین کہتے ہیں منزل کو مذہب کہتے ہیں راستے کو۔ منزل ایک ہوتی ہے اور منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کئی ہو سکتے ہیں۔ تو دین؛ منصوصات کا نام ہے اور

117۔ آل عمران 19:3

مذہب؛ اجتہادیات کا نام ہے۔

یہ بات میں نے اس لیے کی ہے کیونکہ بعض مفسرین یہاں کہتے ہیں کہ دین سے مراد دینِ اسلام ہے۔ تو جہاں یہ لکھا ہو کہ یہاں دین سے مراد مذہب ہے تو وہاں مذہب کا لفظ دین کے لیے استعمال ہوا ہوتا ہے ورنہ معنی دونوں کا بالکل الگ الگ ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے ایمان کا معنی الگ ہے اور اسلام کا معنی الگ ہے لیکن ایمان کا لفظ اسلام پر بولا جاتا ہے کیوں کہ ایمان سے مقصود اسلام ہے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں ہے۔ اس لیے ایسا اطلاق کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔

سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص فجر اور مغرب کی سنتوں میں پڑھنا مستحب اور محبوب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے اور آپ اس کا تذکرہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

خطاب کرنے اور نقل کرنے میں فرق:

لفظ "قل" پر بات اچھی طرح سمجھو۔ میں کئی بیانات میں بات عرض کیا کرتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ تکلم فرماتے ہیں تو معنی الگ ہوتا ہے اور جب ہم تکلم کرتے ہیں تو معنی الگ ہوتا ہے۔ ہم اھل السنۃ والجماعۃ ہیں۔ ہم اذان سے پہلے "اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللهِ" نہیں پڑھتے۔ کوئی بندہ پوچھے کہ تم کیوں نہیں پڑھتے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ ہم اس لیے نہیں پڑھتے کہ ہم عاشقِ پیغمبر ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر کے عاشق ہوتے پھر تو پڑھتے، صلوٰۃ نہ پڑھنا یہ کون سا عشق پیغمبر ہے؟ ہم نے کہا: بھائی دیکھو! ہم یہاں زندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں زندہ، اور یہاں سے مدینہ منورہ کا فاصلہ ہزاروں کلو میٹر کا ہے اور جس کو بڑا سمجھیں اس کو دور سے پکارنا ادب کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے ہم دور سے یا

رسول اللہ نہیں کہتے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔

میں سمجھانے کے لیے پھر مثالیں دیتا ہوں اور طلبہ سے بھی کہتا ہوں کہ اپنے بیان میں مثال ضرور دیا کرو اس سے بات کھلتی ہے۔ ایک آدمی سکول میں جاتا ہے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے پوچھتا ہے کہ میں نے ماسٹر غلام رسول صاحب سے ملنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ماسٹر صاحب تو ابھی چلے گئے۔ ایک بچے کو ہیڈ ماسٹر صاحب دوڑاتے ہیں کہ جاؤ اور ماسٹر صاحب کو بلا کر لاؤ۔ وہ بچہ ان کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ کوئی دور سے اس بچے کو آتا ہوا دیکھتا ہے تو ماسٹر صاحب سے کہتا ہے کہ استاذ جی لگتا ہے کہ وہ بچہ آپ کو بلانے کے لیے دوڑا آرہا ہے۔ ماسٹر صاحب پیچھے دیکھتے ہیں تو رک جاتے ہیں۔ بچہ قریب آتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ تم مجھے بلانے آئے ہو؟ وہ کہتا ہے: جی ہاں، آپ کو ہیڈ ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ بیٹا! آپ مجھے آواز دے دیتے! تو وہ بچہ کہتا ہے کہ سر! میں آپ کو آواز کیسے دیتا؟

اب دیکھو یہ ماسٹر غلام رسول ہے تو ہم اتنا ادب کرتے ہیں کہ غلام رسول ہو اور استاذ ہو تو اس کو بھی دور سے نہیں پکارتے۔ تو خود رسول کو دور سے کیسے پکاریں گے؟! — صلی اللہ علیہ وسلم — اب دیکھو! کس طرح عوام کے ذہن میں مثال بیٹھتی ہے۔

تشہد کے صیغہ خطاب سے استدلال کا جواب:

اب اس پر وہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ" اب تو آپ نے بھی دور سے پکار لیا۔ تو اب آپ بھی بے ادب بن گئے۔ ہم نے کہا کہ نہیں! اذان سے پہلے "اَلصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ" اور تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ" کہنے میں فرق ہے۔ جواب بہت اچھی طرح سمجھنا! یہ مسئلہ بار بار آپ کو پیش آئے گا۔

اب فرق کیا ہے! جب اللہ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

- ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

اے نبی! اٹھیں اور تہجد پڑھیں۔

- ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝﴾

اے نبی! اٹھیں اور تبلیغ کریں۔

- ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾

اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور ایمان والی عورتوں سے فرمائیں کہ پردہ کریں۔

- ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾

آپ فرمائیں کہ اے کافرو!

ان آیات میں اللہ رب العزت اپنے نبی کو حکم دیتے ہیں! اور جب ہم قرآن پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ تو ہم نبی کو حکم نہیں دیتے، جب ہم پڑھتے ہیں ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ تو ہم حضور کو حکم نہیں دیتے، جب ہم پڑھتے ہیں ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ﴾ تو ہم حکم نہیں دیتے۔ فرق یہ ہے کہ جب اللہ ”یا“ فرمادیں تو پیغمبر کو حکم دیتے ہیں اور جب ہم ”یا“ کہیں تو حکم نہیں دیتے بلکہ اللہ کے خطاب کو نقل کرتے ہیں۔

جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر تشریف لے گئے ہیں معراج کے موقع پر؛ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ“ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا تھا اور جب ہم نماز میں کہتے ہیں: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ“ تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب نہیں کرتے بلکہ ہم اللہ کے خطاب کو

نقل کرتے ہیں۔ خطاب کرنا اور ہوتا ہے اور خطاب کو نقل کرنا اور ہوتا ہے۔ ہم خطاب نہیں کرتے بلکہ خطاب کو نقل کرتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عرش سے فرش پر واپس تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد میں پڑھا: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کسی نبی کو خطاب نہیں کیا بلکہ اللہ کے عرش والے خطاب کو نقل فرمایا۔ اسی طرح جب ہم پڑھتے ہیں تو ہم بھی پیغمبر کو خطاب نہیں کرتے بلکہ اللہ کے خطاب کو نقل کرتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ النصر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾

جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صحابہ کرام کے مجمع میں تلاوت فرمایا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس کو سن کر رونے لگے۔ رونے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس میں جہاں فتح مکہ کی بشارت ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے جانے کے اشارے بھی ہیں۔

فرمایا: جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح ہو جائے تو آپ لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ اسلام میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔

﴿فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾﴾

تو آپ اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھیں اور استغفار کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول فرمانے والے ہیں۔

ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ دعا تین مرتبہ

پڑھتے تھے: "سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ"[118]

ام المؤمنین ام سلمۃ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ علیہ وسلم کا معمول بن گیا تھا آپ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت یہ دعا پڑھتے تھے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ.

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ﴾ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی اور اس کے بعد ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾[119] نازل ہوئی۔ ان دونوں کے نازل ہونے کے بعد 80 دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً 50 دن پہلے آیت کلالہ نازل ہوئی ﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾[120]۔ پھر وفات سے 35 دن قبل ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾[121] نازل ہوئی اور وفات سے اکیس دن یا سات دن پہلے ﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾[122] یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت جو مکمل نازل ہوئی ہے وہ سورۃ الفاتحہ ہے اور قرآن کریم کی آخری سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ یہی سورۃ النصر ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

118۔ صحیح البخاری، رقم: 4967

119۔ المائدۃ 3:5

120۔ النساء 176:4

121۔ التوبۃ 128:9

122۔ البقرۃ 281:2

سورۃ اللھب

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴾

سورت کا شانِ نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی : ﴿وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴾[123] کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں؛ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھے اور فرمایا: یَا صَبَاحَاہ! یہ اعلان ہوتا تھا لوگوں کو بلانے کے لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو آواز دی اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا بنی فِہر اور یا بنی عدی کہہ کر انہیں پکارا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں کہوں کہ اس صفا پہاڑی کے پیچھے دشمن ہے جو تم پر حملہ کرے گا تو کیا تم مان لو گے؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں مانیں گے "مَا جَرَّبْنَا عَلَیْكَ إِلَّا صِدْقًا" ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولنے والا پایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فَإِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ" تمہیں آنے والے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ ابو لہب نے کہا-اس کا نام

123۔ الشعراء 214:26

عبد العزیٰ تھا- اس بدبخت نے کہا: "تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟" اے محمد!-العیاذ باللہ- تو تباہ ہو جائے، تو نے اس لیے بلایا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہیں، قرآن اترا ہے ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ﴾ ابو لہب تباہ و برباد ہو جائے۔ یہ سورت نازل ہوئی۔[124]

یہاں "ید" سے مراد ابو لہب کے صرف ہاتھ نہیں ہیں بلکہ ید سے مراد پورا جسم ہے۔ "تَبَّ" یہ ماضی کا صیغہ ہے۔ سمجھو کہ وہ تباہ ہو گیا ہے۔

ابو لہب کا انجام:

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ۝۲﴾

اس کا مال اور اس نے جو کچھ کمایا اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

ابو لہب کے بیٹے بھی خوب تھے اور پیسے بھی خوب تھے۔ کہتا تھا کہ جو محمد کہتا ہے وہ سب غلط کہتا ہے- صلی اللہ علیہ وسلم- اگر اس کی بات ٹھیک ہوئی بھی تو میں اپنے بیٹوں اور مال کو استعمال کر کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔

﴿سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳﴾

وہ داخل ہو گا ایسی آگ میں جو شعلے والی ہو گی۔

ابو لہب کی بیوی کا حشر:

﴿وَّ امْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴﴾

اور اس کی بیوی بھی اس آگ میں داخل ہو گی جو لکڑیاں اٹھاتی تھی۔

اس کا نام ام جمیل تھا اور یہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بہن تھی۔

124۔ صحیح البخاری، رقم:4770

"لکڑیاں اٹھاتی تھی" کا یا تو حقیقی معنی مراد ہے کہ کانٹے دار لکڑیاں اٹھاتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں بچھاتی تھی یا اس کا معنی یہ ہے کہ جہنم میں زقوم کا درخت اٹھائے گی اور ابولہب پر پھینکے گی اور اس کی آگ مزید بھڑکائے گی۔

﴿فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿٥﴾﴾

اور اس کی گردن میں بڑی مضبوط رسی ہو گی۔

جہنم کے طوق اور زنجیروں کو یہاں مضبوط رسی سے تعبیر فرمایا کہ یہ جہنم میں جلے گی اور وہاں اس کی گردن میں جہنم کے طوق اور زنجیریں ہوں گی، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کنجوس مزاج کی عورت تھی، اتنے بڑے سرداروں کی بہن اور بیوی ہونے کے باوجود اپنی کمر پر لکڑیاں اٹھا کر لاتی اور اس کی رسی کو اپنے گلے میں لپیٹ لیتی تھی۔ اس کی یہی رسی اس کے گلے میں پھنسی، جب اٹھنے لگی تو اس کا گلہ دب گیا اور دم گھٹنے سے مر گئی۔

الیکشن نہیں سلیکشن!

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ﴾... بعض حضرات اس آیت کے تحت یہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جب ابولہب نے جملہ کسا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا بلکہ جواب اللہ نے خود دیا ہے۔ یہی بات میں سمجھایا کرتا ہوں کہ نبی مبعوث من اللہ ہوتا ہے، کیونکہ نبی الیکشن سے نہیں ہوتا.. نبی سلیکشن سے ہوتا ہے۔ اس لیے جب نبی پر اعتراض ہو تو نبی خاموش ہوتا ہے، جو نبی کی سلیکشن کرتا ہے وہ خدا جواب دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہیں اور اللہ نے جواب دیا ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الاِخلاص

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾﴾

توحیدِ باری تعالیٰ:

جب مشرکینِ مکہ نے کہا تھا: اللہ کیا ہے؟ اللہ کا نسب نامہ کیا ہے؟ تو اللہ نے سورت الاخلاص اتاری۔ فرمایا: آپ فرمائیں کہ اللہ ایک ہے، اللہ صمد ہے-بے نیاز ہے-

"صمد" کا معنیٰ:

"صمد" کسے کہتے ہیں؟ "اَلَّذِیۡ لَا یَحۡتَاجُ اِلٰی شَیۡءٍ وَیَحۡتَاجُ اِلَیۡہِ کُلُّ شَیۡءٍ"

صمد اسے کہتے ہیں کہ جس کا ہر کوئی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں، اور یہ جو ﴿اَللّٰہُ الصَّمَدُ﴾ کا ہم ترجمہ کرتے ہیں کہ اللہ بے نیاز ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی کی ضرورت نہیں ہے، اسے کسی کی حاجت نہیں ہے۔ ایک بات یہ ذہن میں رکھیں کہ بے نیاز کا ایک معنیٰ ہمارے معاشرے میں یہ ہوتا ہے کہ کوئی غلط کرے یا ٹھیک کرے اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو! یہاں قرآن مجید میں صمد اور بے نیاز کا معنیٰ یہ نہیں ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھیں! اللہ تعالیٰ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا

فرمائے۔ آمین

اللہ نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا:

﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳﴾

نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کا کوئی والد ہے۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾

اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اب دیکھو! انہوں نے سوال کیا تھا کہ اللہ کیا ہے؟ اور ان کو جواب دیا کہ اللہ کون ہے! معلوم ہوا کہ ہمیشہ سائل کے سوال کے مطابق جواب نہیں دیتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ سائل کی منشا کیا ہے اور سائل کو جواب کیا دینا چاہیے! انہوں نے پوچھا تھا کہ اللہ کیا ہے؟ اگر یہ بتایا جاتا کہ اللہ کیا ہے تو یہ سمجھنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی تعریف ہوتی ہے وجود سے، اللہ کی تعریف ہوتی ہے سلب سے۔ کیا مطلب کہ دنیا میں کسی چیز کی تعریف کریں گے تو کہیں گے کہ یہ چیز ایسی ہے اور اللہ کی تعریف کریں گے تو کہیں گے کہ اللہ ایسے نہیں ہیں۔ آپ نے پڑھا ہے القواعد فی العقائد میں کہ جب اللہ کے بارے میں پوچھا جائے کہ اللہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں:

اَللّٰہُ لَيْسَ بِجِسْمٍ وَلَا جَوْهَرٍ وَلَا عَرَضٍ وَلَا طَوِيْلٍ وَلَا عَرِيْضٍ وَلَا يَشْغُلُ الْاَمْكِنَةَ وَلَا يَحْوِيْهِ مَكَانٌ وَلَا جِهَةٌ مِنَ الْجِهَاتِ السِّتَّةِ.[125]

اب دیکھو! اللہ جسم بھی نہیں، جوہر بھی نہیں، طویل بھی نہیں، عریض بھی نہیں، مکانات میں اتر کر ان کو بھرتے نہیں، کوئی مکان اللہ کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا،

125۔ دفع شبہ التشبیہ للامام ابن الجوزی: ص107

جہات ستہ میں سے کوئی جہت اللہ کے لیے ثابت بھی نہیں۔

تو وہاں تعریف ساری سلبی ہے۔ اس لیے اگر ان کے سوال کے جواب میں یہ بتایا جاتا کہ "اَللّٰہُ لَیْسَ بِجِسْمٍ وَلَا جَوْھَرٍ . . . " تو ان لوگوں کو کیا سمجھ آتا کہ جوہر کیا ہے! اور اس کا سلب کیا ہے! اس لیے انہوں نے جب پوچھا کہ اللہ کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ اللہ کون ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ﴾[126]

انہوں نے پوچھا کہ چاند کیا ہے؟ تو ان کو جواب دیا کہ چاند کیوں ہے؟! فرمایا: ﴿قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ﴾ انہیں بتاؤ: چاند اس لیے ہے کہ اس سے تم اپنے معاملات اور حج کے اوقات متعین کرو۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ﴾[127]

انہوں نے پوچھا کہ کیا خرچ کریں؟ ان کو جواب دیا کہ تم یہ پوچھو کہ کہاں خرچ کریں! ﴿قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ کہ جو خرچ کرنا ہے اپنے والدین اور عزیز و اقارب وغیرہ پر خرچ کرو!

تو ہمیشہ ایسا نہیں کرتے کہ جو سوال کیا ہے اسی کا جواب دیں بلکہ جو مناسب ہو وہ جواب دینا چاہیے۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

126۔ البقرۃ 189:2

127۔ البقرۃ 215:2

سورۃ الفلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا
وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ٪﴿۵﴾﴾

سورۃ الناس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ
الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ
النَّاسِ ٪﴿۶﴾﴾

معوذتین کا شان نزول:

یہ دونوں سورتیں اکٹھی نازل ہوئی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ کے یہودی لبید بن اعصم نے اپنی بیٹیوں کے ذریعے جادو کروایا۔ جادو کا اثر یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک کام فرمالیتے اور آپ کے ذہن میں ہوتا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ بس اتنا سا اس جادو کا اثر ہوا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمارہے تھے تو خواب میں دو فرشتے

آئے۔ ایک فرشتہ آپ کے سر کی جانب اور ایک فرشتہ آپ کے پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔ سرہانے والے فرشتے نے دوسرے فرشتے سے پوچھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا ہے۔ پوچھا: کس نے کرایا ہے؟ کہا: لبید بن اعصم یہودی نے۔ کس چیز پر کرایا ہے؟ اس نے تفصیل بتائی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس کنگھی مبارک سے بال سنوارتے تھے اس کنگھی کے کچھ دندانے لیے ہیں اور ایک رسی لی ہے، اس رسی میں گیارہ گرہیں لگائی ہیں اور ہر گرہ میں ایک سوئی لگائی ہے، پھر اس کو کھجور کے پھل کے غلاف میں رکھ کر ایک کنواں -جسے بئر ذروان کہتے ہیں- اس میں ایک پتھر کے نیچے اس کو رکھ دیا گیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب سے بیدار ہوئے تو آپ سیدھا اس کنویں پر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پتھر کو ہٹوایا تو نیچے یہ سب کچھ رکھا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ آپ ایک آیت پڑھتے اور ایک گرہ کھولتے، آپ کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میرے جسم سے بوجھ اتر رہا ہے، گیارہ آیتیں پڑھ لیں تو گیارہ گرہیں کھل گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کا نام نہیں بتایا کہ کہیں اس کو قتل نہ کر دیا جائے، فرمایا کہ اللہ نے مجھے تو صحت دے دی ہے، اب میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہو، اور بعض روایات میں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پتا چلا تو انہوں نے اجازت چاہی اس کو قتل کر دیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی ذات کے لیے انتقام کو پسند نہیں کرتا۔ آپ نے منع فرما دیا۔

ہمیں بھی صبح وشام ان دونوں سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان سورتوں کو پڑھتے تھے، اپنے مبارک ہاتھوں پر

پھونک مارتے پھر ان کو پورے جسم پر مل لیتے تھے۔ آخری عمر میں حضرت ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ دونوں سورتیں پڑھتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں پر پھونک دیتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ جسم پر مل لیا کرتے تھے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے ہاتھوں پر دم کر کے اپنے ہاتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے نہیں پھیرتی تھی کہ جو برکت آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ میرے ہاتھوں میں کہاں ہو سکتی ہے؟!

جادو کا ہو جانا برحق ہے:

یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ جادو کا ہو جانا برحق ہے۔ برحق ہونے کا معنی یہ نہیں کہ جادو ٹھیک ہے بلکہ برحق ہونے کا معنی یہ ہے کہ جادو ثابت ہے، جادو کیا جائے تو ہو جاتا ہے اور یہ کوئی قابلِ اشکال چیز نہیں ہے۔ جس طرح زہر کھانے کی وجہ سے بندہ مر جاتا ہے تو زہر کا ایک اثر ہے، نمک کھائیں تو نمک کا اثر ہے، مرچ کھائیں تو مرچ کا اپنا اثر ہے، پانی کا اپنا اثر ہے، ہر چیز کا اپنا ایک اثر ہے۔ اسی طرح کلمات میں اللہ نے تاثیر رکھی ہے اور وہ کلمہ اپنی تاثیر دکھاتا ہے، نبی پر بھی اثر ہوتا ہے اور غیر نبی پر بھی ہوتا ہے۔

جادوگر کامیاب نہیں ہوتا کا مطلب:

جو لوگ نبی پر جادو ہونے کے قائل نہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ﴾[128]

کہ جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

128۔ یونس 77:10

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ مان لیں کہ نبی پر جادو ہوا ہے تو اس کا معنی ہے کہ جادوگر تو کامیاب ہو گئے۔

ہم کہتے ہیں کہ آیت نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ ذہن بنا ہے۔ اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ ایک ہوتا ہے جادوگر کا جادو چل جانا اور ایک ہوتا ہے جادوگر کا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانا۔ جادو چلنا اور ہے اور مقصد میں کامیاب ہونا اور ہے۔ مثلاً کچھ لوگ کسی شخص پر قاتلانہ حملہ کرتے ہیں تاکہ اس کو مار دیں اور حملہ ہو بھی جاتا ہے لیکن بندہ بچ جاتا ہے۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حملہ ہوا ہی نہیں، ہاں حملہ ہوا ہے لیکن قاتل اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آپ نبوت کے کام کو چھوڑ دیں، دعوت نہ دیں، تبلیغ نہ کریں لیکن اس جادو کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی دعوت دیتے رہے۔ تو جادوگر کا جو مقصد تھا اس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا ہی نہیں۔

دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدِ مقابل ستر ہزار جادوگر آئے تھے، انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو وہ سانپ بنتی ہوئی نظر بھی آئیں اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝٦٧﴾[129] موسیٰ علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔ جادو تو ہوا اور اس کا اثر بھی ہوا۔ اب ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ جائیں لیکن وہ غالب نہیں آ سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان جادوگروں نے جادو کیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تو جادو کرنا اور ہے اور جادو میں کامیاب ہو جانا اور ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لیے

129۔ طٰہٰ 20:67

جس طرح عام آدمی پر جادو ہو جاتا ہے تو نبی پر بھی ہو جاتا ہے۔

جادو سے بچنے کا وظیفہ:

جادو سے بچنے کے لیے سورت یونس کی آیت نمبر 80 اور آیت نمبر 81 صبح و شام پڑھ لیا کریں:

﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾﴾

اسی طرح یہ دعا "بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ" [130] بھی صبح و شام تین تین بار پڑھ لیا کریں اور معوذتین بھی صبح و شام پڑھ لیا کریں۔ یہ مسنون اعمال ہیں۔ ان کی برکت سے انسان جادو سے محفوظ رہتا ہے۔

ان دونوں سورتوں میں اللہ رب العزت نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہمیں تعلیم دی ہے کہ شر دو قسم کے ہیں جن سے تمہیں بچنا چاہیے۔ ایک شر وہ ہے جس کا اثر دنیا میں ہے اور ایک شر وہ ہے جس کا اثر آخرت میں ہے۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾﴾

میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی مخلوقات کے شر سے۔

اس شر کا نقصان انسان کی دنیا پر ہوتا ہے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾﴾

130۔ سنن ابن ماجۃ، رقم:3869

اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے۔

اب رات کے اندھیرے میں اگر کسی پر حملہ ہو جائے اور بندہ قتل ہو جائے تو یہ دنیا کا نقصان ہو گا، کوئی حملہ کرے اور بندہ زخمی ہو جائے تو دنیا کا نقصان ہو گا۔

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝٤ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝٥﴾

اور گرہوں پر پھونک مارنے والیوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

دشمن اگر جادو کرے اور کامیاب بھی ہو جائے تو دنیا کا نقصان ہو گا، حاسد اگر کسی سے حسد کرے تو بھی دنیا کا نقصان ہو گا۔ تو پہلی سورت سورۃ الفلق میں اس شر کا ذکر ہے جس کا تعلق دنیاوی نقصان سے ہے اور سورۃ الناس میں اس شر کا ذکر ہے جس کا تعلق اخروی نقصان سے ہے۔ چونکہ دنیا کا نقصان پہلے ہے اس لیے اس کا ذکر پہلے فرمایا اور اخروی نقصان بعد میں ہے اس لیے اس کا ذکر بعد میں فرمایا ہے۔

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝١ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝٢﴾

یہاں "مَا خَلَقَ" یعنی تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد رات کے شر سے، گرہوں پر پھونکنے والی جادوگرنیوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ تو اصل تو مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے باقی مزید تین چیزوں کے شر کا ذکر کیوں فرمایا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی اپنے بیٹے کو سرگودھا سے کراچی کے لیے ٹرین پر بٹھائے اور کہے کہ بیٹا! راستے میں اپنا بہت خیال رکھنا، خاص طور پر اپنے موبائل سے کسی کو فون نہ کرنے دینا، خاص طور پر کسی کا کھانا نہ کھانا، خاص طور پر کسی آدمی کا سامان اپنے پاس نہ رکھنا۔ تو اصل تھا کہ اپنا خیال رکھنا، اس کے بعد بعض وہ خاص خاص چیزیں جن کا خیال کرنا چاہیے ان کی نشاندہی بھی کر دی۔

بالکل اسی طرح اصل تو تمام مخلوقات کے شر سے اللہ کی پناہ میں آنا ہے، ہاں خاص طور پر اس شر سے جو رات میں ہوتا ہے کیونکہ دن والے شر تو نظر آتے ہیں جبکہ رات والے نظر نہیں آتے، اور خاص طور پر اس شر سے جو جادو کا ہوتا ہے کیونکہ کوئی آدمی گولی مارے تو نظر آتی ہے اور جادو کرے تو کلمات نظر نہیں آتے، اسی طرح خاص طور پر حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ حاسد کا شر مخفی ہوتا ہے، حاسد ساتھ بھی رہتا ہے، اوپر اوپر سے محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے لیکن اندر اندر سے جل رہا ہوتا ہے۔ تو اسے تخصیص بعد التعمیم کہتے ہیں کہ پہلے عام بات کہہ دی جائے اور بعد میں بعض خاص باتیں کہی جائیں۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾

یہاں دیکھیں! اللہ کی صفت بیان فرمائی ہے "بِرَبِّ الْفَلَقِ" کہ جو صبح کا رب ہے اور آگے جس سے پناہ مانگی ہے اس کا چار بار تذکرہ کیا، اور اگلی سورت میں آیا ہے:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳﴾

یہاں اللہ کی تین صفتیں بیان فرمائی ہیں: رب، ملِک اور الٰہ، اور جس سے پناہ مانگی ہے اس کا ایک بار ذکر کیا یعنی ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝۴﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شر بہت خطرناک ہے۔ دنیا کا شر مضرت میں کم ہوتا ہے اور آخرت کا شر مضرت میں بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ کی تین صفتیں بیان کر کے اِس ایک شر سے پناہ مانگی ہے۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝۴﴾

وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو وسوسہ ڈال کر چھپ جاتا ہے۔

یہاں فرمایا: "الْخَنَّاسِ"... یہ خَنَس سے ہے جس کا معنی ہے چھپنا۔ جب

انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان جو اپنا منہ انسان کے دل پر رکھ کر بیٹھا ہوتا ہے وہ ذکر اللہ کی وجہ سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب ذکر ختم کرتا ہے تو پھر وہاں پر بیٹھ جاتا ہے، جب پھر ذکر شروع کرے تو پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے، جب ذکر ختم کرے تو پھر واپس آجاتا ہے۔ اس لیے شیطان کو خناس کہتے ہیں۔

﴿الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝٦﴾

جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنات میں سے بھی ہے اور انسانوں میں سے بھی۔

وسوسہ ڈال کر تباہ کرنے والے دونوں قسم کے لوگ ہیں یعنی شیاطین بھی ہیں اور انسان بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کے شرور سے ہم سب کو محفوظ فرمائیں۔ آمین

قرآن کریم کے آغاز و اختتام میں ربط:

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت؛ سورۃ الفاتحہ ہے اور قرآن کریم کی سب سے آخری دو سورتیں؛ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہیں۔ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ عام آدمی جو اچھی گفتگو کرنے والا ہو اس کے کلام کے شروع اور کلام کے آخر میں ربط ہوتا ہے، مناسبت ہوتی ہے، ایسا شخص بے ربط کلام کبھی نہیں کرتا۔ اللہ رب العزت سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے؟! اس لیے اللہ کے کلام کی ابتدا اور انتہا میں ربط بہت عجیب ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی صفتیں بیان فرمائی ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝٢ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝٣﴾

اس کے بعد بندے نے اللہ سے اپنا تعلق بیان کیا ہے:

﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾

کہ اے اللہ! ہمارا آپ سے تعلق ہے کہ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں۔

اس کے بعد بندے نے پھر دو چیزیں مانگی ہیں:

1: ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾

2: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾

یہ دو چیزیں مانگی ہیں۔ دنیا میں جب بھی کسی سے کوئی چیز مانگی جائے تو پہلے اس کی تعریف کرتے ہیں، پھر اس کا اور اپنا تعلق بتاتے ہیں اور اس کے بعد مانگنا شروع کرتے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ میں ہم پہلے اللہ کی تعریف کرتے ہیں، پھر اللہ سے اپنا تعلق بتاتے ہیں، پھر مانگنا شروع کر دیتے ہیں، اور مانگی دو چیزیں ہیں:

1: ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾

اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

2: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾

اے اللہ! ہم آپ سے صراطِ مستقیم مانگتے ہیں۔

الفاتحہ میں دو چیزیں اللہ سے مانگی ہیں اور قرآن کریم کے آخر میں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں بھی دو چیزوں سے پناہ مانگی ہے۔

1: ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾

2: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ﴾

سورۃ الفاتحہ میں دو چیزیں مانگی ہیں کہ یہ دو ہمیں چاہییں اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں دو چیزوں سے پناہ مانگی ہے کہ یہ دو چیزیں ہمیں نہیں چاہییں!

پورے قرآن کا خلاصہ:

پورے قرآن کریم اور پورے دین کا خلاصہ دو چیزیں ہیں:

نمبر 1... ﴿وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو

کچھ دیں وہ لے لو!

نمبر2... ﴿وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ اور جس چیز سے منع فرما دیں اس سے رک جاؤ۔

پیغمبر جو چیز دیں اس کا نام "خیر" ہے اور جس چیز سے منع کر دیں اس کا نام "شر" ہے۔

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾

جس شخص نے ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی کی ہو گی تو اسے اس کا بدلہ ملے گا اور جس نے ذرہ برابر شر یعنی گناہ کیا ہو گا تو اسے اس کا بدلہ ملے گا۔

تو خیر لینی چاہیے اور شر سے بچنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا خلاصہ دو صفتیں ہیں؛ بشیر اور نذیر۔ صفتِ بشیر کہ جنت کی طرف دعوت دے کر بلانے والا اور صفتِ نذیر کہ وعیدیں سنا کر ڈرانے والا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد انسان کے ابدی ٹھکانے دو ہی ہیں؛ جنت یا جہنم۔ اس سے پہلے عالمِ ارواح ٹھکانہ تھا لیکن وہ ابدی نہیں تھا، اس کے بعد عالمِ دنیا ہے لیکن یہ بھی ابدی نہیں ہے، اس کے بعد عالمِ برزخ ہے اور یہ بھی ابدی نہیں ہے، عالمِ برزخ کے بعد حشر ہے یہ بھی ابدی نہیں اور حشر کے بعد جو ٹھکانے ہیں جنت یا جہنم وہ ابدی ہیں لیکن وہ دونوں ازلی نہیں ہیں کہ ہمیشہ سے ہوں، ہاں ابدی ہیں کہ ہمیشہ رہیں گے، جنت بھی ہمیشہ رہے گی اور جہنم بھی ہمیشہ رہے گی، نہ جنت ختم ہو گی اور نہ جہنم ختم ہو گی۔

جنت اہلِ خیر کی جگہ ہے اور جہنم اہلِ شر کی جگہ ہے۔ جو صاحبِ خیر ہیں وہ

جنت میں رہیں گے اور جو صاحبِ شر ہیں وہ جہنم میں رہیں گے۔ ہاں اگر کسی آدمی کا شر چھوٹا ہے یعنی اس کے پاس ایمان تو ہے لیکن ایمان کے ساتھ ساتھ اعمالِ سیئہ بھی ہیں تو وہ کچھ وقت جہنم میں رہے گا اور بالآخر جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے کرم سے اسے جہنم میں نہ بھیجیں بلکہ براہِ راست خیر یعنی ایمان کی وجہ سے جنت میں بھیج دیں۔

موت کے بعد خیر والے جنت میں جائیں گے اور شر والے جہنم میں جائیں گے، اور ہمیں حکم ہے کہ ہم اللہ سے جنت کو مانگیں اور جہنم سے پناہ مانگیں: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْٓ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَأَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ... "خیر" جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور "شر" جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے۔

تو اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی پہلی سورت سورۃ الفاتحہ میں دو خیریں بتائی ہیں اور آخری دو سورتوں میں دو شر بتائے ہیں۔

سورۃ الفاتحہ میں دو خیریں بتائیں؛

1: ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

2: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

اور آخری دو سورتوں میں دو شر بتائے؛

1: ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾

2: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ﴾

یہ دو خیر اور دو شر کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے دنیا میں رہنا ہے تو دنیا میں انسان کو عافیت چاہیے، عزت چاہیے، سہولت چاہیے، امن چاہیے، راحت چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا میں تم ہم سے ہماری مدد مانگو! اگر اللہ کی مدد انسان کو مل

جائے تو اس سے انسان کو عزت ملتی ہے، راحت ملتی ہے، سکون ملتا ہے، سہولت ملتی ہے۔ آدمی اگر شر سے بچ جائے تو دنیا میں راحت سے رہتا ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ کہ مخلوق کے شر سے پناہ مانگو! جس آدمی کو دنیا میں اللہ کی مدد مل گئی تو یہ غالب ہو گا، مخلوق کے شر سے پناہ مل گئی یہ انسان پر امن ہو گا اور عافیت و امن کے ساتھ دین کے کام میں لگا ہو گا اور آخرت کی طرف اس کا سفر جاری رہے گا۔ ہم اللہ پاک سے دعا مانگتے ہیں:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً

ہمیں دنیا بھی اچھی عطا فرما اور آخرت بھی اچھی عطا فرما!

دنیا اچھی ملتی ہے جب اللہ کی مدد مل جائے، دنیا اچھی ہوتی ہے جب انسان مخلوقات کے شر سے بچ جائے اور آخرت اچھی ہوتی ہے جب ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ﴾ انسان کو صراطِ مستقیم مل جائے، جب ﴿مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ﴾ شیطان کے وساوس سے بچ جائے پھر انسان کی آخرت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کی ابتدا اور انتہا میں کتنی بہترین مناسبت ہے!

بطورِ خاص یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کی خیر کی طرف رہنمائی کریں اور امت کو شر سے بچائیں۔ جو عالم امت کو خیر بتاتا ہے اور امت کو شر سے نہیں بچاتا وہ آدھا کام کرتا ہے اور جو خیر بھی بتاتا ہے اور شر سے بھی بچاتا ہے وہ پورا کام کرتا ہے۔ پیغمبر کی پوری وراثت ﴿وَ مَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ٭ وَ مَا نَہٰىکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَہُوۡا﴾ ہے۔ نبوت کی پوری وراثت صرف خیر بتانا نہیں بلکہ نبوت کی پوری وراثت خیر بتانے کے ساتھ ساتھ شر سے بچانا بھی ہے۔ اس لیے رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا مزاج تھا:

كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُوْنَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدْرِكَنِي.[131]

کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی باتیں پوچھتے تھے اور میں آپ سے شر کی باتیں پوچھتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں میں اس شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ امت کو خیر کی طرف بلانا ہے اور امت کو شر سے بچانا ہے۔ سورۃ الفاتحہ اور معوذتین کا خلاصہ بھی یہی ہے۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قرآن کی ابتدا اور انتہا میں مناسبت بہت پیاری ہے اور ہمیں ان چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ہم اس پر اللہ کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ مرکز اھل السنۃ والجماعۃ اسی راستے پر چل رہا ہے، ہم دونوں کاموں کا اہتمام کرتے ہیں، دونوں چیزیں بتانے کی بھرپور فکر کرتے ہیں اور یہ فکر کرنی بھی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق عطا فرمائیں اور اللہ پاک آپ کو بھی توفیق عطا فرمائیں۔

یہ ہمارے دروس القرآن کا آخری سبق تھا جس میں آپ نے شرکت فرمائی ہے۔ دعا کریں کہ آئندہ سال کوئی ایسی ترتیب بن جائے کہ پورے قرآن کریم کا آیت وار ترجمہ کیا جائے۔ اس کا بہت زیادہ فائدہ ہو گا ان شاء اللہ۔

لفظ رب، مالک، الٰہ لانے کا مقصد:

یہاں بس صرف ایک بات سمجھ لیں!

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝﴾

131۔ صحیح البخاری، رقم:2606

یہاں بظاہر عربی ترکیب کا تقاضا یہ تھا کہ آگے "مَلِکِھِمْ" اور "اِلٰھِھِمْ" ضمیریں ہوتیں جو "النَّاسِ" کی طرف لوٹتیں۔ تو النَّاسِ... النَّاسِ... النَّاسِ... کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ایسا اسلوب اختیار فرمایا ہے یہ بتانے کے لیے کہ یہاں ہر مرتبہ "النَّاسِ" کی مراد الگ ہے، انسانوں کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے "النَّاسِ" کا بار بار تذکرہ آیا ہے۔

جب پہلے فرمایا: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ تو یہاں "الناس" سے مراد انسان کی بچپن کی حالت ہے۔ اس پر دلیل لفظِ رب ہے۔ جوانی میں بھی انسان تربیت محتاج ہوتا ہے لیکن بچپن میں بچہ تربیت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، نہ اٹھ سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے تو اس کے ظاہری اختیارات بالکل ختم ہوتے ہیں۔

﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ میں "الناس" سے انسان کی جوانی کی حالت بیان فرمائی ہے۔ دلیل اس پر لفظ ملک ہے۔ کیونکہ اس حالت میں انسان کو جوانی کا نشہ ہوتا ہے تو اس کے لیے ملک اور حکمران ضروری ہوتا ہے جو ان کی اس حالت میں ان کو کنٹرول کرے اور قوت اور طاقت کے ساتھ راہِ راست پر رکھے۔

﴿اِلٰهِ النَّاسِ﴾ یہاں پر انسان کی بڑھاپے کی حالت مراد ہے۔ دلیل اس پر لفظ الہ ہے۔ چونکہ عبادت کی طرف بندہ بچپن اور جوانی میں بھی مائل ہوتا ہے لیکن بڑھاپے میں سوائے عبادت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵﴾

یہاں "النَّاسِ" سے مراد وہ انسان ہے جس کی حالت اچھی ہو، خیر والی ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً شیطان وسوسے وہیں ڈالتا ہے جہاں پر آدمی اچھا ہو، برے آدمی کو مزید وسواس میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴾

یہاں ”النَّاسِ“ سے مراد وہ انسان ہے جو شر والا ہو، اس لیے کہ وسوسے ڈالنے والا اچھا آدمی نہیں ہوتا، وسوسے ڈالنے والا آدمی برا ہوتا ہے۔ تو چونکہ انسان کی پانچ حالتوں کا ذکر تھا اس لیے پانچوں مرتبہ ضمیر کے بجائے مستقل اسم ظاہر الناس کا ذکر فرما دیا ہے۔

قرآن کریم کے اختتام پر یہ ذہن نشین فرمالیں کہ اصل علم قرآن کریم اور حدیث مبارک کا علم ہے، یہ بنیادی علوم ہیں، آگے علم الفقہ یہ قرآن کریم اور حدیث پاک کا خلاصہ، نچوڑ اور مغز ہے۔ سب سے زیادہ محنت قرآن کریم اور حدیث پاک پر کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کو پڑھنا چاہیے، قرآن کریم کو سمجھنا چاہیے، قرآن کریم پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جس کا قرآن کریم سے رابطہ اور تعلق بہت مضبوط ہو۔ اس لیے جس قدر تعلق مضبوط کر سکیں تو کریں اور قرآن کریم کو سب سے زیادہ تہجد میں پڑھنا چاہیے۔ تہجد کا وقت بہت بہترین وقت ہوتا ہے قرآن کریم پڑھنے کے لیے۔ فجر کی نماز میں تلاوت عام نمازوں کی بنسبت زیادہ ہوتی ہے تو یہ بطورِ خاص قرآن کریم کی تلاوت کا وقت ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.